قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اگست 2013، قیمت -/15

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

اقلیتوں کی تعلیمی ترقی کے لیے سفارشات

مشمولات

ماہنامہ اُردو دُنیا
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
جلد:15، شمارہ:08، اگست 2013

اداریہ

ہماری بات 2

خطوط

آپ کی بات قارئین کے خطوط 3

انٹرویو

عبدالصمد احمد صغیر 6

کور اسٹوری

اقلیتوں کی تعلیمی ترقی: مسئلے اور سفارش ادارہ 9

جشن آزادی

ہندوستان کی ترقی کے 66 سال جاوید جمال الدین 17

زبان و تعلیم

جدید وسائل اور نظم و غزل کی تدریس اعجاز احمد اعجاز 20

عصر جدید میں ترجمے کی افادیت ارشاد نیازی 22

ادبی مباحث

افسانے میں مکالمہ کیسے لکھا جائے محمد بشیر کوٹلوی 25

جوش ملیح آبادی کے مرثیے عارف حسین جونپوری 28

تلوک چند محروم کی شاعری قاضی حبیب احمد 31

منٹو کی کہانیوں کا پس نوآبادیاتی مطالعہ یاسمین رشیدی 33

نذیر بنارسی کے شخصی مرثیے ناظر حسین خان 35

شخصیت

میر قدر بلگرامی: حیات اور شاعری ظفر سعیدی 39

مشاہیر ادب/نظم

وحید اختر کوثر مظہری 42

انتخاب کلام وحید اختر 43

مشاہیر ادب/نثر

اشفاق احمد ادارہ 46

برکھا اشفاق احمد 47

ہم نے جنھیں بھلا دیا

دل شاہ جہاں پوری خالد حسین خاں 51

ہماری مطبوعات

شیر افگن کا قتل اور جہانگیر ... ابوسفیان 53

شہر بین

تاریخی شہر بڑودہ مفتی عمران 57

دوسری زبانوں سے

رضائی سجان سنگھ 59

صحت

اپنے جگر کی حفاظت کیجیے شمس الاسلام فاروقی 61

فلم

ہندوستانی فلمیں اور امراض واثق الخیر 63

سائنس

کہکشاں کے رموز عظیم اقبال 66

کتابوں کی دنیا

تبصرہ و تعارف 68

قومی اردو کونسل کی میٹنگ

ایگزیکیوٹیو بورڈ کی 37 ویں میٹنگ ادارہ 75

اردو کیمپس

یونیورسٹیوں کی اردو سرگرمیاں ادارہ 80

عالمی اردو نامہ

ادارہ 81

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں ادارہ 83

مدیر: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا
انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020
مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: منظر سبحانی
قیمت-/15 روپے، سالانہ -/150 روپے

■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000
(شعبۂ ادارت: 49539009)

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
email: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7
آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040 -24415194

ہماری بات

بارہویں پانچ سالہ منصوبے کے تجویز نامے Approach Paper کے دسویں پیراگراف میں کہا گیا ہے: ''تعلیم مکمل سماجی اور اقتصادی تبدیلی لانے کا سب سے اہم واحد وسیلہ ہے۔ بہتر تعلیم یافتہ آبادی، جو علم و ہنر سے مناسب طور پر آراستہ ہو، نہ صرف اقتصادی نشو ونما کے لیے لازمی حیثیت رکھتی ہے بلکہ ترقی و فروغ کو شمولی Inclusive بنانے کے لیے بھی ایک شرط اول ہے کیونکہ تعلیم یافتہ اور ہنر مند شخص ہی ترقی و فروغ سے پیدا ہونے والے روزگار کے مواقع کا سب سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔''

اس نظریے کو ملک کی مذہبی اقلیتوں کے تعلیمی مسائل پر منطبق کیا جائے تو جو کلیہ ملک کی تمام آبادی کے لیے قائم کیا گیا ہے وہ اقلیتوں پر بھی صادق آتا ہے۔ خاص طور سے مسلمانوں پر کیونکہ ایک تو وہ ملک کی سب سے بڑی مذہبی اقلیت ہیں دوسرے وہ اکثر سماجی و اقتصادی معاملات میں سب سے پچھڑے ہوئے، یعنی ضرورت مند بھی ہیں۔ 2011 کی مردم شماری کے مذہبی اقلیتوں سے متعلق اعداد و شمار ابھی جاری نہ ہونے کی بنا پر 2001 کی مردم شماری کے نتائج پر نظر ڈالیں تو ملک کی ایک فیصد سے بھی کم آبادی والے پارسیوں میں شرح خواندگی 97.9 فیصد اور بودھوں میں 72.7 فیصد تھی۔ تقریباً دو فیصد آبادی والے سکھوں میں یہ 69.4 فیصد، 2.3 فیصد آبادی والے عیسائیوں میں 80.3 فیصد اور تقریباً ساڑھے تیرہ فیصد آبادی والے مسلمانوں میں خواندگی کی شرح 59.1 فیصد پائی گئی۔ اگلے دس برسوں میں یہ شرح تھوڑی بہت ضرور بڑھی ہوگی لیکن اتنی نہیں کہ وہ باقی کسی بھی اقلیت سے اوپر اٹھ گئے ہوں۔ خاص طور سے ثانوی اور اعلیٰ تعلیم میں ان کا پچھڑا پن اب بھی باقی ہے۔

اچھی بات یہ ہے کہ مرکزی اور کئی ریاستی حکومتوں نے تو اقلیتوں میں تعلیم کے فروغ کی طرف سنجیدگی سے توجہ دی ہی ہے پچھلے پندرہ بیس سال میں مسلمان از خود بھی تعلیم کے سلسلے میں کافی سنجیدہ ہوئے ہیں۔ ان کے اپنے قائم کیے ہوئے تعلیمی اداروں کی تعداد بڑھی ہے، اور طلبا کی تعداد میں خاصا اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے۔ سب سے اچھی اور حوصلہ افزا بات یہ ہوئی ہے کہ ہندوستانی مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کی طرف پہلے سے زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔ بالخصوص نچلے درمیانہ طبقے میں پڑھی لکھی لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے بھی آگے نکلتی نظر آتی ہے۔ بڑے اور چھوٹے شہروں میں بہت ہی کم مسلمان گھر ایسے ہوں گے جہاں لڑکیوں کو پڑھایا نہ جارہا ہو۔ چنانچہ حالات ایسے نہیں ہیں کہ مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلے میں ماتمی لہجہ اختیار کیا جائے۔

لیکن یہ بھی سچ ہے کہ صورت حال پوری طرح اطمینان بخش نہیں ہے۔ اطلاعاتی ٹیکنالوجی اور کمپیوٹروں کے بڑھتے ہوئے استعمال نے روزگار کے مواقع میں جو زبردست اضافہ کیا ہے اس کا فائدہ اٹھانے والوں میں مسلمان اپنی کل آبادی کے تناسب سے کافی پیچھے ہیں۔ سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں انتظامی افسروں اور کارندوں کی سطحوں پر مسلمان دوسری مذہبی اقلیتوں کے مقابلے میں آج بھی کم ملتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ابتدائی و ثانوی سطحوں پر تو مسلمان تعلیم یافتہ ہوتے جارہے ہیں لیکن اعلیٰ تعلیم کے میدان میں ان کا پچھڑا پن دور نہیں ہوا ہے۔ بہت سے رضا کار ادارے پچھلے کچھ عرصے میں اس کمی کو دور کرنے کے لیے آگے آئے ہیں۔ انجینئرنگ، میڈیکل ایجوکیشن، مینجمنٹ اور بزنس جیسے شعبوں میں کورسز آفر کرنے والے کئی کالج ملک کے مختلف صوبوں میں پچھلے کچھ عرصے میں کھلے ہیں۔ لیکن یہ ناکافی ہیں۔ چنانچہ مرکزی حکومت کی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل نے اقلیتوں کی تعلیمی ترقی کی نگرانی کے لیے باقاعدہ ایک کمیٹی بنادی ہے، جو اقلیتوں کی تعلیمی صورت حال پر ہر پہلو سے نظر رکھے گی۔ اس کمیٹی نے تمام تر دستیاب اعداد و شمار کی روشنی میں اقلیتوں کی تعلیمی صورت حال اور خاص طور سے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے اپنی سفارشات پر مشتمل رپورٹ حکومت کو پیش کردی ہے، جن سے حکومت کو اقلیتوں کی عمومی تعلیم کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم کے فروغ کا لائحۂ عمل تیار کرنے میں یقیناً مدد ملے گی۔ اس رپورٹ کے اہم نکات کو اس مرتبہ 'اردو دنیا' کی کور اسٹوری میں بھی شامل کیا گیا ہے جن کا مطالعہ حقائق کو سمجھنے میں مفید ثابت ہوگا۔ ان معاملات پر آپ کی رائے نہ صرف 'اردو دنیا' پڑھنے والوں کے لیے بلکہ حکومت کے لیے بھی فائدہ مند ہوگی جو اقلیتی تعلیم کے فروغ میں خاصی سنجیدہ نظر آرہی ہے۔

آپ سب کو یوم آزادی مبارک ہو!

(ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین)

آپ کی بات

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی
سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

پچھلے شماروں کی طرح آپ کے موقر مجلّے کا جون 2013 کا شمارہ کئی گراں قدر محققانہ اور فاضلانہ مضامین کا مجموعہ تھا۔ نہیں کہہ سکتا کہ ان سے کتنا زیادہ مستفید ہوا۔ یہ مضامین تھے: گم شدہ مصرعوں کی تلاش، بچوں کے ادب کی اہمیت و افادیت، میر انیس کی مصوری، رام لال ایک مطالعہ، ماحولیاتی آلودگی اور تبصرے ان سب مضامین میں سرفہرست گم شدہ مصرعوں کی تلاش، یہ تحقیق یا ریسرچ کا نمونہ ہے۔ ان گراں قدر مضامین کو شائع کرنے پر آنجناب قابل صد تہنیت اور مبارک باد ہیں۔

سید غلام علی بیابانی
اچلپور شہر، ضلع امراوتی، مہاراشٹر

آپ نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ قومی اردو کونسل کا اردو زبان سے متعلق کوئی بھی کام بڑی دیانت داری اور خلوص پر مبنی ہوتا ہے۔ اب 'اردو دنیا' ماہ جون کا شمارہ ہی دیکھ لیجیے جس میں کور اسٹوری کے تحت اردو میں ادب اطفال پر مختلف نوعیت کے مضامین جمع کیے گئے ہیں جو یقیناً اپنی مثال آپ ہیں۔ ادب اطفال پر لکھا گیا آپ کا اداریہ بھی ایک بہترین اداریہ ہے۔ بچوں کی ذہنی تربیت و اصلاح سے متعلق مثبت اور تعمیری کردار کی ادائیگی کے لیے بچوں کی دنیا کے اجرا کا عملی اقدام اردو زبان و ادب کے لیے ایک خوش آئند اور تعمیری عمل ہے جس کے لیے آپ بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ مظفر حنفی صاحب نے اپنے مختصر سے مضمون میں بڑے پتے کی باتیں کہی ہیں۔ ہم ان کے خیالات سے صد فی صد متفق ہیں۔ فاروق ارگلی صاحب کا مضمون بھی اس سلسلے میں بہت خوب ہے۔ لیکن تشنہ محسوس ہوتا ہے کیونکہ دکنی ادب اطفال خصوصاً علاقۂ وودربھ کے ادب اطفال کا کوئی ذکر تک نہیں ہے جب کہ موجودہ دور میں ادھر سب سے بہتر ادب اطفال تخلیق ہو رہا ہے۔ ظفر گورکھپوری، حیدر بیابانی، وکیل نجیب، بانو سرتاج، عطاء الرحمٰن طارق اور مظفر حنفی کے ذریعے تخلیق کردہ ادب اطفال یقیناً ملک کے کسی بھی حصے کے ادب اطفال سے آنکھیں ملا سکتا ہے۔ اسی طرح امتیاز احمد صاحب کے اپنے مضمون میں مالیگاؤں سے شائع ہونے والے رسالے 'گلشن اطفال' کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا جب کہ رحمانی پبلی کیشنز مالیگاؤں (جس کے تحت یہ رسالہ شائع ہو رہا ہے) آج اس علاقے کا ایک اہم ترین ادارہ ہے۔ جس نے بہت کم عرصے میں ادب اطفال پر ہزارہا کتابیں شائع کی ہیں۔

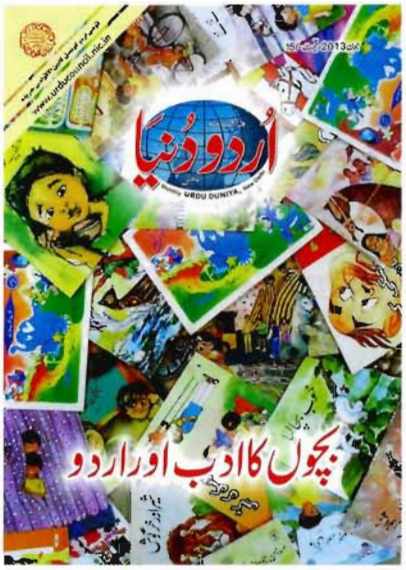

عطا عابدی
بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ

اردو دنیا کے تازہ شمارے (جون 2013) میں بھی کئی مندرجات اہم اور دلچسپ ہیں۔ مجھے 'بچوں کا ادب اور اردو' کے تحت سبھی مضامین خاص طور پر پسند آئے۔ ان مضامین کے ذریعے ادب اطفال کی اہمیت و افادیت روشن ہوتی ہے اور فکر و عمل کے کئی گوشے بھی سامنے آتے ہیں۔ میں یہاں ان گوشوں پر اپنے تاثرات کے اظہار سے احتراز کرتا ہوں کہ کچھ تصحیح طلب پہلو پر گفتگو زیادہ ضروری معلوم ہوتی ہیں۔ جناب فاروق ارگلی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں: ''... بچوں کے اولین رسالے 'پھول' کے ایڈیٹر امتیاز علی تاج نے بچوں کے لیے ڈھیروں کہانیاں لکھیں۔''

میرا مطالعہ اس ضمن میں یہ ہے کہ (وضاحت آگے ہے) نہ تو 'پھول' بچوں کا اولین رسالہ ہے اور نہ اس کے ایڈیٹر امتیاز علی تاج تھے۔ بچوں کے اولین رسالہ ماہنامہ 'بچوں کا اخبار' کو منشی محبوب عالم نے مئی 1902 میں لاہور سے جاری کیا تھا۔ اس کا ذکر ڈاکٹر اسد اریب اور پروفیسر مظفر حنفی نے بھی اپنے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ (ماہنامہ قرطاس ناگپور، ادب اطفال، جنوری-اپریل 2013، جلد نمبر 26، شمارہ نمبر 4-1) ضیاء اللہ کھوکھر اس سلسلے میں لکھتے ہیں: ''مولوی محبوب عالم نے مئی 1902 میں ماہنامہ 'بچوں کا اخبار' جاری کیا، جو عمر عزیز کی ابھی دس بہاریں ہی دیکھ پایا تھا کہ خزاں کی زد میں آکر ابدی نیند سو گیا۔ 'بچوں کا اخبار' کو اردو زبان کا پہلا ماہوار رسالہ ہونے کا منفرد اعزاز حاصل ہے۔'' (بچوں کی صحافت کے سو سال/مرتب ضیاء اللہ کھوکھر 2004، ص 7-6)

اسی نام سے جنوری 1948 میں ایک پندرہ روزہ میاں سلطان احمد وجودی کی ادارت میں لاہور سے ہی شائع ہوا۔ پھر ہفت روزہ بچوں کا اخبار کوئٹہ سے جنوری 1972 میں جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر سید صفدر حسین اور اعزازی معاون شیخ فرید تھے۔

رسالہ 1909 میں جاری ہوا۔ اس کے قبل حیدر آباد سے 1908 میں بچوں کا رسالہ اتالیق شائع ہوا تھا۔

'پھول' کے مدیر سید ممتاز علی، امتیاز علی تاج کے والد تھے۔ یوں بھی پھول 1909 میں جاری ہوا اور 'سید امتیاز علی تاج 1900 میں لاہور میں پیدا ہوئے۔'' (تاریخ ادب اردو، جلد اوّل: وہاب اشرفی 2005، ص 568)

ضیاء اللہ کھوکھر کی مذکورہ تحریر کے اگلے حصے سے 'پھول' اور سید امتیاز علی تاج کا تعلق یوں ظاہر ہوتا ہے:

''پھول، بچوں کا ایسا واحد اور منفرد رسالہ ہے، جس میں شائع شدہ نظموں اور مضامین کا انتخاب کتابی صورت میں پیش کیا گیا۔ سید امتیاز علی تاج نے 'پھول' کی چیدہ چیدہ نظموں کا مجموعہ 'پھول باغ' کے نام سے دو جلدوں میں مرتب کیا۔ جسے ماہنامہ 'پھول' شائع کرنے والے ادارے 'دارالاشاعت پنجاب لاہور' نے اپنے روایتی اور مخصوص انداز میں شائع کیا۔ 1936 تک 'پھول باغ' کے کم از کم چار ایڈیشن نکل چکے تھے۔ اسی طرح 'پھول' کے سابق ایڈیٹر غلام عباس نے 'پھول' میں شامل نظموں اور مضامین کا انتخاب 'پھول' ہی کے نام سے مرتب کیا، یہ انتخاب ترقی اردو بورڈ کراچی نے 1963 میں شائع کیا۔'' (بچوں کی صحافت کے سو سال، ص 8)

جناب امتیاز احمد کے مضمون میں 10 رسالوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو پابندی سے شائع ہو رہے ہیں۔ میں ان میں تین رسالوں کا اضافہ کرنا چاہوں گا۔ ایک تو ماہنامہ 'گلشن اطفال'

ہے جو مالیگاؤں سے سلیم احمد رحمانی کی ادارت میں 2007 سے شائع ہورہا ہے۔ دوسرا بچوں کا ہفت روزہ 'خیراندیش' ہے جو خیال انصاری کی ادارت میں 1987 سے پابندی سے شائع ہورہا ہے۔ تیسرا رسالہ ماہنامہ 'بچوں کا تحفہ' (اعظم گڑھ) ہے۔ جو جنوری 2013 سے شاد اعظمی ندوی کی ادارت میں پابندی سے شائع ہورہا ہے۔

ڈاکٹر سید علی حیدر

221، پریتم نگر، سلیم سرائے، الہ آباد

ماہنامہ 'اردو دنیا' جون 2013 کا شمارہ ملا مگر ذرا تاخیر سے۔ زیرنظر ماہنامہ کے سرورق کی دیدہ زیبی کے لیے اب یہی کہنا ہے کہ اللہ کرے زور شباب اور زیادہ، جناب وسیم بریلوی وائس چیئرمین قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، کو حکومت اترپردیش کا سب سے بڑا ایوارڈ مبارک ہو۔ 'حق بہ حقدار رسید' زیرنظر شمارے میں بچوں کے ادب پر خصوصی گوشہ قابل ستائش سعی ہے۔ اردو فکشن ادب کی معتبر اور مقبول شخصیت شموئل احمد کا انٹرویو جو رفیق جعفر نے لیا ہے معلوماتی اور پرمغز ہے۔ اس شمارے کا سب سے اہم، معلوماتی اور تاریخی و ادبی حیثیت کا مضمون، کرناٹک میں اردو زبان کا ارتقاز وہاب عندلیب کا مضمون ہے۔ دکنی زبان و ادب کے سلسلے میں کوزے میں سمندر بند ہے۔ یہ مضمون میرے علم میں مزید اضافہ کرگیا۔ البتہ وہاب صاحب کا یہ فرمانا کہ ''برہان الدین جانم کا دکنی رسالہ 'کلمۃ الحقائق' وہ مستند رسالہ ہے جسے اردو نثر کا اولین نمونہ سمجھا جاتا ہے'' تازہ ترین تحقیق کی رو سے غیر صحیح ہے۔ پروفیسر گیان اور پروفیسر سیدہ جعفر اپنی مستند 'تاریخ ادب اردو 1700 تک' جلد دوم میں رقم طراز ہیں: ''اردو کی پہلی مستند نثری کتاب 'خیرالبیان'، مصنفہ: پیر روشاں بایزید انصاری م980ھ ہے۔'' (ص325) اور کلمۃ الحقائق (990ھ) کی تصنیف ہے۔ (ص357) نیز اشرف بیابانی کی مشہور و معروف مثنوی جس کو اردو کا پہلا مرثیہ شمار کیا جاتا ہے۔ اس کا سنہ تصنیف 909ھ مطابق 1503 ہے۔ 1553 آپ کے یہاں غلط چھپ گیا ہے اس کی تصدیق کرلی جائے۔

انور بارہ بنکوی

11/1H/7، ہرش اسٹریٹ، کلکتہ

ماہ جون 2013 کا تازہ شمارہ 'اردو دنیا' باصرہ نواز ہوا طبیعت فرحت افزا ہوئی۔ مدیر اعلیٰ ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کا ادارتی صفحہ 'ہماری بات' اس پوری اردو دنیا کے مشمولات سے زیادہ لائق تحسین ہے اور ہم شائقین ادب کو اپنی زبان اردو کی حرمت و عظمت کا کھلی فضا میں احساس دلا کر ہم پر واضح کیا کہ اردو زبان دنیا کی دوسری زبانوں میں اپنی ایک علیحدہ شناخت رکھتی ہے یہ بھی واضح کیا کہ زبان اردو سے جڑی ہماری مشرقی تہذیب بھی ہے جیسا کہ ڈاکٹر موصوف نے اپنے ادارتی صفحے کی پہلی ہی سطر سے یہ واضح کردیا کہ کسی بھی زبان کی قدر و قیمت، اہمیت و مقبولیت اور ترسیلی قوت کا اندازہ اس زبان میں بچوں کے لیے تخلیق کیے گئے ادب اور اس کے معیار ہی تہذیبی قدروں کا پتہ دیتے ہیں اس لیے ڈاکٹر موصوف نے اردو زبان کے فروغ کے سلسلے میں اردو کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی سے باہمی گفت وشنید کے بعد اپنے آئندہ روبہ عمل ہونے والے کارناموں پر روشنی ڈالی اور اپنے عزائم کا تفصیلی رپورتاژ پیش کرتے ہوئے مزید یہ بیان دیا کہ اردو زبان کی ترقی و ترویجی عندیے کے تحت جو عمل میں آنے والے کارہا ہے یقیناً اردو آبادی والے تمام حلقے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اس کارنامے سے ضرور مستفیض ہوں گے اور ہم شائقین ادب کونسل کے اس عظیم کارنامے کو بہت ہی مستحسن و محرک قدم کی علامت کہہ سکتے ہیں۔

الحاج شفیق احمد

استاد مدرسہ انوار العلوم، رامنگر، ضلع بارہ بنکی (یوپی)

ماہ نامہ اردو دنیا جون 2013 کے سرورق پر لکھا ہوا 'بچوں کا ادب اور اردو' اور اس سے متعلق چھپی خوبصورت تصویروں کے ساتھ شمارہ نظر نواز ہوا۔ شمارے میں ہماری بات کے موضوع پر مدیر صاحب نے اپنی بات بہت ہی اچھے انداز میں پیش کی ہے۔ اردو میں بچوں کے لیے دلچسپ اور معلوماتی ماہانہ رسالہ 'بچوں کی دنیا' کے اجرا کا مستحکم عزم اور ارادہ قومی اردو کونسل کا بہت ہی اہم فیصلہ ہے۔ یہ رسالہ اردو زبان کی خاطر خواہ ترویج و ترقی میں معاون ثابت ہوگا۔ اردو میں بچوں کے ادب کی اہمیت اور افادیت کی طرف خصوصی توجہ مرکوز کرتے ہوئے 'بچوں کا ادب اور اردو' کو شمارے کی کور اسٹوری کا موضوع بنانا بہت ہی خوب اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا اردو کے حق میں یہ تاریخ ساز آغاز ہے۔ قومی اردو کونسل ہمہ وقت اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لیے نہایت فکرمندی سے کام انجام دے رہی ہے۔ دیگر تمام مضامین بہت ہی دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ خاص طور سے کرناٹک میں اردو زبان کا ارتقا، گمشدہ مصروں کی تلاش اور میر انیس کی مصوری، اردو ادب اور گلکرسٹ بہت خوب لکھا گیا ہے۔ مشاہیر ادب کے تحت محمد حسین آزاد نیرنگ اور جھوٹ کا رزم نامہ بھی بہت ہی دلچسپ اور اچھا ہے۔ خورشید عالم کا لکھا ہوا 'سول سروسیز کے لیے نیا پیٹرن سی سیٹ' پڑھنے سے معلومات میں مزید اضافہ ہوا۔ ایک طرح سے اردو دنیا دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر خان حفیظ

2/17، فہمیدہ آباد، لیبر کالونی، چمن گنج، کانپور

'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ جون 2013 اپنی تمام تر رعنائیوں اور حشر سامانیوں کے ساتھ دستیاب ہوا۔ سرورق رنگین اور جاذب نظر ہے۔ آپ کا اداریہ 'اپنی بات' پڑھ کر اچھا لگا اور آپ کی مدبرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑا۔ آپ نے اپنے اداریے میں اردو سے متعلق جو سوالات اٹھائے ہیں وہ قابل توجہ ہیں۔ شموئل احمد ایک معتبر افسانہ نگار ہیں۔ ان کا انٹرویو پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ خاردار راستوں کا مسافر، اصغر علی انجینئر پر لکھا ہوا مضمون نہایت معلوماتی اور کارآمد ہے۔ فاروقی ارگلی کا رقم کیا ہوا مضمون 'بچوں کا ادب، تب اور اب' ایک معیاری معلوماتی اور دلکش مضمون ہے۔ انھوں نے بچوں کے ادب کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ بچوں کے ادب کو لکھتے وقت ان کے ذہنی معیار اور نفسیات کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ 'رام لعل ایک مطالعہ (مظہر محمود)، افسانوی ادب پر لکھا ہوا ایک منفرد مضمون ہے جو ان کے فن اور شخصیت پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔ رسالے میں شامل انگریزی کہانی 'پرتی ترپتی' نین تارا سہگل ایک معیاری کہانی ہے جس کا ترجمہ 'شائستہ فاخری' نے عمدہ طریقے سے کیا ہے۔ رسالے میں شامل سارے تبصرے رسالہ کے معیار کو قائم کیے ہوئے ہیں۔ مجموعی طور پر رسالہ عمدہ اور قابل تعریف ہے۔

الحاج ڈاکٹر محمد ناظم علی

پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑتاڑ، ضلع نظام آباد

جون دو ہزار تیرہ کا 'اردو دنیا' کا شمارہ مورخہ 3 جون موصول ہوا۔ سرورق پر بچوں کا ادب اور اردو سے اندازہ ہوگیا۔ اس میں بچوں کے ادب کا اہتمام و انصرام کیا گیا ہے۔ ٹی وی آنے کے بعد سے بچوں کے تخلیقی ادب پر توجہ کم ہوگئی۔ ٹی وی میں ایک دو پروگرام بچوں کے لیے پیش ہوئے تھے۔ ملا نصیرالدین، علاء الدین کا چراغ، موگلی وغیرہ لیکن عصری اردو ادب میں بچوں کے لیے کم لکھا جارہا ہے ان کی اصلاح کے لیے افسانے، ناول، شاعری کم ہی تخلیق ہورہے ہیں۔ اب کے اردو دنیا نے بچوں کے ادب کے تعلق سے ایک گوشہ یا نمبر کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ ہماری بات میں مدیر نے سچ کہا ہے کہ گزشتہ تیس چالیس برس سے ادب اطفال کے اردو سرمائے میں اضافے کا سلسلہ تقریباً رک گیا ہے اس کے اسباب کچھ بھی ہوں رکنا نہیں چاہیے تھا کھلونا جیسا ماہ نامہ بند ہوگیا۔ ماضی میں بچوں سے متعلق ادب وسیع و عریض تھا لیکن ادب سکڑ گیا ہے۔ شموئل احمد سے گفتگو ادبی معلومات سے پر ہے لیکن یہ کہاں تک سچ ہے کہ ان کا افسانہ 'سنگاردان' سے بیانیہ کی واپسی ہوتی ہے تحقیق طلب امر ہے اس کے

خطوط

باوجود شمویل احمد کی ادبی گفتگو معنی خیز اور بصیرت سے مزین ہے۔ اصغر علی انجینئر ملک وقوم کے دانشور اور مفکر تھے ان کے چلے جانے سے خلا پیدا ہوگیا ہے۔ بچوں کا ادب تب اور اب، بچوں کے ادب کی اہمیت وافادیت، بچوں کا ادب کھیل نہیں، بچوں کے اردو رسائل کردار اور تقاضے، ادب اطفال کی تخلیقی ضرورتیں وغیرہ ایسے موضوعات پر دانشورانہ وفکر انگیز مضامین ہیں جس سے بچوں کے ادب متعلقات ادب وادیب پر تفصیلی روشنی پڑتی ہے۔ 100 صفحات کا یہ شمارہ اپنے اندر ہمہ جہت خصوصیات وخوبیاں لیے ہوئے ہے۔

رونق جمال

'کائنات'اسٹریٹ نمبر 9، نیو آدرش نگر، درگ

'اردو دنیا' جون کا شمارہ وقت پر ہمہ دست ہوا۔ بہت خوب ہے۔ آپ کا لکھا اداریہ 'ہماری بات' میں ماہنامہ بچوں کی دنیا کی اشاعت کی خبر پڑھ کر ایسا لگا جیسے پتھر پر فصل لہلہانے لگی ہو۔ ریگستان میں پانی کا چشمہ مل گیا ہو۔ یا بھوکوں کو بھر پیٹ مرغوب غذا میسر آگئی ہو! آپ کے اس اقدام کی تعریف کے لیے مجھے الفاظ نہیں مل رہے ہیں اس لیے صرف مبارک باد پیش کر رہا ہوں۔ ویسے اداریے کا ایک ایک لفظ قابل تعریف ہے اور حقیقت پر مبنی ہے۔ رفیق جعفر نے شمویل احمد سے اچھی گفتگو کی ہے اور احمد صاحب نے بھی ان کے ہر سوال کا بیبا کی سے جواب دیا ہے۔ اصغر علی انجینئر اور شمشاد بیگم پر لکھے مضامین بھی پسند آئے۔ بچوں کے ادب پر تمام مضامین قابل تعریف ہیں۔ ڈاکٹر مظفر حنفی اور صدیق الرحمٰن قدوائی کے خیالات مختصر مگر جامع ہیں۔ وہاب عندلیب کا مضمون کرناٹک میں اردو زبان کا ارتقا پڑھنے کے بعد زیر شعاعیں کی مدیرہ محترمہ فریدہ رحمت اللہ کا ایک اداریہ یاد آرہا ہے جس میں انھوں نے کرناٹک میں اردو کی زبوں حالی کا خاص کر کرناٹک اردو اسکولوں کا تذکرہ کیا تھا کہ صوبے میں ہزاروں اسکول طلبا کی طوطا چشمی کی وجہ سے بند ہورہے ہیں یا بند ہوگئے ہیں۔ سید معین الدین علوی کا مضمون 'گم شدہ مصرعوں کی تلاش' پڑھ کر مزا آگیا۔ جناب نے نہایت عرق ریزی سے مضمون قلمبند کیا ہے۔ رام لعل پر مظہر محمود کا لکھا مضمون بہت خوب ہے۔ شمارے میں شامل تمام تبصرے اور عالمی اردو نامہ دلچسپ ہے۔ ایک گزارش ہے کہ کسی شمارے میں سعادت حسن منٹو کے سیاہ حاشیہ میں شامل تمام افسانچے شائع کریں تاکہ نئی نسل خاص کر نئے لکھنے والے ان افسانچوں کو پڑھ کر اپنے لیے راہیں تلاش کرسکے اور افسانچے کی باریکیوں کو سمجھ سکے!

جاوید اختر

کیندریہ ودھالیہ آئی آئی ایم، پربندھ نگر، لکھنؤ

جون 2013 کا 'اردو دنیا' میرے مطالعے میں ہے۔ اس کی خوبصورتی، دلکشی، جاذبیت، شگفتگی اور شائستگی آپ کے صاف شفاف دل ودماغ کی عکاس ہے۔ آپ کی مقدس شخصیت کا آئینہ ہے۔ آپ کی فکر کی پاکیزگی نے اسے ہر طرح کی سیاسی وادبی گروہ بندی سے پاک صاف رکھا ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس وقت 'اردو دنیا' اردو کا واحد جریدہ ہے جو صحیح معنوں میں اردو ادب کی خدمت کررہا ہے۔ ورنہ ہمارے عہد کے زیادہ تر رسائل فن سے زیادہ فنکار کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہمارا شعری ادب ہو یا نثری ادب جہاں کا تہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں مدیرانِ محترم اگر ذمے داری سے کام لیں تو یہ جمود ٹوٹ سکتا ہے۔ وہی تخلیق شائع کریں جس میں ندرت ہو، تخلیقیت ہو اور ادب میں خوشگوار اور صحت مند اضافے کی صورت نکلتی ہو۔ ظفر عدیم کا مضمون 'بچوں کا ادب کھیل نہیں!' بہت جامع بہت اہم ہے۔ چونکہ اس مضمون میں عدیم صاحب نے ان عام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور ہر اُس تلخ حقیقت پر اظہارِ خیال کیا ہے جو اس وقت ہمارے اردو ادب میں رائج ہیں۔ میری طرح نہ جانے کتنے ایسے اردو کے خیر خواہ اور چاہنے والے ہوں گے جو آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں اور بالغ نظری سے یہ آس لگائے ہوئے ہیں کہ 'اردو دنیا' کے ذریعے اردو کے نئے دریچے کھلنے والے ہیں جن سے تخلیقیت کی روشنی پوری اردو دنیا کو روشن کرے گی اور خوشگوار اور صحت مند اضافے ہوں گے۔ بڑوں کی دنیا میں گھومتے پھرتے 35-30 برس گزر گئے اب جی چاہتا ہے 'بچوں کی دنیا' کی سیر کی جائے اور اپنے آپ کو وقت سے پہلے بوڑھا ہونے سے بچایا جائے۔ یہ قدم بہت مبارک ہے کہ آپ نے بڑوں کے ادب کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادب کو بھی آگے بڑھانے کا بیڑا اٹھایا ہے خدا آپ کو اس میدان میں بھی سرخرو رکھے۔

ڈاکٹر رضوانہ ارم

صدر شعبۂ اردو جمشید پور، ویمن کالج

خوبصورت، رنگین، ادب اطفال سے مزین سرورق نے اس دفعہ کی 'اردو دنیا' جون 2013 کو دلکش اور دیدہ زیب بنا دیا ہے۔ 'ادب اطفال' کے توسط سے آپ کی گراں قدر رائے قابلِ قدر ہے۔ واقعی بڑی بڑی عمیق اور پرمغز تحریروں نے بچپن کے معصومانہ احساسات کو زک پہنچائی ہے۔ صداقت ومعصومیت نے گویا اس جہاں کو خیر باد کہہ دینے کا مصمم ارادہ کرلیا ہے۔ شمویل احمد، اصغر علی انجینئر، شمشاد بیگم، ادبی مباحث کے تعلق سے گم شدہ مصرعوں کی تلاش، میرانیس کی مصوری، اردو ادب اور گلکرسٹ، رام لعل، مشاہیر ادب ونظم، نظریۂ ارتقائے حیات، سول سروسیز کے لیے نیا پیٹرن، فلم ماحولیات، کتابوں کی دنیا اور اردو محض ایک زبان نہیں مکمل تہذیب ہے۔ عالمی اردو نامہ، خبرنامے، غرض کہ سبھی مضامین اور کالم ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔

مصطفی ندیم خاں غوری

مکان نمبر 4/54/7405/10-3، ورنداون کالونی، قدیم جالنہ

'اردو دنیا' مئی 2013 بروقت مل چکا تھا۔ کور اسٹوری پر غور وفکر وجہ تاخیر تھی اس شمارے میں کوئی چھ مضامین کور اسٹوری کو کور (Cover) کیے ہوئے ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک مضمون عرق ریزی وجانفشانی کی عظیم داستانیں، ہندوستانی مدارس سے فارغ بلند پایہ ادیب وشعرا سماجی مصلح صوفی سنت جن کی عقیدت میں سر جھک جاتے ہیں۔ یہی وہ مدارس ہیں جنھوں نے اردو ادب کو گہر بار ومالا مال کیا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مدارس کا معیار ان اسکولوں اور کالجوں سے بہتر یا کم از کم مماثل ہوتا کہ ہم اپنے بچوں کو ان میں بہ رضا ورغبت شریک درس کریں۔ ادھر مدارس کے منتظمین کو بھی چاہیے کہ لوٹ کھسوٹ سے پرہیز کریں۔ ان مدارس کے اساتذہ ولکچررس کی تنخواہیں کسی طور کم نہ ہوں۔ یہ نہیں کہ دینی تعلیم کے لیے ان میں سے کسی مولانا کو طلب کرلیا اور دو چار سو روپیہ ماہانہ بے قاعدگی سے ادا کرتے رہے۔ فاضل مصنفین نے اردو مدارس کی تمام تر روداد تو لکھ دی لیکن دیگر میڈیا کے اسکولوں کے مشاہدے کی جانب توجہ منتقل نہ ہوسکی کہ وہاں کا طرزِ تعلیم کیسا ہے لٹریچر تاریخ وجغرافیہ میں اساتذہ معصوم اذہان کو کیا درس دیتے ہیں۔ اردو اور اردو والوں کے تعلق سے ان میں جو رواداری اور کشادہ دلی پائی جاتی ہے اس میں اگر مزید بہتری کی گنجائش ہے تو آپ کے پاس اس سلسلے میں کیا تجاویز ہیں۔ ایک خوش آئند تبدیلی یہ رونما ہورہی ہے کہ اب ایسے پروقار معیاری مدارس بھی کھل رہے ہیں جن میں عربی زبان کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم کا بھی نظم ہوتا ہے۔ یہ مکاتیب رجسٹرڈ ومنظور شدہ ہوتے ہیں اور غالباً انھیں سرکاری امداد بھی میسر ہوتی ہے۔ دعا ہے کہ ان کے نتائج امید افزا برآمد ہوں۔

عبدالواجد خاں

موظف معلم 633، نواں کراسی، راجیونگر، III اسٹیج، میسور سٹی

'اردو دنیا' مئی 2013 کا سرورق دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ ہمارے دینی قلعے کی شاندار عمارتیں، اپنی روایتی آن بان سے کھڑے ہیں، جہاں اردو کا پرچم پوری شان وشوکت سے لہرا رہا ہے، اور جہاں خاموش خدمت گار، علم وفن کے آفتاب، تعلیم وتربیت کے مہتاب اپنے اپنے کام میں جٹے ہیں، یہ منظر بہ بانگ دہل یہ اعلان ہے:

کوئی طاقت ہمیں مسمار نہ کرپائے گی
عزمِ محکم کی قسم آہنی دیوار ہیں ہم

◘

احمد صغیر

اردو فکشن کی تنقید سے مطمئن نہیں ہوں

عبدالصمد

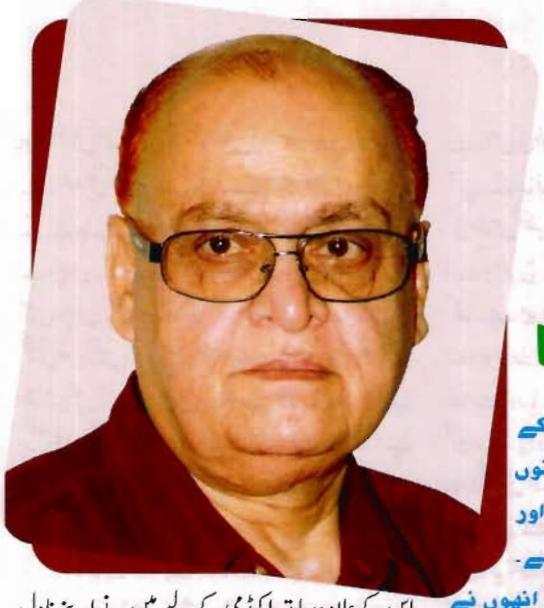

عبدالصمد اردو فکشن کا وہ نام ہے جس کا تفصیلی ذکر کیے بغیر، آزادی کے بعد لکھے گئے نثری تخلیقی ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ ان کے افسانوں اور ناولوں کی شہرت و مقبولیت صرف اردو زبان تک محدود نہیں۔ ہندی اور انگریزی کے ذریعے وہ قارئین ادب کے ایک وسیع جغرافیے تک پھیل چکی ہے۔ عبدالصمد کے ناولوں اور افسانوں کے انگریزی ترجمے تو ہوئے ہی ہیں انھوں نے براہ راست بھی انگریزی میں لکھا ہے۔ ان کا ایک انگریزی ناول ادب کے بین الاقوامی قارئین سے خراج تحسین حاصل کرچکا ہے۔ ان کی فکر، تحریر اور تخلیقیت میں غضب کا توازن پایا جاتا ہے جو ان کی ہمہ گیر مقبولیت کی خاص بنیاد ہے۔ پیش ہیں، احمد صغیر کے جناب عبدالصمد سے کیے گئے انٹرویو کے اقتباسات: (ادارہ)

احمد صغیر: اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں بتائیے۔

عبدالصمد: میں نالندہ ضلع کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ والدین نے حافظ قرآن بنانا چاہا۔ اٹھارہ پارے تک یہ سلسلہ چلا پھر حالات نے کچھ ایسا موڑ لیا کہ اسکول کی تعلیم ضروری ہوگئی آخر کار گھر ہی پر تیاری کر کے نویں کلاس کا امتحان دیا۔ پاس ہو کر دسویں میں نام لکھایا، یوں زندگی ایک پٹری پر چل پڑی۔ اس معاملے میں خوش قسمت ضرور ہوں کہ گھر کا ماحول ادبی نہیں ہوتے ہوئے بھی ادبی سفر میں مجھے قدم قدم پر خضر کی صورت ایسے لوگ ملتے گئے جنھوں نے میرے شوق کو مہمیز لگانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کچھ لوگوں نے محض اپنے وجود سے ہی اس آتش کو بھڑکانے میں مدد بہم پہنچائی۔ میں ان تمام لوگوں کا احسان مند ہوں۔

ا ص: اپنے تعلیمی سفر کے بارے میں ذرا تفصیل سے بتائیں۔

عبدالصمد: جیسا کہ میں نے عرض کیا دسویں کلاس سے میرا اسکول شروع ہوا۔ میں نے صغریٰ ہائی اسکول، بہار شریف سے جو ریاست بہار کے ممتاز اسکولوں میں شامل تھا، میٹرک پاس کیا پھر بہار شریف ہی کے نالندہ کالج میں داخلہ لیا۔ اس وقت میں سائنس کے مضامین پڑھ رہا تھا۔ بی ایس سی پارٹ۔ ون کے بعد میں نے سائنس چھوڑ دی اور آرٹس کے مضامین اختیار کیے۔ سائنس کا میں اچھا طالب علم بھی نہیں تھا اور ان مضامین میں اچھا رزلٹ بھی نہیں آرہا تھا۔ پولیٹیکل سائنس آنرز میں بی اے میں پوری یونیورسٹی میں اوّل آیا اور نیشنل اسکالرشپ کا حق دار ٹھہرا۔ ایم اے میں بھی ٹاپ کیا اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی) نے اپنے مرکزی دفتر سے فیلوشپ ادا کی۔ جس کے تحت شعبۂ سیاسیات، مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا سے پی ایچ ڈی کیا۔ فیلوشپ جاری ہی تھی کہ 1979 میں اورینٹل کالج، پٹنہ سٹی میں لکچرر شپ مل گئی۔ 1987 میں ریڈر بنا اور 1997 میں پروفیسر۔ یہ دونوں پروموشن میرٹ اسکیم کے تحت ملے۔ 1996 میں راج نارائن کالج، حاجی پور میں پرنسپل بنا۔ دو برسوں کے بعد مستعفی ہوکر واپس اپنے کالج میں آگیا۔ 2005 میں اورینٹل کالج، پٹنہ سٹی کا پرنسپل بنا۔ پانچ سال پرنسپل رہ کر یہاں بھی چھوڑ دیا اور اب اپنے شعبے میں سیاسیات پڑھاتا ہوں۔

ا ص: آپ سیاسیات کے پروفیسر ہیں پھر اُردو ادب سے دلچسپی کیسے پیدا ہوئی۔

عبدالصمد: ادب، خاص طور پر لکھنے لکھانے کا معاملہ تو خداداد ہوتا ہے۔ سبھی اردو پڑھنے والے لکھنے لکھانے سے تو دلچسپی نہیں رکھتے۔ اردو میرے گھر کی زبان ہے۔ اس زبان میں میں نے ماں، باپ، بھائی، بہن اور دوستوں عزیزوں کو خط لکھے۔ اس طرح جب اندرونی اظہار کی ضرورت ہوئی تو قدرتی طور پر اُردو زبان ہی میرا وسیلہ قرار پائی۔ آپ کو ایک بات بتاؤں میں نے ابتدا میں انگریزی اور ہندی میں بھی لکھنے کی کوشش کی تھی لیکن ان زبانوں سے فطری ہم آہنگی پیدا نہیں ہوسکی اور میں نے شدّت سے محسوس کیا کہ اُردو کے علاوہ کسی دوسری زبان میں، میں اپنے آپ کو کھول نہیں سکتا۔ یوں آگے چل کر میں نے انگریزی میں ایک ناول بھی لکھا اور پولیٹیکل سائنس میں بھی ایک کتاب انگریزی میں تحریر کی۔ اس کے علاوہ ساہتیہ اکیڈمی کے لیے میں نے اپنے ناول 'دو گز زمین' کا ہندی میں ترجمہ کیا۔ رہا معاملہ سیاسیات کا تو اس مضمون سے میری غایت دلچسپی رہی ہے۔ میرا کچھ وقت عملی سیاست میں بھی گزرا ہے۔ میں 1991 سے 1999 تک اُردو مشاورتی کمیٹی، بہار کا چیئرمین بھی رہا جو ایک وزیر کے برابر کا عہدہ ہے۔ گھر میں میرے والد محترم اور کچھ دوسرے لوگ سرگرم سیاست میں شامل تھے۔ بہرکیف میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ علم سیاسیات یا میدان سیاست میں میری کوئی پہچان نہیں ہے۔ تھوڑی بہت جو بھی پہچان ہے۔ وہ ادب ہی کے تعلق سے ہے۔ ادب نے مجھے ذہنی، روحانی آسودگی عطا کی ہے اور میں ادب کی پناہ میں اپنے آپ کو محفوظ پاتا ہوں۔

ا ص: ادب سے سیاست کا کیا رشتہ ہے۔ آپ نے اپنے سبجکٹ سیاسیات سے اُردو فکشن کو کیا فائدہ پہنچایا۔

عبدالصمد: جہاں تک سوال ہے فائدہ پہچانے کا تو اس سلسلے میں میری بساط کیا کہ میں اپنی حقیر ذات اور کمتر تحریر سے اردو فکشن کو فائدہ پہنچاؤں۔ یوں ادب سے سیاست کا کوئی براہ راست رشتہ تو نہیں، مگر آپ جانتے ہیں کہ آج زندگی میں قدم قدم پر سیاست چھائی ہوئی ہے۔ میں نے پہلے کہیں عرض کیا تھا کہ ہر وہ سانس جو انسان کے اندر جاتی ہے اور ہر وہ سانس جو اندر سے باہر آتی ہے۔ سیاسی عوامل سے متاثر ہوتی ہے۔ سیاست انسان کو بہت عزیز ہے اور سیاست سے وہ نفرت بھی کرتا ہے۔ سیاست نے آج ہم کو چاروں طرف سے یوں گھیر لیا ہے کہ ہم اس سے بھاگنا بھی چاہیں تو نہیں بھاگ سکتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سماجیات اور سیاسیات کا شعور رکھے بنا وہ ادب تخلیق ہی نہیں کیا جاسکتا جس ادب کو ہم زندگی کا مرقع کہتے ہیں۔ آپ میرے تمام ناولوں اور اکثر افسانوں کا مطالعہ کیجیے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ میں نے اپنے سبجکٹ سے کہاں کہاں استفادہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس شعور کے بغیر کم

سے کم ناول کے فارم میں کوئی قابل ذکر کام نہیں کیا جا سکتا۔

ا ص: آپ نے اپنا افسانوی سفر جدیدیت سے شروع کیا پھر راست بیانیہ کی طرف لوٹ آئے۔ اس کی کیا وجہ رہی۔

عبدالصمد: میں نے اپنا افسانوی سفر جدیدیت سے نہیں، اس بیانیہ سے شروع کیا جس بیانیہ کی طرف آپ نے اشارہ کیا۔ میں نے اپنا ادبی سفر بچوں کے رسالوں میں لکھنے سے شروع کیا تھا۔ پہلی کہانی 'جھوٹ کی سزا'، 'غنچہ' بجنور میں اپریل 1961 میں شائع ہوئی۔ 'کھلونا'، 'کلیاں'، 'مسرت' وغیرہ میں کہانیاں چھپتی رہیں۔ اس درمیان میں یہ بات واضح کر دوں کہ اس زمانے میں بچوں کے رسالے لکھنے والوں کے لیے بہترین ٹریننگ کیمپ تھے۔ ان رسالوں کے ذریعے قلم پکڑنا آتا تھا۔ الٹی سیدھی تحریریں لکھنا آتی تھیں، کچے، پکے پلاٹ بننے کی مشق ہوتی تھی۔ یہ رسالے، قلم پکڑنے والوں کے لیے ایسی راحت فراہم کرتے تھے، جن سے آج ہم بالکل محروم ہیں۔ میرا پہلا افسانہ ہفتہ وار 'ہمارا نعرہ' پٹنہ میں 1965 میں شائع ہوا۔ جس کے ایڈیٹر جناب شمس الہدیٰ استھانوی تھے۔ اس کے بعد 'بیسویں صدی'، 'شمع' وغیرہ میں میرے کئی افسانے شائع ہوئے۔ برادرِ بزرگ ظفر اوگانوی نے 1967 میں پٹنہ سے ماہنامہ 'اقدار' کا اجرا کیا۔ اس وقت جدیدیت کا سورج تیزی سے نصف النہار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ 'شب خون' خریدنا، پڑھنا اور چھپنا (یہاں تک کہ خط ہی سہی) ایک کریز سا بن گیا تھا۔ 'اقدار'، 'شب خون' سے بھی آگے کا رسالہ تھا لیکن دو تین شماروں کے بعد ہی دم توڑ گیا۔ بہت بعد میں ظفر اوگانوی اسے کلکتہ لے گئے تو میں نے پٹنہ والے اقدار کے لیے ایک افسانہ (علامتی— جدید) 'ایک مرغ' بھیجا۔ علامتی، جدید افسانوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ فوراً چھپ جاتے تھے۔ اس زمانے میں تھوک کے بھاؤ سے ایسے افسانے لکھے گئے اور خوب خوب چھپے۔ کچھ بہت اچھے افسانے بھی لکھے گئے۔ میرا افسانہ 'ایک مرغ' کے چھپنے کا اعلان بھی ہوا مگر وہ شمارہ کبھی نظر میں نہیں آ سکا۔ ظفر اوگانوی نے شائع نہیں ہونے والے اقدار کا سارا مواد بسکل واسطی کو بھیج دیا۔ جنھوں نے جمشید پور سے 'آئندہ' نکالنے کا عزم باندھا تھا۔ وہ افسانہ 'آئندہ' ہی میں شائع ہوا۔ میں یہ بات واضح کر دوں کہ میں علامتی یا تمثیلی افسانوں کا نہ بہت مخالف تھا نہ اب ہوں، البتہ ان کے نام پر جو اُدھم مچائے جا رہے تھے بے معنی تحریریں لکھی جا رہی تھیں، انھیں اپنی سہولت کے مطابق جو معنی پہنائے جا رہے تھے ان کا مخالف ضرور ہوں۔ مجھے اس زمانے کی بھیڑ چال کی روش زیادہ راس نہیں آئی اور میں کوشش کرنے لگا کہ میرے افسانے شائع ہوں تو لوگ انھیں پڑھیں بھی۔ جناب عابد سہیل کا رسالہ 'کتاب' میرے مزاج سے ہم آہنگ تھا۔ 'کتاب' میں میرے وہ افسانے شائع ہوئے جو میری ادبی پہچان میں بہت حد تک معاون ثابت ہوئے۔ 'بارہ رنگوں والا کمرہ' 'کتاب' میں ہی چھپا تھا اور اس زمانے میں خاص توجہ کا مرکز بنا تھا۔ اس عنوان سے میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ 1980 میں الٰہ آباد سے شائع ہوا۔ جس کے محرک میرے دوست علی احمد فاطمی تھے۔

میں جس ڈھنگ کے افسانے لکھنا چاہ رہا تھا اس کے لیے مناسب ترین رسالے موجود تھے۔ 'آہنگ'، 'کتاب'، 'عصری آگہی'، 'عصری ادب' وغیرہ۔ کلام حیدری نے 'آہنگ' میں چند دوسرے ہم عصروں کے ساتھ میرا بھی خصوصی مطالعہ شائع کیا۔ خوش قسمتی سے وہ تمام لوگ ایک عرصے تک اردو فکشن پر چھائے رہے۔ کلام حیدری نے نہایت خلوص اور ایمانداری سے میری ادبی رہنمائی فرمائی۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں۔ اس میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔

ا ص: آپ تو اچھے خاصے افسانے لکھ رہے تھے، پھر آپ ناول کی طرف کیوں متوجہ ہوئے؟

عبدالصمد: پندرہ بیس برسوں تک لکھتے رہنے کے بعد اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میرے موضوعات قابل اظہار حد تک میرے افسانوں میں سما نہیں رہے ہیں یعنی کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے۔ ایک طویل افسانہ لکھا تھا 'کھوکھلی آواز' جو ایک ناولٹ کے طور پر آہنگ کے پورے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ بتدریج ناول لکھنے کے خیال نے ایک مصمم ارادے کی صورت اختیار کر لی۔ ایک مواد بہت دنوں سے اندر اندر مبہم انداز میں پلتا رہا تھا۔ 1971 میں بنگلہ دیش کا قیام برصغیر ہند کا ایک بڑا سیاسی اور سماجی واقعہ تھا۔ جس کے دور رس نتائج سامنے آئے۔ لاکھوں افراد اس سے متاثر ہوئے۔ خاص طور پر وہ لوگ جو جنت کی تلاش میں پاکستان گئے تھے۔ میں بھی پاکستان یا سابق مشرقی پاکستان نہیں گیا لیکن اس کرب کی شدّت کو بہت قریب سے محسوس کیا جس میں یہاں کے مسلمان مبتلا ہوئے۔ بہار اور یوپی کے بیشتر گھرانے کے لوگ پاکستان چلے گئے تھے۔ ان سے یہاں کے لوگوں کا جو خونی رشتہ تھا وہ بہر حال برقرار تھا۔ اس معصوم اور بے ضرر حقیقت کو یہاں شک کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ یہ سارا منظر نامہ میرے شعور میں محفوظ تھا۔ ناول لکھنے کا ارادہ کیا تو یہ تمام باتیں ذہن میں پھر آ گئیں۔ اُردو اکادمی بہار سے گرانٹ ملنے کے بعد میں نے مسودہ بہار کے مشہور کاتب جناب قمر نظامی کے حوالے کر دیا۔ وہ ادب کا بھی ایک اعلیٰ شعور رکھتے تھے۔ کتابت شدہ مواد میرے حوالے کرتے ہوئے انھوں نے مشورہ دیا کہ اس ناول کو فوراً چھپ جانا چاہیے۔ میری بیوی کے بعد وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے نہ صرف مسودے کو بغور پڑھا تھا بلکہ از راہ کرم مقررہ مدت سے کم عرصے میں کتابت بھی کر دی تھی۔ یہاں پر یہ اعتراف بھی ضروری ہے کہ میری 'بیوی افسانہ' نے مسودے میں ضروری ترمیم کی اور صرف ضروری صلاح ہی نہیں دی ناول کا نام بھی ان ہی کا تجویز کردہ ہے۔

ا ص: آپ کا ناول 'دو گز زمین' جتنا مقبول ہوا دوسرے ناول کیوں مقبول نہیں ہو سکے۔

عبدالصمد: اس میں کوئی شک نہیں کہ 'دو گز زمین' نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان بہاریوں کی نفسیات پر کوئی ناول نہیں لکھا گیا جو اپنا وطن، اپنی سرزمین کو ہمیشہ کے لیے تیاگ کر کے نئے ملک میں گئے تھے مگر وہ بنگالیوں کی زبان، تہذیب اور ان کی سرزمین تک کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ انھیں مغربی پاکستان کے حکمراں طبقے کی در پردہ حمایت بھی حاصل تھی۔ آہستہ آہستہ آگ سلگتی رہی اور ایک ایسے آتش فشاں کی صورت اختیار کر گئی جس نے لاکھوں لوگوں کا سب کچھ جلا دیا۔ یہ بہاری کس طرح ہندوستان آئے، پھر نیپال وغیرہ کے راستے مغربی پاکستان پہنچے۔ وہاں انھیں اس وقت کے سندھ کے وزیر اعلیٰ مصطفیٰ جتوئی صاحب کا یہ اعلان سننا پڑا کہ ان بہاریوں کی اصل جگہ اب صرف سمندر ہے۔ غرض یہ ایک ایسی المناک داستان ہے جو کسی نہ کسی شکل میں آج بھی جاری ہے۔ اکثر پڑھنے والوں کو یہ کہانی اپنی معلوم ہوئی۔ انہیں زمینی حقیقتوں کی واقفیت ہوئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ 1990 میں اسے ساہتیہ اکیڈمی کا ایوارڈ ملا اور ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے شائع ہوئے لیکن یہ بات صحیح نہیں کہ میرے دوسرے ناولوں کو مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ 'خوابوں کا سویرا' نے کچھ کم شہرت حاصل نہیں کی۔ میک ملن نے اسے انگریزی میں شائع کیا اور نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجیز میسور نے اس پر دو روزہ سمینار منعقد کیا۔ یہ حکومت ہند کا ایک باوقار ادارہ ہے۔ اس کے علاوہ 'مہاسا گر'، 'مہاتما'، 'دھمک' اور 'بکھرے اوراق' خاص دلچسپی اور سنجیدگی سے پڑھے گئے۔ ان ناولوں پر درجنوں مقالے لکھے گئے۔ تقریباً یہ سبھی ناول ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے مختلف کورسز میں شامل ہیں۔

ا ص: ادب میں تحریک اور رجحانات کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے اور آپ خود کو کس تحریک یا رجحان سے منسلک کرتے ہیں۔

عبدالصمد: تحریکیں اور رجحانات تو چلتے رہتے ہیں کہ زمانے کے تقاضے کے مطابق ادب کو بھی Up-date رکھنا پڑتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو ادب بھی اس ندی کی طرح ہو

جائے جس کا بہاؤ رک جاتا ہے اور پانی کو آگے جانے کا راستہ نہیں ملتا۔ تمام تحریکوں اور رجحانات سے ادب کو فائدہ ہی پہنچا ہے۔ جہاں تک ان تحریکوں اور رجحانات سے منسلک ہونے کا سوال ہے تو کوئی بھی لکھنے والا ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن جھنڈا لے کر ان تحریکوں کے ہراول دستے میں شامل ہونے کو میں مناسب نہیں سمجھتا۔ یہ تو پڑھنے والوں کی صواب دید پر ہے کہ وہ ہماری تحریروں میں کہاں تک ان تحریکوں اور رجحانات کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں اور اس کی وجوہات تلاش کرتے ہیں۔

ا ص: افسانوی ادب میں آج کل دلت موضوع پر بہت زور دیا جارہا ہے۔ کیا آپ نے بھی اس موضوع پر افسانے یا ناول لکھے ہیں یا لکھنے کا ارادہ ہے۔

عبدالصمد: یہ ایک بہت اہم موضوع ہے اور اس پر دل جمعی کے ساتھ لکھنا چاہیے۔ بدقسمتی سے اُردو میں اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ دوسری ہندوستانی زبانوں میں اس پر خاصے کام ہوئے ہیں۔ خاص طور پر مراٹھی ادب میں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جو اپنی معنویت اور حقیقت کے اعتبار سے بہت آگے جاسکتا ہے۔ میں نے اپنے ناول 'دھمک' میں اس موضوع کو اپنایا ہے۔ اس میں دو مرکزی کردار دلت طبقے کے احساسات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔

ا ص: گزشتہ دس برسوں میں جو ناول منظر عام پر آئے ان میں کون سے ناول اہم ہیں۔

عبدالصمد: کئی ناول ہیں جن کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ مشرف عالم ذوقی کے ناول ہیں۔ غضنفر اور پیغام آفاقی کے ناول ہیں۔ خود آپ کے دو ناول 'جنگ جاری ہے' اور 'دروازہ ابھی بند ہے' ہیں۔ صادقہ نواب سحر کا بھی ایک اہم ناول منظر عام پر آیا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا 'کئی چاند تھے سر آسماں' ہے۔ خالد جاوید کا 'موت کی کتاب' ہے اور بھی کئی ناول ہیں۔ بات یہ ہے کہ ناولوں کا فوراً تجزیہ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس کے لیے کافی وقت درکار ہوتا ہے اور بہت آہستہ آہستہ یہ گتھی کھلتی ہے اور جب کھلتی ہے تو اس کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ کچھ تحریروں کا وقتی طور پر جو غلغلہ ہوتا ہے وہ دیر پا نہیں ہوتا۔ ایسی کئی مثالیں موجود ہیں۔

ا ص: موجودہ اُردو فکشن کی تنقید سے کیا آپ مطمئن ہیں؟

عبدالصمد: بالکل مطمئن نہیں ہوں۔ تنقید میں جو غیر جانب داری، ایمانداری اور خلوص کے عناصر ہونے چاہئیں وہ کم سے کم مجھ جیسے کوتاہ نظر کو نظر نہیں آتے۔ آج صورتحال یہ ہے کچھ تنقید نگار آپس میں مل کر یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کس چیز کو بانس پر چڑھانا ہے اور کسے بالکل رد کر دینا ہے مگر میں پھر کہوں گا کہ یہ تمام معاملہ وقتی ہوتا ہے۔ اصل ناقد پڑھنے والے ہوتے ہیں۔ اس کے لیے صرف ایک نسل تک محدود نہیں رہا جا سکتا۔ ادب کا فیصلہ وقت کرتا ہے اور وقت، وقتی بہاؤ کے تحت نہیں چلتا۔

ا ص: آپ نے انگریزی میں بھی ایک ناول "The Journey Of a Burning Boat" لکھا ہے۔ آپ اس ناول کے بارے میں کچھ بتائیے؟

عبدالصمد: دراصل میرے دو ناولوں کے انگریزی میں ترجمے چھپے۔ ایک ساہتیہ اکادمی نے چھاپا، دوسرا میک ملن نے۔ مجھے غالباً خیال آیا کہ کیوں نہ میں خود ہی انگریزی میں لکھنے کی کوشش کروں۔ انگریزی ہماری مادری زبان تو ہے نہیں۔ انگریزی تو ہم لوگوں نے ضرورتاً پڑھی ہے۔ چنانچہ میں نے ایک Synopsis بنایا۔ آپ جانتے ہیں کہ تیسری دنیا، جس میں ہمارا ملک، پاکستان، نیپال، برما، بنگلہ دیش، سری لنکا اور دوسرے ترقی پذیر ممالک شامل ہیں، طرح طرح کی سماجی برائیوں میں مبتلا ہیں یا یوں کہیے کہ مبتلا کر دی گئی ہیں۔ ان برائیوں میں ایک برائی ایسی ہے جس پر دھیان نہیں دیا جاتا۔ Child abuse، غریب بے سہارا بچے غائب کر دیے جاتے ہیں یا انھیں پیسے دے کر خرید لیا جاتا ہے۔ ان بچوں کو صرف Sexualy exploit نہیں کیا جاتا بلکہ ان کا ایسا ایسا استعمال ہوتا ہے کہ جان کر روح کانپ جاتی ہے۔ میں نے اپنا Synopsis خشونت سنگھ کو دکھایا۔ انھوں نے پسند کیا اور مجھے ناول لکھ ڈالنے کا مشورہ دیا۔ ان کی گفتگو سے میرا حوصلہ بڑھا اور میں نے ناول لکھ لیا۔ اس سلسلے میں میرے مرحوم دوست نارائن اچاری نے میری بہت مدد کی۔ ہم لوگ تقریباً روز ہی مسودے پر باتیں کرتے تھے۔ بہرکیف ناول چھپ گیا اور کافی پسند کیا گیا۔

ا ص: آپ کے بعد جو نسل ناول اور افسانے میں سامنے آئی ہے ان کے بارے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے۔

عبدالصمد: ان میں کچھ لوگ تو غیر معمولی ذہانت کے مالک ہیں۔ انھیں اپنے زمانے کا ادراک ہے اور وہ بھرپور سماجی اور سیاسی شعور رکھتے ہیں۔ ان میں بس ایک کمی ہے، وہ لکھنے میں اور اس سے زیادہ چھپنے میں بہت عجلت سے کام لیتے ہیں۔ ناول لکھنے کے لیے جس غور و فکر، ریسرچ، صبر و تحمل، زندگی کے فلسفے کی تعمیر و تشکیل اور وقت کی ضرورت ہوتی ہے ان پر ہمارے نئے لکھنے والے دھیان نہیں دیتے۔ دھیان دیں تو وہ اردو فکشن کو مالا مال کر سکتے ہیں۔ ان کے اندر صلاحیتوں کی کمی نہیں ہے۔ یوں میں ان سے ہرگز مایوس نہیں ہوں۔

ا ص: آپ کی نئی آنے والی کتابیں کون کون سی ہیں۔

عبدالصمد: ایک ناول 'شکست کی آواز' چھپ رہا ہے۔ افسانوں کا ایک مجموعہ 'بہ قلم خود' بھی جلد ہی شائع ہوگا۔

ا ص: کہا جارہا ہے 2000 کے بعد نئی نسل افسانوی ادب کی طرف کم راغب ہو رہی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

عبدالصمد: میرا خیال ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ اس وقت نئی نسل جس طرح افسانوی ادب کی طرف مائل ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے اتنی بڑی تعداد میں مائل نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت بے شمار رسالے نکل رہے ہیں اور ان سب میں بڑی تعداد میں افسانے شائع ہو رہے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ معیار بہت گھٹ گیا ہے۔ سو، پچاس شائع شدہ افسانوں میں ایک آدھ ہی ایسا نکل پاتا ہے جسے ہم واقعی افسانہ کہتے ہیں۔ اس مسئلے پر خود نئی نسل کو سوچنا چاہیے، کیونکہ ان میں شعور کی ہرگز کمی نہیں۔ انھیں Priorities خود طے کرنا چاہیے۔

Ahmad Sagheer, Anugarah Memorial College, Katari Hill Road Gaya - 823001 (Bihar)

سوانحی کوائف

نام: محمد عبدالصمد
تاریخ پیدائش: 1 جولائی 1952
والد: محمد شبلی
مقام: بہار شریف، نالندہ
تعلیم: بی اے، ایم اے، پی ایچ ڈی (پالیٹکل سائنس)

تصانیف:

بارہ رنگوں والا کمرہ (افسانوی مجموعہ) 1980، دوگز زمین (ناول) 1988، پس دیوار (افسانوی مجموعہ) 1983، مہاتما (ناول) 1992، خوابوں کا سویرا (ناول) 1992، سیاہ کاغذ کی دھجیاں (افسانوی مجموعہ) 1996، مہاساگر (ناول) 1999، میوزیکل چیئر (افسانوی مجموعہ) 2002، دھمک (ناول) The Journey of a Burning Boat، 2005، (ناول) 2012، بکھرے اوراق (ناول) 2010، آگ کے اندر راکھ (افسانوی مجموعہ) 2008

انعامات و اعزازات: ناول ''دوگز زمین'' پر ساہتیہ اکیڈمی کا ایوارڈ 1990 میں ملا اس ناول پر 1998 میں بھارتیہ بھاشا پریشد کا بھی ایوارڈ ملا۔ اسی ناول پر 1990 میں بہار اُردو اکادمی اور اتر پردیش اردو اکادمی کے انعام سے بھی نوازا گیا۔ افسانوی مجموعہ ''پس دیوار'' پر 1985 میں بہار اُردو اکادمی نے انعام دیا۔ بہار اُردو اکادمی نے ہی افسانوی مجموعہ ''بارہ رنگوں والا کمرہ'' پر بھی 1981 میں انعام سے سرفراز کیا۔ نالندہ ضلع ساہتیہ سمیلن نے بھی اعزاز و انعام سے نوازا۔

ادارہ

اقلیتوں کی تعلیمی ترقی کے لیے سفارشات

21 مئی کو مرکزی وزیر کو رپورٹ پیش کیے جانے کا منظر

مرکزی حکومت نے ملک کی اقلیتوں کو تعلیم سے آراستہ کرنے اور ان کے تعلیمی معیار کو اوپر اٹھانے کے مقصد سے این ایم سی ایم ای (نیشنل مانیٹرنگ کمیٹی آف مائنارٹی ایجوکیشن) کے نام سے جو نگراں کمیٹی تشکیل کی تھی اور جس کی پہلی میٹنگ گزشتہ سال اپریل میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کی قائمہ کمیٹی (اسٹینڈنگ کمیٹی) نے اپنی پہلی رپورٹ پیش کردی ہے اور رپورٹ کے تعلق سے امید ظاہر کی جارہی ہے کہ یہ ملک کی اقلیتوں، بالخصوص سب سے بڑی اقلیت کے زمرے میں آنے والے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے سلسلے میں یہ بے حد مددگار ثابت ہوگی۔

فروغ انسانی وسائل کی مرکزی وزارت نے این ایم سی ایم ای کا پیشہ ورانہ تعلیم اور ہنرمندی کے فروغ، اسکیموں کے نفاذ، تعلیم کی ضرورتوں کا خاکہ تیار کرنے، لڑکیوں کی تعلیم اور اردو زبان کے فروغ جیسے شعبوں میں تعاون دینے کے لیے ایک ساتھ پانچ ذیلی کمیٹیاں تشکیل دی تھیں۔ ان ذیلی کمیٹیوں نے دلّی اور باہر بہت سی میٹنگیں کیں۔ قائمہ کمیٹی کے چیئرمین اور جامعہ ہمدرد کے سابق وائس چانسلر جناب سراج حسین کے مطابق رپورٹ تیار کرنے سے پہلے ذیلی کمیٹیوں کی فراہم کردہ معلومات کا مطالعہ کیا گیا اور ان کی سفارشات بھی رپورٹ میں شامل کی گئی ہیں۔

قائمہ کمیٹی اور ذیلی کمیٹیوں نے تقریباً ایک سال کے عرصے میں 32میٹنگیں کیں اور تعلیم کی مختلف سطحوں پر مذہبی اقلیتوں خاص طور پر مسلمانوں کی شرکت سے متعلق مختلف معاملات کا مطالعہ کیا۔ البتہ قائمہ کمیٹی کی کچھ میٹنگوں میں صرف دلّی میں رہنے والے ارکان نے ہی شرکت کی۔ چیئرمین موصوف کا کہنا ہے کہ کمیٹی کو پچھلے برسوں میں پیش کی گئی رپورٹوں جیسے سچر کمیٹی رپورٹ اور رنگا ناتھ مشرا رپورٹ وغیرہ کے مطالعے سے اقلیتوں، خاص طور پر مسلمانوں کی بنیادی تعلیم سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک تعلیم میں کم شرکت کی پیچیدہ وجوہات کے بارے میں بھی جاننے کا موقع ملا ہے۔ اس ضمن میں نیشنل یونیورسٹی فار ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ ایڈمنسٹریشن (این.یو.ای. پی.اے) کے پروفیسر سدھانشو بھوشن کے مطالعات اور ابوصالح شریف کی ”سچر کے بعد چھ سال، ہندوستان میں2006 کے بعد سے جامع سماجی پالیسیوں کا جائیزہ“ نامی رپورٹ کا بھی مطالعہ کیا گیا۔ رپورٹ کے پیش لفظ میں جناب سراج حسین نے واضح کیا ہے کہ یہ ان رپورٹوں کی سیریز میں پہلی رپورٹ ہے جسے کمیٹی اپنی میعاد کے دوران پیش کرنے کی تجویز رکھتی ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ یہ رپورٹ منصوبہ بندی کرنے والوں، پالیسی سازوں اور سرکاری عہدیداروں اور غیرسرکاری تنظیموں کے لیے کار آمد ثابت ہوگی جو اقلیتوں کے فروغ کے لیے سرگرمی کے ساتھ کام کررہے ہیں۔

قائمہ کمیٹی کی تقریباً ایک سو صفحات پر مشتمل رپورٹ میں ملک کی مذہبی اقلیتوں کی بنیادی تعلیم، ثانوی (سیکنڈری) تعلیم، اعلیٰ تعلیم، تکنیکی تعلیم، مدرسوں کی تعلیم، پیشہ ورانہ تعلیم، اساتذہ کی تربیت، اسکالرشپ اسکیموں اور اقلیتی اداروں کے لیے بنیادی ڈھانچے کی ترقی کے حالات کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس سلسلے میں کل ہند سطح پر متعلقہ اعداد و شمار اور گوشوارے دے کر نتائج پر پہنچنے اور سفارشات وضع کرنے کی سنجیدہ کوشش کی گئی۔

کمیٹی نے جو سفارشات کی ہیں ان کا دائرہ اقلیتوں کی تعلیم سے متعلق موجودہ سرکاری اسکیموں کو مستحکم کرنے اور مزید توسیع دینے سے لے کر پورے ملک میں اقلیتی آبادی والے علاقے میں مزید تعلیم گاہیں کھولنے، اقلیتی طلبا کو داخلوں میں ریزرویشن دینے، ملک گیر سطح پر مذہبی اقلیتوں کی تعلیمی صورت حال کے بارے میں معلومات جمع کرنے کا ایک مربوط نظم اپنانے، اساتذہ کی تنخواہیں بڑھانے، مدرسوں کو سرکاری امداد ملنے میں ہونے والی تاخیر کا سلسلہ روکنے، اقلیتی طلبا کو ٹیچر بننے کے مواقع دینے، مختلف تعلیمی سطحوں پر طلبہ کے لیے کوچنگ کا سلسلہ شروع کرنے، اقلیتی لڑکیوں کو تعلیم کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرنے تک پھیلا ہوا ہے۔

قائمہ کمیٹی کی رپورٹ کا یہ نچوڑ

چودھویں باب میں پیش کیا گیا ہے جس کا عنوان ہے 'آئندہ کیے جانے والے کام اور سفارشات'۔ ذیل میں اس اہم ترین باب کے اہم نکات پیش ہیں:

آئندہ کیے جانے والے کام اور سفارشات

❑ کمیٹی کو معلوم ہوا ہے کہ داخلے کی مختلف سطحوں پر مذہبی اقلیتوں کی شمولیت کے قابل اعتماد اعداد و شمار بہت کمزور ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ ڈسٹرکٹ انفارمیشن سسٹم فار ایجوکیشن (ڈی آئی ایس ای) کے تحت درجہ-1 سے درجہ-8 تک کے اعداد و شمار حاصل کرنے کا ایک جامع نظام موجود ہے، لیکن فی الحال درجہ-9 سے آگے کے جامع اعداد و شمار حاصل کرنے کا کوئی نظام نہیں ہے۔ کمیٹی کو یہ بھی پتہ چلا ہے کہ وزارت درجہ-9 سے 12 تک کی سیکنڈری تعلیم کے لیے اعداد و شمار جمع کرنے کے لیے ایک پروجیکٹ شروع کر رہی ہے، لیکن بدقسمتی سے اس سے مذہبی اقلیتوں کے اعداد و شمار حاصل نہیں کیے جاسکیں گے۔ اقلیتوں کے اعداد و شمار جمع نہ کرنے کی وجہ بیان نہیں کی گئی ہے۔ اس لیے سفارش کی جاتی ہے کہ حکومت موجودہ ڈی آئی ایس ای پروجیکٹ کے تحت درجہ-1 سے درجہ-8 تک اور سیکنڈری ایجوکیشن مینجمنٹ انفارمیشن سسٹم (ایس ای ایم آئی ایس) پروجیکٹ کے تحت درجہ-9 سے درجہ-12 تک مذہبی اقلیتوں کے اعداد و شمار جمع کرنا فوراً شروع کرے۔

❑ کمیٹی یہ بھی سفارش کرتی ہے کہ تکنیکی اور اعلیٰ تعلیم میں بھی اعداد و شمار جمع کرنے کا ایک جامع نظام شروع کیا جائے اور اس میں وزارت ترقی انسانی وسائل کے علاوہ دیگر وزارتوں یعنی صحت اور خاندانی بہبود کی وزارت (میڈیکل اور پیرامیڈیکل کورسیز)، زراعتی ریسرچ کے محکمے، ٹیکسٹائل کی وزارت (فیشن ٹیکنالوجی وغیرہ) کے ذریعے چلائے جانے والے کورسیز کو بھی شامل کیا جائے، اس لیے وزارت ترقی انسانی وسائل کو ایسی دیگر وزارتوں کے ساتھ اس معاملے کو اٹھانا چاہیے جو درجہ-12 کے بعد کے کورسیز چلا رہی ہوں۔

❑ انٹرمیڈیٹ کے بعد کے کورسیز کے لیے معلومات جمع کرنے کے لیے ایک سسٹم تیار کرتے وقت حکومت قائمہ کمیٹی سے بھی مشورہ کرے تاکہ سافٹ ویئر ڈیزائن کرتے وقت اقلیتوں کی تعلیم سے متعلق اعداد و شمار جمع کرتے وقت خاطر خواہ احتیاط سے کام لیا جاسکے۔

❑ ڈی آئی ایس ای کے ذریعے جمع کی جانے والی داخلوں سے متعلق معلومات کے علاوہ اقلیتوں کے لیے

21 مئی کو وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کو رپورٹ پیش کیے جانے کا منظر

اقلیتوں کی تعلیم کے لیے قومی نگراں کمیٹی (این ایم سی ایم ای) کی قائمہ کمیٹی

• جناب سراج حسین	چیئرمین
• پروفیسر امتیاز احمد	رکن
• جناب محبوب الحق	رکن
• جناب حنیف لکڑاوالا	رکن
• سیدہ امام	رکن
• محترمہ تیستا سیتلواڑ	رکن
• پروفیسر ذکیہ صدیقی	رکن
• جناب رومی جعفری	رکن
• جناب عمر پیرزادہ	رکن
• ڈاکٹر احمد تمیم	رکن
• جناب ظفر اپچ جنگ	رکن
• پروفیسر محمد حلیم خان	رکن
• مولانا محمد ولی رحمانی	رکن
• جناب پی اے انعام دار	رکن
• جناب بھجن سنگھ والیا	رکن
• جناب فادر زیئورالفونزے	رکن
• ڈاکٹر گھیسی اینگوانگ سامتین	رکن
• جناب اختر الواسع	رکن
• جناب سہل اپچ مسلیار	رکن
• ڈاکٹر ظہیر آئی قاضی	رکن
• جناب خالد انور	رکن
• جوائنٹ سیکریٹری (انچارج اقلیتی سیل)	ممبر سکریٹری

21 مئی کو وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کے ساتھ قومی نگراں کمیٹی کے ارکان کی میٹنگ کا منظر

کراتے ہیں۔ چونکہ آئین (دفعہ 350) مادری زبان میں تعلیم کی گارنٹی دیتا ہے اس لیے کمیٹی یہ سفارش کرتی ہے کہ مدرسوں اور مکتبوں کو مالی امداد جاری رکھی جائے۔

☐ قائمہ کمیٹی کو معلوم ہوا ہے کہ کستوربا گاندھی بالیکا ودیالیہ (کے جی بی وی) ایسے اضلاع میں قائم کیے گئے ہیں جہاں مذہبی اقلیتوں کی آبادی 25 فیصد سے زیادہ ہے۔ اسکولوں میں اور زیادہ لڑکیوں کو داخلہ لینے کے لیے متوجہ کرنے کی غرض سے سفارش کی جاتی ہے کہ کے جی بی وی ایسے تمام اضلاع میں کھولے جائیں جہاں مذہبی اقلیتوں کی آبادی 10 فیصد سے زیادہ ہے۔ ایسے اضلاع میں بھی سفارش کی جاتی ہے کہ ماڈل اسکول کھولنے کے لیے فوقیت ایسے بلاکوں کو دی جائے جہاں مسلمانوں کا فیصد زیادہ ہے۔

کمیٹی کو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بڑی تعداد میں کے جی بی وی میں اقلیتی فرقے کے طلبا کا فیصد بہت معمولی ہے۔ سفارش کی جاتی ہے کہ وزارت ترقی انسانی وسائل ریاستی حکومتوں کو یہ مناسب صلاح جاری کرے کہ اقلیتی فرقوں کی لڑکیوں کو داخلے میں فوقیت دی جائے تاکہ کے جی بی وی کا مقصد مناسب طریقے سے پورا ہو۔ کمیٹی کو معلوم ہوا ہے کہ کام شروع کرنے والے 3501 کے جی بی وی میں سے صرف 454 کے جی بی وی میں ہی 20 فیصد سے زیادہ مسلم بچوں کو داخلہ دیا گیا ہے۔

☐ اردو میڈیم پرائمری اسکولوں کا کھولا جانا: کمیٹی کو ایسے علاقوں میں بھی اردو میڈیم پرائمری اسکولوں کے موجود نہ ہونے پر تشویش ہے جہاں پر بڑی تعداد میں طلبا کی مادری زبان اردو ہے۔ کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ تمام ریاستی حکومتوں کو یہ صلاح دی جائے کہ وہ کسی کلاس میں

مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل ایم ایم پلم راجو اور وزیر مملکت جناب ششی تھرور

نیشنل ڈاٹا بینک بھی معلومات جمع کرے۔ مثال کے طور پر اسکولوں اور کالجوں کی منظوری کے لیے درخواستیں جمع کرانے کی تفصیل، ایسی درخواستوں کی موجودہ کیفیت، اداروں کا جائزہ لینے کے لیے مختلف اداروں کے ذریعے ایکسپرٹ کمیٹیوں کی تشکیل، سفارش کے لیے جمع کرائی جانے والی درخواستوں کے بارے میں حکومت/ متعلقہ ادارے کا حتمی فیصلہ۔ قائمہ کمیٹی اپنی آئندہ رپورٹوں میں اس معاملے کو شامل کرے گی۔

☐ کمیٹی کو اس صورت حال پر بہت تشویش ہے کہ اترپردیش میں پرائمری سے اَپر پرائمری اسکولوں میں جانے والوں کی تعداد بہت کم ہوجاتی ہے۔ سال 12-2011 میں یہ تعداد محض 70.7 فیصد تھی۔ کچھ ریاستوں میں اوپر کے درجے میں جانے والوں کی تعداد میں ہونے والی کمی کی وجوہات کے بارے میں تفصیل بھی بآسانی دستیاب نہیں ہے، اس لیے کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ وزارت ترقی انسانی وسائل ضلعی سطح کے اعداد وشمار کا تجزیہ کرے اور اس کے بارے میں ریاستی حکومت سے بات چیت کرے تاکہ پرائمری سے اَپر پرائمری سطح تک جانے والوں کی تعداد میں کمی کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے ریاستی حکومت کوئی کارروائی کرسکے۔

بنیادی تعلیم

☐ کمیٹی کو بتایا گیا ہے کہ آر ٹی ای ایکٹ 2009 شروع کیے جانے سے قبل کچھ مدرسوں اور مکاتب کو ایس ایس اے کے تحت مالی امداد موصول ہورہی تھی، لیکن آر ٹی ای ایکٹ شروع ہونے کے بعد ایس ایس اے اسکیم کے تحت ملنے والی مالی امداد اس وجہ سے بند کردی گئی کہ مدرسوں کو مکتبوں کو آر ٹی ای 2009 کے تحت شامل کیا گیا ہے۔ آر ٹی ای ایکٹ میں 2012 کی اصلاح کے مطابق مدرسوں اور مکتبوں کو آر ٹی ای ایکٹ 2009 کی گنجائش سے باہر کردیا گیا۔ اس لیے سفارش کی جاتی ہے کہ وزارت ترقی انسانی وسائل تمام ریاستی حکومتوں سے کہے کہ وہ ایس ایس اے کے تحت مدرسوں اور مکتبوں کو امداد دینے سے انکار نہ کریں۔ کمیٹی کو معلوم ہوا ہے کہ ملک کے کئی علاقوں میں سرکار کا اسکولنگ نظام مقامی آبادی، خصوصی طور پر مذہبی اور لسانی اقلیتوں کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ ملک کے متعدد علاقوں میں اردو میڈیم میں پرائمری تعلیم فراہم کرانے والے اسکول موجود نہیں ہیں۔ ایسے معاملوں میں بہت سے والدین اپنے بچوں کو مدرسوں اور مکتبوں میں بھیجنے کو بہتر سمجھتے ہیں، کیونکہ وہ اردو میڈیم میں پرائمری تعلیم فراہم

مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کے ساتھ میٹنگ کے منظر

طلبا کی تعداد 15 سے زیادہ ہونے کی صورت میں پرائمری سطح پر مادری زبان میں تعلیم فراہم کرائے جانے کو یقینی بنائیں۔ کمیٹی یہ بھی سفارش کرتی ہے کہ وزارت ترقی انسانی وسائل ریاستی حکومتوں کو یہ صلاح بھی دے کہ وہ کافی تعداد میں ایسے ٹیچروں کی تقرری کو یقینی بنائیں جو پرائمری اسکولوں میں اردو میڈیم میں تعلیم دے سکیں۔

❑ ریاستی حکومتوں کو صلاح دی جائے کہ وہ ایسے ٹیچرز ٹریننگ اسکول کھولیں جہاں اردو میڈیم کے ٹیچروں کو تربیت دی جاسکے۔ کمیٹی یہ سفارش بھی کرتی ہے کہ وزارت ترقی انسانی وسائل تربیت یافتہ ٹیچروں کے بارے میں ایک نیشنل رجسٹر تیار کرے تاکہ کسی ریاست میں تربیت یافتہ ٹیچر دستیاب نہ ہونے کی صورت میں دوسری ریاست سے اس کمی کو پورا کیا جاسکے۔

سیکنڈری تعلیم

❑ قائمہ کمیٹی کو معلوم ہوا ہے کہ چند معاملات میں سی بی ایس ای یا اسٹیٹ گورنمنٹ بورڈ سے الحاق کے لیے اقلیتوں کی سوسائٹی/ٹرسٹ کے ذریعے اسکول کھولنے کے لیے ریاستی حکومت سے این او سی حاصل کرنے میں تاخیر ہورہی ہے۔ سفارش کی جاتی ہے کہ وزارت ترقی انسانی وسائل ریاستی حکومتوں کو ہدایت جاری کرے کہ وہ 90 دن کے اندر فیصلہ کریں بصورت دیگر متعلقہ بورڈ اسکول کھولنے کی اجازت دے سکتا ہے۔

❑ قائمہ کمیٹی کو معلوم ہوا ہے کہ وزارت ترقی انسانی وسائل کی نجی سرکاری شراکت داری (پی پی پی) طریقے سے 2500 ماڈل اسکول قائم کرنے کی ایک اسکیم ہے لیکن ابھی تک ایک بھی اسکول نہیں کھولا گیا ہے۔ قائمہ کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ ہر ایک ریاست میں منظور شدہ اسکولوں کی تعداد کے تناسب میں کم از کم 10 فیصد یعنی 250 اسکول مذہبی اقلیتوں کے لیے ریزرو کیے جائیں۔ مذکورہ اسکیم کے مطابق پی پی پی طریقے کے تحت ہر ایک ماڈل اسکول میں ہر ایک کلاس میں 140 منتخب طلبا کو اور ہر ایک کلاس کے طلبا کو شامل کرکے اسکول کے کل 980 منتخب طلبا کو سرکاری مدد مہیا کرائی جائے گی۔ منتخب طلبا میں ایس سی/ ایس ٹی/ او بی سی طلبا کے لیے ریزرویشن متعلقہ ریاست میں لاگو ریزرویشن کے مطابق ہوگا۔ اس کے علاوہ منتخب طلبا میں لڑکیوں کے لیے 33 فیصد ریزرویشن ہوگا۔ کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ اس 33 فیصد کے زمرے میں اقلیتوں کی لڑکیوں کو ضرور شامل کیا جائے۔

❑ کمیٹی کو بتایا گیا ہے کہ وزارت ترقی انسانی وسائل نے ملک کے متعدد اضلاع میں 500 سے زیادہ این وی ایس کھولے ہیں، لیکن ایسا لگتا ہے کہ تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیتوں کو ایسے اسکولوں کا فائدہ نہیں ملا ہے۔ چونکہ سیکنڈری اسکولوں میں اقلیت کے بچوں کے داخلے کے بارے میں اعداد وشمار دستیاب نہیں ہیں، اس لیے اقلیتی فرقوں سے متعلق بچوں پر این وی ایس کے اثر کا جائزہ لینا

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین اور ڈائرکٹر ظہیر آئی قاضی

اقلیتوں کی پیشہ ورانہ تعلیم اور ہنرمندی کے فروغ پر ذیلی کمیٹی

• فادر زیویئر الفونسے	چیئرمین
• جناب محبوب الحق	رکن
• جناب ٹی. پی. عبداللہ کویامدنی	رکن
• جناب بھجن سنگھ والیا	رکن
• جناب محمد انیس	رکن
• ڈپٹی سکریٹری (ایم سی)	ممبر سکریٹری

اقلیتوں کے لیے اسکیموں کے نفاذ پر ذیلی کمیٹی

• ڈاکٹر ظہیر آئی قاضی	چیئرمین
• مولانا محمد ولی رحمانی	رکن
• محترمہ تیستا سیتلواڑ	رکن
• جناب ایم فاروق شیخ	رکن
• جناب خالد انور	رکن
• پروفیسر محمد حلیم خاں	رکن
• ڈاکٹر بہاوالدین محمد ندوی	رکن
• ڈپٹی سکریٹری (ایم سی)	ممبر سکریٹری

مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کے ساتھ میٹنگ کے منظر

مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کے ساتھ میٹنگ کا منظر

ممکن نہیں ہے۔ کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ اقلیت کی گھنی آبادی والے اضلاع (ایم سی ڈی) میں سے ہر ایک میں این وی ایس کے طریقے پر دو اسکول کھولے جائیں۔ کمیٹی یہ بھی سفارش کرتی ہے کہ ایسے اسکولوں میں اقلیت کے بچوں کو متوجہ کرنے کے لیے مقامی غیر سرکاری تنظیموں (این جی او) کی مدد لی جائے تاکہ مقامی اقلیتی فرقے کو ان اسکولوں کا فائدہ پہنچ سکے۔ ایسے اسکول کھولے جانے کے بارے میں میڈیا کے ذریعے بھی مناسب طریقے سے تشہیر کی جانی چاہیے۔

❑ کمیٹی کو معلوم ہوا ہے کہ 11ویں منصوبے میں وزارت ترقی انسانی وسائل نے سیکنڈری اسکولوں میں لڑکیوں کے ہاسٹل کھولنے کے لیے ایک اسکیم چلاتی ہے۔ اس اسکیم کے تحت مختلف اضلاع میں کئی ہاسٹلوں کی اجازت دی گئی۔ کمیٹی کو معلوم ہوا ہے کہ سرکار نے 538 ہاسٹل قائم کیے ہیں جن میں سے کچھ کے جی بی وی کے ساتھ مل کر قائم کیے گئے۔ کے جی بی وی چونکہ صرف درجہ-8 تک ہی کے لیے ہوتے ہیں، اس لیے اقلیتوں کی طالبات کے لیے ہاسٹل سہولتوں کی کمی کی وجہ سے درجہ-8 کے بعد تعلیم جاری رکھنا مشکل ہے، اس لیے کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ 90 ایم سی ڈی میں سے ہر ایک میں لڑکیوں کے لیے 100 لڑکیوں کی گنجائش والے کم از کم دو ہاسٹل قائم کیے جائیں۔

اعلیٰ تعلیم

❑ این یو ای پی اے کے ذریعے این ایس ایس او کے اعلیٰ تعلیم کے اعداد و شمار کے ایک تجزیے میں دکھایا گیا ہے کہ 08-2007 میں غیر مسلموں کے 16.8 فیصد کے مقابلے میں مسلم اقلیت کا مجموعی حاضری تناسب (جی اے آر) صرف 8.7 فیصد تھا۔ کمیٹی ایک بار پھر دہراتی ہے کہ جب تک اعداد و شمار جمع کرنے کا کوئی کارگر سسٹم تیار نہیں ہوگا، اس وقت تک اقلیتوں کے صحیح حالات کا اندازہ لگانا بہت دشوار ہوگا۔ اعلیٰ تعلیم میں اقلیتوں کے بچوں کی شمولیت کو بہتر بنانے کے لیے سفارش کی جاتی ہے کہ مرکزی حکومت 90 ایم سی ڈی میں ماڈل ڈگری کالج قائم کرنے کے لیے ریاستی حکومتوں کو 100 فیصد گرانٹ فراہم کرے۔ ایسے ہر ایک ضلع میں ایک کالج قائم کیا جائے جو سائنس، ہیومینیٹیز، کامرس اور آرٹس کی تعلیم فراہم کرے۔

❑ کمیٹی کو معلوم ہوا ہے کہ یو جی سی اقلیتی فرقوں کے طلبا کے لیے کمی پوری کرنے والی کوچنگ کلاسیز چلانے کی ایک اسکیم چلا رہا ہے، لیکن اس اسکیم سے استفادہ کرنے والے طلبا کے اعداد و شمار مہیا نہیں کرائے گئے ہیں، جیسا کہ اوپر پیرا 14.1 میں مذکور ہے۔ اس سلسلے میں جامع اعداد و شمار جمع کیے جائیں اور سرکاری حلقے میں فراہم کرائے جائیں۔ کمیٹی کو بہار میں رحمانی فاؤنڈیشن کے ذریعے ہونہار طلبا کے انتخاب کے کامیاب تجربے کے بارے میں بھی پتہ چلا ہے۔ کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ انتخاب کا ایسا ہی طریقہ تمام ریاستوں میں اختیار کیا جائے اور ہونہار طلبا کو انجینئرنگ، میڈیسن وغیرہ کے پروفیشنل کورسیز کے مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے کوچنگ کے واسطے موقر کوچنگ اداروں میں بھیجا جائے۔

❑ سچر کمیٹی کی سفارش کے مطابق وزارت برائے فروغ انسانی وسائل اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں تنوع کی ضرورت پر توجہ دیتے ہوئے ایسے سبھی اداروں میں اقلیتی طلبا کو نمائندگی دینے کے لیے پالیسی تیار کرنی چاہیے۔ امریکہ میں بہت زیادہ شہرت یافتہ ادارے بھی طلبا کے داخلے کے وقت اقلیتوں کی محرومی کو ذہن میں رکھتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں کچھ اقلیتوں کی بہت کم نمائندگی کو دھیان میں رکھتے ہوئے ایک پالیسی تیار کیے جانے کی فوری ضرورت ہے۔

❑ **ٹیچر ایجوکیشن:** کمیٹی کو معلوم ہوا ہے کہ اقلیتوں کے تعلیمی معیار کی اصلاح کا ایک بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کے بچوں کو ٹیچر بننے کا موقع فراہم کیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سفارش کی جاتی ہے کہ وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے ذریعے 90 ایم سی ڈی میں سے ہر ایک میں ٹیچر ایجوکیشن کے ادارے کھولنے کے لیے ریاستی حکومتوں کو فنڈ مہیا کرایا جائے۔

❑ **تکنیکی تعلیم:** کمیٹی کو معلوم ہوا ہے کہ 12ویں کلاس تک کی تعلیم پوری کرنے کے بعد بڑی تعداد

اقلیتوں سے متعلق قومی نگراں کمیٹی کی میٹنگ کا منظر

میں طلبا کی دلچسپی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں نہیں ہوتی۔ اس کی جگہ پر وہ تکنیکی اداروں جیسے پالی ٹیکنک، پیرا میڈیکل کورسیز، ڈپلوما کورسیز وغیرہ میں داخلہ چاہتے ہیں۔ کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ ایسے اداروں میں طلبا کے تنوع کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے، جیسا کہ اوپر پیرا 14.16 میں سفارش کی گئی ہے۔ کمیٹی کو معلوم ہوا ہے کہ کچھ ریاستوں میں چند شہرت یافتہ این جی اوز کے ذریعے میڈیکل اور انجینئرنگ کورسیز کے لیے طلبا کو تیاری کرانے کے لیے کوچنگ کلاسیز چلائی جارہی ہیں۔ سفارش کی جاتی ہے کہ وزارت ترقی انسانی وسائل کے ذریعے متعلقہ بورڈ کی 10/12 ویں کلاس میں حاصل کیے گئے نمبروں کی بنیاد پر منتخب کیے گئے اقلیتی فرقوں کے طلبا کو ریزیڈنشیل کوچنگ مہیا کرانے کے لیے ایک اسکیم کا اعلان کیا جائے۔

مدرسے

❑ کمیٹی کو معلوم ہوا ہے کہ بڑی تعداد میں مسلم طلبا مدرسوں اور مکتبوں میں داخلہ لیتے ہیں۔ یہ طلبا خصوصی طور پر ایسے پسماندہ علاقوں سے آتے ہیں جہاں سرکار کے ذریعے فراہم کردہ تعلیمی سہولتیں اچھی نہیں ہیں یا سرکاری اسکولوں میں تعلیم کا معیار اچھا نہیں ہے۔ ایسے علاقوں میں غیر مسلم بچے بھی مدرسوں میں داخلہ لیتے ہیں، لیکن چند مدرسے ایسے ہیں جنھیں ٹیچروں کی تنخواہ کی ادائیگی کے لیے پہلے ہی سرکاری امداد مل رہی ہے۔ ایسے امداد یافتہ مدرسوں میں ریاستی حکومت بھی بچوں کو دوپہر کا کھانا فراہم کرارہی ہے۔ کمیٹی کو معلوم ہوا ہے کہ متعدد غیر امداد یافتہ مدرسوں میں بچوں کو دوپہر کا کھانا فراہم نہیں کرایا جارہا ہے۔ کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ ایم ڈی ایم اسکیم ایسے غیر امداد یافتہ مدرسوں کے بچوں کے لیے بھی شروع کی جائے جو ایم ڈی ایم اسکیم کے لیے سرکاری امداد چاہتے ہوں۔

❑ کمیٹی کو معلوم ہوا ہے کہ وزارت ترقی انسانی وسائل مدرسوں میں معیاری تعلیم کو فروغ دینے کے لیے ایک اسکیم (ایس پی کیو ای ایم) چلارہی ہے۔ اس اسکیم کے تحت مرکزی حکومت نے 11 ویں منصوبے میں مدرسوں کو فنڈ کے طور پر 350 کروڑ روپے فراہم کرائے ہیں۔ کمیٹی کو معلوم ہوا ہے کہ کئی ریاستوں میں وزارت ترقی انسانی وسائل کے ذریعے جاری کیا گیا فنڈ ریاستی حکومتوں نے مدرسوں کو جاری نہیں کیا ہے، اس لیے کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ فنڈ کی تقسیم میں ہونے والی تاخیر کے معاملوں کو نمٹایا جائے۔ اس کے علاوہ ایس پی کیو ای ایم کے تحت گریجویٹ ٹیچروں کی تنخواہ 6000 روپے سے بڑھا کر 8000 روپے کی جائے اور پی جی ٹیچروں کی تنخواہ 12000 روپے سے بڑھا کر 15000 روپے کی جائے۔ اسی کے مطابق وزارت ترقی انسانی وسائل ایس پی کیو ای ایم کے تحت دیگر اخراجات میں بھی اضافہ کرے۔

❑ مدرسے کے طلبا کو جدید تعلیم حاصل کرنے کا موقع فراہم کرانے کے لیے سفارش کی جاتی ہے کہ وزارت

جناب سراج حسین، رپورٹ کے اردو متن کا اجرا کرتے ہوئے

اقلیتوں کی تعلیمی ضروریات، علاقائی اور اضلاع کے حساب سے، خاکہ تیار کرنے والی ذیلی کمیٹی

• جناب پی.اے. انعام دار	چیئرمین
• رومی جعفری	رکن
• جناب شفیع دہلوی	رکن
• جناب پشپندر سنگھ	رکن
• جناب حنیف لکڑاوالا	رکن
• ڈپٹی سکریٹری (ایم سی)	ممبر سکریٹری
• ستیش ترپاٹھی	کوآپٹڈ رکن

لڑکیوں کے تعلیم کے لیے ذیلی کمیٹی

• پروفیسر ذکیہ صدیقی	چیئرمین
• مفتی عطاالرحمٰن قاسمی	رکن
• ڈاکٹر ظہیر آئی قاضی	رکن
• جناب سہل ایچ مسلیار	رکن
• محترمہ صہبا حسین	رکن
• ڈپٹی سکریٹری (ایم سی)	ممبر سکریٹری

اقلیتوں سے متعلق قومی نگراں کمیٹی کی میٹنگ کا منظر

اقلیتوں سے متعلق قومی نگراں کمیٹی کی میٹنگ کا منظر

ترقی انسانی وسائل ایسے مدرسہ طلبا کے لیے ایک محرک اسکیم شروع کرے جو این آئی او ایس کے ذریعے چلائے جانے والے امتحانات میں بیٹھنا پسند کرتے ہوں۔ ایسے طلبا کے لیے داخلے اور امتحان کی فیس معاف کردی جائے اور این آئی او ایس کا امتحان پاس کرلینے پر طلبا کو 1000 روپے نقد دیے جائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ طلبا این آئی او ایس کے امتحانات میں بیٹھنے کی طرف متوجہ ہوں۔ اس سے مدرسہ طلبا کو اسکولنگ کے رسمی نظام میں شامل ہونے میں آسانی ہوگی۔ کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ مدرسہ طلبا کے لیے این آئی او ایس کے ذریعے وصول کی جانے والی فیس معاف کی جائے۔

اسکالرشپ اسکیمیں

❑ کمیٹی کو اس بات پر تشویش ہے کہ کچھ ریاستوں میں اقلیتوں، خاص طور پر مسلمانوں، کے بچے اسکولوں میں بہت کم داخلہ لیتے ہیں۔ کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ ان کے لیے اسکالرشپ کی اہلیت ویسی ہی ہونی چاہیے جیسی کہ ایس سی/ ایس ٹی بچوں کے لیے ہے۔ کمیٹی کو معلوم ہوا ہے کہ اقلیتی امور کی وزارت اور سماجی انصاف اور تفویض اختیارات کی وزارت اقلیتی فرقے اور ایس سی/ ایس ٹی کے طلبا کے لیے میٹرک کے بعد اسکالرشپ کی اسکیمیں چلا رہی ہیں۔ کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ اقلیتی فرقوں کے طلبا کے لیے اسکالرشپ کی شرح ایس سی طلبا کو ملنے والی اسکالرشپ کی شرح کے برابر کی جائے۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ مرکزی حکومت ریاستی حکومتوں کو کافی فنڈ فراہم کرائے تاکہ معاشی مشکلات کی وجہ سے اقلیتی فرقے کا کوئی بچہ تعلیم سے محروم نہ رہے۔

❑ کمیٹی کو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ایس سی طالب علم کے معاملے میں ایسی صورت میں بھی پوری فیس اس کو واپس مل جاتی ہے جبکہ وہ پرائیویٹ ادارے میں زیر تعلیم ہو۔ ایس سی طلبا کے معاملے میں داخلے کے وقت انھیں ادارے میں کوئی فیس نہیں جمع کرانی پڑتی اور ادارے کو ایسی فیس کی ادائیگی ریاستی حکومت کے ذریعے کی جاتی ہے، لیکن اقلیتی طلبا کے معاملے میں داخلے کے وقت طالب علم کو ادارے میں پوری فیس جمع کرانی پڑتی ہے۔ معاشی مشکلات کی وجہ سے اقلیتی طلبا کی بڑی تعداد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں ناکام رہتی ہے کیونکہ پرائیویٹ اداروں کے ذریعے وصول کی جانے والی فیس کی بڑی رقموں کا انتظام کرنا ان کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے، اس لیے کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ اقلیتی طلبا کے معاملے میں بھی وزارت ترقی انسانی وسائل/ اقلیتی امور کی وزارت ایسی اسکیم لائیں جو ایس سی طلبا کے لیے اسکیم کے پوری طرح مساوی ہو تاکہ اہلیت رکھنے والے طلبا اونچی فیس کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع سے محروم نہ رہیں۔ کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ اقلیتی فرقوں سے تعلق رکھنے والے طلبا کو ریاست کے ذریعے چلائے جانے والے/ پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں داخلہ دیا جائے اور اس کے لیے طلبا کو داخلے کے وقت فیس نہ جمع کرانی پڑے، جیسا کہ ایس سی طلبا کے معاملے میں ہوتا ہے۔ کالج ایسی فیس کی وصولی کے لیے ریاستی حکومت کے سامنے دعویٰ پیش کرسکتا ہے اور ریاستی حکومت اس کے لیے اقلیتی امور کی وزارت کے سامنے دعویٰ پیش کرسکتی ہے جس کے بجٹ میں ایسی فیس کی ادائیگی کی ذمے داری لینے کے لیے کافی گنجائش ہونی چاہیے۔

اقلیتی اداروں کے لیے بنیادی ڈھانچے کی ترقی (آئی ڈی ایم آئی)

❑ کمیٹی کو معلوم ہوا ہے کہ وزارت ترقی انسانی وسائل 11ویں منصوبے کے وقت سے ہی آئی ڈی ایم آئی چلا رہی ہے۔ 11ویں منصوبے میں اس کے لیے 125 کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی تھی۔ کمیٹی کو معلوم ہوا ہے کہ بنیادی ڈھانچے کو مضبوط بنانے کے لیے این جی او کو 50 لاکھ روپے تک فنڈ مہیا کرایا جاتا ہے۔ کمیٹی کو معلوم ہوا ہے کہ وزارت ترقی انسانی وسائل کے ذریعے ریاستی حکومتوں کو فنڈ جاری کیے جانے پر بھی کچھ معاملوں میں تعلیمی اداروں کو فنڈ جاری کیے جانے میں تاخیر کی جاتی ہے۔ اس لیے کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ اس اسکیم کو بھی ڈائریکٹ بینیفٹ ٹرانسفر (ڈی بی ٹی) کے تحت شامل

اقلیتوں سے متعلق قومی نگراں کمیٹی کی میٹنگ کا منظر

مرکزی وزیر جناب کپل سبل کے ساتھ 31 مئی 2012 کو ہوئی میٹنگ کا منظر

کیا جائے تاکہ فنڈ وزارت ترقی انسانی وسائل سے سیدھے ادارے کے پاس پہنچ سکے۔ کمیٹی یہ بھی سفارش کرتی ہے کہ وزارت ترقی انسانی وسائل اقلیتوں کے ذریعے قائم کیے گئے اعلیٰ تعلیمی اداروں کو بھی ہاسٹل سہولت قائم کرنے کے لیے فنڈ مہیا کرائے۔ اس سے اعلیٰ تعلیم میں تعلیمی اعتبار سے پسماندہ اقلیتوں کی حصے داری بڑھے گی۔

اردو میڈیم اسکول/ اساتذہ/ کتابیں

□ اردو میڈیم اسکولوں میں ٹیچروں کی موجودگی کے متعلق کمیٹی نے دلّی سرکار کے حکام کے ساتھ تفصیلی بات چیت کی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ دہلی میں کئی اردو میڈیم اسکولوں میں ایسے ٹیچر نہیں ہیں جو اردو میں پڑھانے کی قابلیت رکھتے ہوں۔ معلوم ہوا ہے کہ مختلف مضامین میں اردو جاننے والے ٹیچروں کی تقرری کے لیے دلّی سرکار کی کوئی پالیسی نہیں ہے، اس لیے کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ دلّی سرکار کو یہ صلاح دی جائے کہ وہ ہر ایک مضمون میں ٹیچروں کی تقرری کے لیے یہ ضروری قرار دے کہ امیدوار نے 12 ویں کلاس تک اردو پڑھی ہو۔ اس سے مختلف مضامین (مثال کے طور پر اکنامکس، تاریخ، فزکس، کیمسٹری وغیرہ) میں ایسے اردو جاننے والے ٹیچروں کی تقرری ہوسکے گی جو دہلی کے اسکولوں میں اردو میڈیم میں بچوں کو پڑھائیں گے، اس لیے ٹی جی ٹی اور پی جی ٹی سطح کے اردو جاننے والے ٹیچروں کے لیے کچھ سیٹیں ریزرو ہونی چاہئیں۔

□ کمیٹی کو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ کچھ ریاستوں میں اردو میں کتابوں کی دستیابی کو یقینی نہیں بنایا گیا ہے جس کے نتیجے میں بچوں کی تعلیم کا نقصان ہوتا ہے۔ کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ اردو کتابوں کی طباعت اور تقسیم کا کام این سی پی یو ایل کو سونپا جائے۔

□ کمیٹی کو معلوم ہوا ہے کہ این سی پی یو ایل کو دی جانے والی گرانٹ 20 کروڑ روپے سے بڑھا کر سال 2011-12 میں 40 کروڑ روپے کردی گئی ہے۔ کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ کم از کم 40 کروڑ روپے کی گرانٹ برقرار رکھی جائے۔

بہار کے طریقے پر ہنر

□ بہار میں 'ہنر' نامی ایک اسکیم شروع کی گئی تھی جس میں 13000 مسلم لڑکیوں نے تربیت حاصل کی تھی۔ بہار میں یہ اسکیم این آئی او ایس کے ذریعے مختلف این جی اوز کی مدد سے نافذ کی گئی تھی، لیکن ایک سال کی کامیابی کے بعد بہار میں یہ اسکیم جاری نہیں ہے۔ کمیٹی پرزور طریقے سے سفارش کرتی ہے کہ یہ اسکیم این آئی او ایس کے ذریعے این جی اوز کی مدد سے پورے ملک میں نافذ کی جائے اور فنڈنگ این آئی او ایس کے ذریعے کرائی جائے۔

اردو زبان کے فروغ اور انگریزی تعلیم کی مدد سے اقلیتوں کی مسابقتی اہلیت میں اضافہ کرنے کی ذیلی کمیٹی

• جناب اختر الواسع	چیئرمین
• جناب سید حسن شجاع	رکن
• ڈاکٹر ماجد دیوبندی	رکن
• پدم شری پروفیسر ایس آر قدوائی	رکن
• محترمہ سیدہ امام	رکن
• ڈپٹی سکریٹری (ایم سی)	ممبر سکریٹری

سرکاری اسکیموں کے بارے میں بیداری

□ کمیٹی کو یہ معلوم ہوا ہے کہ سرکار کی اسکیموں کے بارے میں بیداری بہت کم ہے اور اقلیت کی گھنی آبادی والے علاقوں میں کام کرنے والے این جی اوز سرکاری اسکیموں کے بارے میں پوری واقفیت نہیں رکھتے۔ کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ اقلیتی فرقوں تک سرکاری اسکیموں کے بارے میں معلومات پہنچانے کے لیے بڑے پیمانے پر اردو ٹی وی چینلوں اور اردو اخبارات کو اشتہارات جاری کیے جائیں اور ویب سائٹس اور سوشل میڈیا کے استعمال سمیت مناسب اقدامات کیے جائیں۔ ■

مرکزی وزیر جناب کپل سبل کے ساتھ 31 مئی 2012 کو ہوئی میٹنگ کا منظر

جاوید جمال الدین

ہندوستان کی ترقی کے 66 سال

''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا''

خلاؤں سے ایک ہندوستانی کی آواز میں نشر ہونے والا علامہ اقبال کا یہ مصرع آج بھی ہر یوم آزادی پر میرے کانوں میں اسی کھڑکھڑاتی سی آواز میں گونجنے لگتا ہے جو میں نے 29 سال پہلے سنا تھا۔ انڈین اسپیس ریسرچ آرگنائزیشن (اسرو) اور سوویت انٹر کوسموا سپیس پروگرام کے تحت ہندوستانی فضائیہ کے اسکوڈرن لیڈر اور پائلٹ راکیش شرما نے اپریل 1984 میں سلیوٹ 7 اسپیس اسٹیشن میں دو روسی خلا بازوں کے ہمراہ آٹھ دن گزارے تھے اور اس سفر کے دوران اس پہلے ہندوستانی خلا باز نے شمالی ہندوستان کی تصویر کشی کی تھی تاکہ ہمالیہ اور اس کے دامن میں ہائڈرو الیکٹرک پاور اسٹیشن کی تعمیر کا جائزہ لیا جاسکے۔ خلا سے راکیش شرما اور زمین سے وزیراعظم اندرا گاندھی کے درمیان ہونے والی گفتگو ہم نے ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر دیکھی اور سنی تھی۔ وہ سب سے یادگار لمحہ تھا جب محترمہ اندرا گاندھی نے راکیش شرما سے پوچھا تھا کہ ''اوپر سے بھارت کیسا دکھائی دیتا ہے آپ کو؟'' اور راکیش شرما نے جواب میں کہا کہ ''میں بلا جھجھک کہہ سکتا ہوں، سارے جہاں سے اچھا!''

بات اپریل 1984 کی ہے لیکن ہر یوم آزادی پر یاد آجاتی ہے۔ وہ آزادی جسے 66 برس بیت چکے ہیں۔ جس میں ہم نے نشیب بھی دیکھے ہیں فراز پر بھی پہنچے ہیں، مگر یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہی ہے کہ دنیا میں ہمارے ہندوستان سے اچھا کوئی اور ملک نہیں ہے۔

ہر شعبے میں کامیابی

ہم پر تنقید کرنے والے بھی یہ اعتراف کرتے ہیں کہ لاکھ خامیوں کے باجود ہم نے عالمی سطح پر اپنا ایک مقام بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ سائنس، صنعت، خلائی، تعلیمی، مواصلاتی میدانوں میں قابل تعریف ترقی کی ہے۔ ان شعبوں کے ساتھ ساتھ نظام عدلیہ کو مزید بہتر بنانے اور سماجی تحفظ وانصاف کے لیے ہر ممکن اقدامات کیے گئے ہیں جن کا اثر عام طور پر نظر آتا ہے۔ بدعنوانی کے متعدد معاملات سامنے ضرور آئے ہیں، لیکن ان پر قابو پانے کے لیے حکومت اور غیر سرکاری تنظیموں اور عوامی اداروں نے پہل کی ہے جس کے بہتر نتائج سامنے آئیں گے۔ ہر بچّے کو تعلیم کا حق، ہر ہندوستانی کو سرکاری کام کاج کے بارے میں جاننے کا حق، ہر شہری کو کام کا حق اور اب ہر شہری کو خوراک کا حق دینا، یہ ایسے سنگ میل ہیں ہماری تاریخ کے جن کی نظیر نہیں ملتی۔

ہندوستان کی آزادی کے 66 برس مکمل ہونے کے موقع پر ملک کی ترقی کے بارے میں بات کرنے سے پہلے اس عظیم ملک کے مختلف پہلوؤں کو نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ جمہوریہ ہند رقبہ کے حساب سے جنوبی ایشیا کا سب سے بڑا اور دنیا کا ساتواں بڑا ملک ہے۔ آبادی کے لحاظ سے ہم دوسرے نمبر پر ہیں اور ہماری تعداد ایک ارب 20 کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے۔

گنگا جمنی تہذیب کا امین

ہندوستان کو سندھو وادی کی تہذیب وتمدن کی وجہ سے برصغیر میں تاریخی اور ثقافتی اہمیت حاصل ہے۔ یہاں کی گنگا جمنی تہذیب نے اس کی جڑوں کو مضبوط رکھا ہے، یہاں چار اہم مذاہب کی بنیاد ڈالی گئی، ان میں ہندوازم، بدھ ازم، جین ازم اور سکھ ازم قابل ذکر ہیں۔ اسلام، عیسائیت اور زرتشتی مذہب اپنے شروعاتی دور میں ہی ہندوستان کا رُخ کر چکے تھے اور ان مذاہب کے یہاں آنے کے سبب خطے کی تہذیب اور تمدن کو ایک نئی شکل ملی ہے۔ مسلم حکمرانوں نے کئی صدیوں تک یہاں حکومت کی جس کے آثار اور اثرات آج بھی زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتے ہیں۔

19 ویں صدی میں ہندوستان میں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تھی جس کا کنٹرول براہ راست برطانیہ سے کیا جاتا رہا اور 1857 میں پہلی جنگ آزادی کے بعد ملکہ برطانیہ نے ہندوستان کا کنٹرول اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ 20 ویں صدی کے وسط میں ایک طویل جدوجہد کے بعد 15 اگست 1947 کو ملک کو آزادی نصیب ہوئی، لیکن اس کے ساتھ دو قومی نظریہ کی بنیاد پر ملک کی تقسیم ہوگئی۔

ہندوستان میں ایک وفاقی جمہوریت کے تحت ایک پارلیمانی نظام حکومت قائم ہے، جو کہ 28 ریاستوں اور 7 مرکزی صوبوں پر مشتمل ہے۔ اس طرح ہمارا ملک مختلف مذاہب، زبانوں اور مشترکہ معاشرے کا ملک ہے۔

15اگست 1947 کو ملنے والی آزادی کے بعد ہندوستان کو کئی چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ دیہی اور شہری غربت کے ساتھ ساتھ مذہبی اور ذات پات کے تشدد کا سامنا تو تھا ہی کمیونسٹوں کیشورشوں اور جموں وکشمیر اور شمال مشرقی ریاستوں میں علیحدگی پسندوں نے بھی سر اٹھایا، لیکن ہندوستانی لیڈرشپ نے جو منصوبہ بندی کی، اس نے ترقی کی راہیں کھول دیں۔ پہلے وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے واضح طور پر اعلان کردیا کہ ''بڑے بڑے باندھ بجلی گھر اور کارخانے ہی ہمارے نئے شوالے ہوں گے۔'' لال بہادر شاستری کا ''جے جوان اور جے کسان'' کا نعرہ بھی ہندوستان کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوا۔ پڑوسیوں کو یہ سب راس نہیں آرہا تھا۔ سرحدی تنازع کو لے کر 1962 میں چین سے اور پھر 1965 میں پاکستان سے جنگیں ہوگئیں۔ اس سے قبل بھی پاکستان نے 1948 میں دراندازی کی اور پھر 1971 میں ہمیں جنگ کا سامنا کرنا پڑا۔

اس سب کے باوجود ملک میں ترقی کے دروازے کھل چکے تھے۔ 1980 کی دہائی میں ترقی نے رفتار پکڑلی۔ 1982 میں راجدھانی نئی دہلی میں ایشیائی کھیلوں کا انعقاد کیا گیا اور رنگین ٹی وی شروع ہوا۔ کئی الیکٹرونک اشیا اور روزمرہ کی چیزوں کی درآمد پر سے ڈیوٹی ہٹائی گئی اور دیگر کی ڈیوٹی کم بھی کی گئی ہے۔ آنجہانی اندرا گاندھی کے بعد ان کے صاحبزادے راجیو گاندھی کے ملک کو 21ویں صدی میں لے جانے کے نعرے، بلکہ عملی اقدامات نے صورت حال کو یکسر بدل دیا۔

ریلوے میں اصلاحات

1986 میں ریلوے میں کمپیوٹر نظام نصب ہونے اور ٹکٹ ریزرویشن کمپیوٹر کے ذریعے بک ہونے سے عوام کو احساس ہوگیا کہ ہم واقعی اکیسویں صدی کی طرف گامزن ہیں۔ دہلی کے بعد ممبئی سمیت دیگر میٹرو اور پھر ہر بڑے اور چھوٹے شہر میں ریزرویشن سسٹم شروع ہونے سے عوام مزید ریلوے کے قریب آگئے ہیں۔ آج یہ حال ہے کہ گھر اور دفتر سے انٹرنیٹ پر اور کال سینٹرس کے ذریعے ہی بلکہ ایس ایم ایس کے ذریعے بھی ٹرین کا ٹکٹ ریزرو کرایا جاسکتا ہے۔

پنج سالہ ترقیاتی منصوبوں کی بنیاد ملک میں پہلے ہی جواہر لال نہرو کے دور میں رکھ دی گئی تھی، لیکن معاشی و اقتصادی اصلاحات کا آغاز 1991 میں ہوا اور آنجہانی وزیراعظم پی وی نرسمہاراؤ کی قیادت میں موجودہ وزیراعظم ڈاکٹر من موہن سنگھ نے بحیثیت وزیر مالیات ان اصلاحات کی بنیاد رکھی، اس کے بعد ہندوستان دنیا کا تیزی سے ترقی کرنے والا ملک بن گیا۔ عالمی سطح پر اسے معاشی طور پر دسواں مقام حاصل ہوگیا ہے۔ نئے صنعتی ملک کا درجہ بھی اسے حاصل ہے۔ البتہ کچھ شعبوں میں غربت، بدعنوانی، بھکمری، ناقص صحت عامہ اور دہشت گردی کا سامنا کرنا پڑرہا ہے۔ ایک نیوکلیئر ملک اور علاقائی طاقت والے ملک کی فوج کو عالمی سطح پر تیسرا مقام حاصل ہے۔

نیوکلیئر طاقت کا پُرامن استعمال

راجستھان کے پوکھرن میں 1974 میں نیوکلیئر ٹیسٹ کے بعد 1998 میں ایک بار پھر نیوکلیئر تجربہ کیا گیا جس کے نتیجے میں ہندوستان ایٹمی طاقت رکھنے

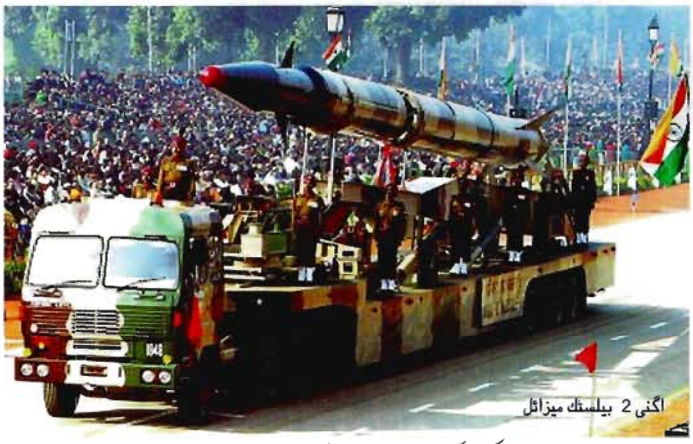
اگنی 2 بیلسٹک میزائل

والے ملکوں کی فہرست میں شامل ہو چکا ہے اور ہمارے رہنماؤں نے واضح کردیا ہے کہ اس طاقت کا استعمال صرف پُرامن مقاصد کے لیے کیا جائے۔ 1991 میں جو اصلاحات کی گئیں، ان کی بدولت یہیں سے ہندوستان کی اقتصادی ترقی پروان چڑھی اور ملک نے عالمی سطح پر اپنا ایک الگ مقام بنالیا ہے۔

مواصلاتی انقلاب

گزشتہ 15 برس میں مواصلات میں جو ترقی ہندوستان میں ہوئی ہے اور جنوبی ایشا بلکہ افریقی ممالک میں بھی نہیں ہوسکی ہے۔ بیس سال قبل ایک ٹیلی فون کنکشن لینے کے لیے برسوں لگ جاتے تھے، لیکن موبائیل ٹیلی فون کے نظام نے مواصلات میں ایک انقلاب برپا کردیا ہے، سٹیلائٹ اور فائبر سسٹم کے سبب آج ہندوستان میں موبائیل ٹیلی فون کی تعداد کروڑوں میں پہنچ چکی ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے سبب غیرملکی سرمایہ کاری میں اضافہ ہوا اور بڑی تعداد میں ملٹی نیشنل کمپنیوں اور بینکوں نے دفاتر کھولے، جس سے روزگار کے مواقع پیدا ہوئے اور نوجوانوں کی دلچسپیاں بھی تعلیمی سطح پر بڑھ گئیں۔

آج عالمی سطح پر مندی کے باوجود جب امریکہ جیسا سپرپاور ملک مندی کا شکار بن گیا، تب ہندوستان نے ایک حد تک خود کو بچانے میں کامیابی حاصل کی، البتہ مہنگائی پر قابو پانے میں ناکامی ہاتھ لگی ہے۔ لیکن حکومت کی آبادی کے ایک بڑے حصے کو کھانا مہیا کرانے کے لیے فوڈ سیکورٹی بل اور سبسڈی کو کیش ریٹرن اسکیم کے طور پر نافذ کرنے سے غریب عوام کو زبردست فائدہ پہنچنے کی امید ہے۔ آدھار کارڈ سے بھی مستقبل میں اچھے نتائج کی امید کی جارہی ہے۔

تعلیمی معیار بلند ہوا

جہاں تک تعلیمی ترقی کی بات ہے، ہندوستان میں معیار تعلیم بلند ہوا ہے، تعلیم کو گزشتہ 20-15 برسوں میں جو فروغ حاصل ہوا اور اس میں شمولیت اور پسماندہ طبقات اور اقلیتوں کو دیے جانے والے ریزرویشن سے نوجوانوں نے اعلیٰ تعلیم پر زیادہ توجہ دی ہے۔ خواندگی کی شرح بلند ہوئی ہے اور اب ہم تیزی سے سو فی صد خواندگی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ بہار اور اترپردیش اور اڑیسہ جیسی تعلیمی طور پر پسماندہ ریاستوں میں بھی نوجوانوں نے سرکاری سطح پر حاصل ہونے والی مراعات کا بھرپور فائدہ اٹھانا شروع کیا ہے۔

پسماندہ اور اقلیتوں کے حقوق

اسی طرح اقتدار میں حصہ داری کے نعرے نے بھی کام کیا ہے۔ منڈل کمیشن کی سفارشات کے نفاذ کے بعد صورت حال کافی حد تک بدل چکی ہے اور روزگار، تجارت اور اقتدار میں سبھی کی حصہ داری نظر آنے لگی ہے۔ اقلیتوں اور خصوصی طور پر مسلمانوں کی حالت پر جسٹس سچر کمیٹی کی رپورٹ اور سفارشات سے یہ احساس ہوا کہ سب سے بڑی اقلیت کئی محاذ پر دلتوں سے بھی پچھڑی ہوئی ہے۔ مرکزی حکومت کے ساتھ ساتھ کئی ریاستوں میں سچر کمیٹی کی سفارشات کی بنیاد پر انھیں روزگار، تعلیم اور دیگر شعبوں میں مواقع مہیا کرائے ہیں مگر ابھی بھی اس سمت میں بہت کچھ کرنا باقی ہے اور یہ حکومت کے لیے ایک بڑا چیلنج ہی ہے۔

عام انتخابات، خاموش انقلاب

جمہوری طور پر ہندوستان ایک مضبوط اور مستحکم ملک ہے، 1947 میں آزادی کے بعد 1951، 1957 اور 1962 کے عام انتخابات میں آل انڈیا کانگریس پارٹی

نے بڑی آسانی سے کامیابی حاصل کی، لیکن 1967 میں دیگر سیاسی اور علاقائی پارٹیوں نے بھی سر اٹھایا اور 1971 میں اندرا گاندھی کی قیادت میں کانگریس پارٹی برسر اقتدار آئی تھی اس کا ایک سبب بنگلہ دیش کے لیے پاکستان کے ساتھ ہونے والی جنگ میں کامیابی تھی۔ 1975 میں ایمرجنسی کی وجہ سے منفی اثرات ضرور نمایاں ہوئے اور 1977 میں حکمراں پارٹی کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک نئی اتحادی پارٹی جنتا پارٹی نے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی، لیکن آپس کی پھوٹ کے بعد جنتا پارٹی اقتدار سے بے دخل ہوگئی اور محترمہ اندرا گاندھی کی قیادت میں کانگریس پارٹی نے دوبارہ کامیابی حاصل کی اور ایک نئی حکومت تشکیل دی۔ یہیں سے انھوں نے ملک کو ترقی کی راہ لے جانے کا عزم کیا حالانکہ تب تک خصوصی طور پر بیوروکریسی میں بدعنوانی کی لعنت گھر کر چکی تھی۔ 1984 میں اندرا گاندھی کے قتل کے بعد ان کے بیٹے راجیو گاندھی ان کے جانشین بنائے گئے اور انھوں نے ملک کو اکیسویں صدی میں لے جانے کا خواب دکھایا، لیکن بوفورس توپ گھوٹالے کے الزامات کے ساتھ بدعنوانی کے خلاف تحریک کے بعد 1989 میں کانگریس کو الیکشن میں شکست ہوئی اور نئی سیاسی پارٹی جنتا دل نے بائیں محاذ کی حمایت سے حکومت تشکیل دی، لیکن جنتا پارٹی کی طرح جنتا دل حکومت بھی دو سال کے مختصر عرصے میں گر گئی اور پھر ایک بار کانگریس نے 1991 میں اقتدار سنبھال لیا۔ لیکن پی وی نرسمہا راؤ کی اقلیتی حکومت نے 1996 تک اپنی مدت پوری کی اور اسی دور میں ملک کی ترقی کے لیے اصل دروازے معاشی اصلاحات کے ساتھ کھول دیے گئے۔

1996 کے عام انتخابات میں این ڈی اے برسر اقتدار آئی اور اٹل بہاری واجپئی نے حکومت تشکیل کی، لیکن محض 13 دنوں میں یہ حکومت گر گئی اور یونائیٹڈ فرنٹ نے دو سال ایچ ڈی دیوے گوڑا اور آئی کے گجرال کی قیادت میں ایک ایک سال حکومت چلائی۔ کانگریس کی حمایت واپس لینے کے بعد 1998 میں این ڈی اے نے واجپئی کی قیادت میں حکومت کی تشکیل کی جو کہ پہلی غیر کانگریسی حکومت تھی جس نے اتحادی حکومت کے طور پر پانچ سال مکمل کیے۔ واجپئی کے دور میں ملک کی شاہراہوں کو بہتر بنانے کے منصوبے پر عمل کیا گیا اور کئی سطح پر یہ منصوبہ کامیاب بھی رہا۔

2004 میں ایک بار پھر ہندوستانی جمہوریت کی فتح ہوئی۔ جنرل الیکشن میں کانگریس سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری اور قومی ترقی یافتہ محاذ یو پی اے تشکیل دی گئی اور اسے بائیں محاذ کی حمایت حاصل رہی۔ یو پی اے نے دوبارہ 2009 میں کامیابی حاصل کی اور کانگریس پارٹی کی نشستوں میں بھی اضافہ ہوا اور اب 67 ویں یوم آزادی کے موقع پر یو پی اے کا اقتدار ہے اور کئی محاذ پر حکومت نے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا، کئی اہم پالیسیوں کو نافذ کیا گیا ہے جن میں فوڈ سیکورٹی قانون اور آدھار کارڈ کے تحت کیش ریٹرن پالیسی شامل ہیں۔ اسی دور میں ہر بچے کو تعلیم کا حق، ہر ہندوستانی کو سرکاری کام کاج کے بارے میں جاننے کا حق، ہر شہری کو کام کا حق اور ہر شہری کو خوراک کا حق دینے سے متعلق قانون سازی ہوئی ہے۔ یہ ہندوستانی تاریخ کے وہ عظیم اقدامات ہیں جو بڑی تیزی سے ملک کی تصویر کو بدل رہے ہیں۔

ڈبل ڈیکر ٹرین

عدلیہ کی کارکردگی

ہندوستان میں تین درجاتی عدلیہ کا نظام ہے، چیف جسٹس کی سربراہی میں ایک سپریم کورٹ اور 28 ہائی کورٹ اور متعدد ٹرائل کورٹ بھی ہیں۔ اس طرح ہمارے یہاں بہت بڑا عدالتی نظام کام کر رہا ہے جس سے عوام کو تسلی بخش انصاف بھی ملتا ہے، لیکن برسوں سے لاکھوں مقدمات زیر سماعت ہیں اور ان کا کوئی فیصلہ سامنے نہیں آیا ہے جسے ایک طرح کی ناانصافی کہا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت عدلیہ کو مزید توسیع دینے کے لیے کام کر رہی ہے۔ زیر التوا مقدموں کی تعداد بڑھ جانے کے باجود عدالتوں نے مفاد عامہ کے کئی مقدمات میں عوام کے حق میں کئی فیصلے سنائے ہیں اور کئی فیصلے ایسے ہیں جن کی وجہ سے مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں کے درمیان ٹکراؤ کا ماحول بن گیا۔ بعض اوقات عدلیہ کے فیصلوں نے حکومت کو دفاعی پوزیشن پر لاکر کھڑا کر دیا ہے اور سیاست دانوں کو بیان دینا پڑا کہ عدلیہ کو اپنی حد میں رہنا چاہیے۔ یہ حقیقت ہے کہ کئی مقدموں میں عوام کے مفاد میں فیصلے آئے لیکن بہت سے ایسے بھی فیصلے دیے گئے جو متنازع رہے۔ 1984 میں سکھ مخالف فسادات کے مقدمات، بابری مسجد کی مسماری کے معاملات، گجرات فسادات کے مقدمات، سمیت کئی اہم ترین معاملات پر فیصلے نہیں آئے ہیں اور ان کی سماعت سست روی سے چل رہی ہے جس کا اثر معاشرے پر پڑتا ہے اور مختلف فرقوں کے درمیان کشیدگی میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ جہاں گزشتہ پانچ چھ سال کا جائزہ لیا جائے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ 1990 کی دہائی میں اور اس کے بعد گجرات اور ملک کے دیگر علاقوں میں فرقہ وارانہ فسادات سے جو حالات پیدا ہوئے تھے ان میں زبردست بہتری آئی ہے اور لا اینڈ آرڈر کا کوئی بہت بڑا مسئلہ پیدا نہیں ہوا، البتہ جموں وکشمیر، شمال مشرقی ریاستوں میں علیحدگی پسندوں کی آواز اٹھتی رہتی ہے۔ ایک سب سے بڑے چیلنج کا سامنا ہندوستانی نکسل وادیوں کی پرتشدد تحریک کا ہے جو کہ عین ہندوستان کے وسطی علاقے میں پنپ رہی ہے اور بروقت اس کی طرف توجہ نہیں دی گئی تو مستقبل میں کافی سنگین حالات کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔

توجہ طلب مسائل

نکسلائٹ کے ساتھ ساتھ علیحدہ ریاستوں کا مطالبہ بھی کئی صوبوں میں کیا جارہا ہے۔ فی الحال تلنگانہ کا مسئلہ کافی گرم ہے۔ آندھرا پردیش کے متعدد اضلاع بشمول حیدرآباد الگ ریاست تشکیل دینے کے مطالبے میں شدت پیدا ہوگئی ہے۔ کبھی کبھی یہ تشدد کا راستہ بھی اختیار کرلیتی ہے۔ مہاراشٹر میں ودربھ کی مانگ عرصے سے جاری ہے، لیکن فی الحال ایک خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ اتر پردیش کو بھی کئی حصوں میں تقسیم کرنے کے مطالبے ہیں، ان معاملات کو وقت رہتے حل کرلینا چاہیے، ورنہ لسانی بنیاد اور دیگر بنیادوں پر ہونے والی اس تقسیم سے سنگین مسائل پیدا ہوسکتے ہیں۔

ان تمام مسائل اور معاملات کے باوجود ہندوستان جس تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن ہے، اس کے لیے ہندوستانی عوام ذمے دار ہیں اور اس کا سہرا یقیناً ان ہی کے سر جاتا ہے۔

■

Javed Jamaluddin, Head, Roznama Rashtriya Sahara, 1st Floor, Ghanshyam Chamber, New Link Road, Andheri (W), Mumbai-400 053

اعجاز احمد اعجاز

جدید وسائل اور نظم و غزل کی تدریس

ایک اچھا معلم اپنی پر اثر تدریس سے پہچانا جاتا ہے۔ اچھی تدریس کے اثرات بھی مثبت ہوتے ہیں۔ اپنے مضمون پر دسترس حاصل کرنے کے لیے معلّمین کو تدریسی فن اور اس کے اسالیب سے آگاہی ضروری ہے۔ دورِ حاضر میں اساتذہ کو قبل از ملازمت یا دوران ملازمت طریقہ تعلیم، تعلیمی سرگرمیوں، نیز طلبہ کی نفسیات سے متعلق تفصیلی معلومات دی جاتی ہے۔ اس بات پر بھی غور و خوص کیا جاتا ہے کہ کمرہ جماعت میں آنے والی رکاوٹوں کو کس طرح دور کیا جائے۔ جہاں تک کالج کی سطح پر تدریس کا سوال ہے وہ پر اثر ہو کیونکہ یہاں معلمین کے سامنے بیٹھے ہوئے طلبہ ذہنی و جسمانی طور پر بالغ ہوتے ہیں۔ ان کا شعور بیدار ہوتا ہے۔ کسی مفکر نے کیا خوب کہا ہے 'طلبہ بند کتاب کی مانند ہوتے ہیں' انھیں بس کھولنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک اچھا استاد وہ ہوتا ہے جو طلبہ کی صحیح سمت میں رہنمائی کرتا ہو، زندگی کو جینے کا راستہ دکھاتا ہو۔ اسے اپنے مضمون پر مکمل دسترس حاصل ہو، انداز بیان متاثر کن ہو، دلوں کو چھو لینے والا ہو، وہ جدید ٹیکنالوجی کا استعمال جانتا ہو۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ایڈگر ڈیل کہتا ہے کہ انسان 83 فیصد علم اپنی آنکھوں سے دیکھ کر حاصل کرتا ہے گیارہ فیصد علم اپنے کانوں سے اور باقی ماندہ علم اپنے دیگر حسی اعضا سے حاصل کرتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی تدریس کے دوران زیادہ سے زیادہ وسائل تعلیم کا استعمال کریں، حالانکہ کالج کی سطح پر اساتذہ اکرام وسائل تعلیم کا استعمال اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں چند اساتذہ کرتے بھی ہیں تو بہت ہی کم تعداد میں۔ حالانکہ ماہرین کہتے ہیں ایک تصویر ایک ہزار الفاظ کو بچاتی ہے۔ ایک عام انسان کسی فلم کی تین گھنٹے کی اسٹوری ذہن میں رکھتا ہے، کچھ مشہور فلموں کے ڈائیلاگ تو لوگوں کو ایسے یاد رہتے ہیں کہ باتوں باتوں میں روزانہ انھی کا استعمال کرتے ہیں۔ ٹی وی پر کوئی درد بھری کہانی یا منظر دیکھ کر حساس دل لوگ بطور خاص خواتین رو پڑتی ہیں۔ چاہے وہ کسی عمر کی ہوں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان جو کچھ دیکھتا ہے اس کا اثر اس کے دل و دماغ پر ہوتا ہے۔ دیکھ اور سن کر حاصل کیے علم کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ آج طریق تدریس میں تبدیلی کی اہم ضرورت ہے۔ اگر معلمین وہی پرانا اور گھسا پٹا طریقہ تدریس استعمال کریں تو طلبہ پر اس کا خاطر خواہ کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

کسی خیال یا شعر کی فہمائش کرتے وقت ممکن ہو تو وسائل تعلیم کا استعمال کریں، جدید ٹیکنالوجی کے استعمال سے ہماری تدریس پر اثر ہوتی ہے۔ ممکن ہو تو تدریس کے دوران اوور ہیڈ پروجیکٹر، یا سلائیڈ پروجیکٹر کا استعمال کریں۔ سلائڈ پروجیکٹر کو لیپ ٹاپ سے مربوط کر کے پاور پوائنٹ پری زینٹیشن بھی دے سکتے ہیں۔ پین ڈرائیو یا سی ڈی کی مدد سے محفوظ کیا ہوا مواد وقت پر طلبہ کے سامنے پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس قسم کی تدریس کا اثر طلبہ پر دیرپا ہوتا ہے۔ اساتذہ کا وقت اور محنت بچتی ہے۔ انٹرنیٹ پر بھی اب اردو ادب سے متعلق کافی مواد موجود ہے ہم اپنے مطلوبہ مواد، قصہ، واقعہ، نظم و غزل، کسی کتاب یا اس کے اقتباس کسی شاعر یا ادیب کی سوانح عمری اردو زبان پر ہو رہی تحقیق، تحقیقی مکالمے و دیگر معلوماتی مضامین بآسانی ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں اور اسے کمپیوٹر، پین ڈرائیو یا پھر سی ڈی وغیرہ میں محفوظ کر کے رکھ سکتے ہیں۔ اگر ہمارے پاس لیپ ٹاپ ہے تو یہ اور بھی زیادہ سہولت و آسانی فراہم کرتا ہے کوئی بھی محفوظ (سیو) کی ہوئی فائل کلک کرتے ہی فوراً ہمارے سامنے ہوتی ہے۔ ہم اہم واقعات، اشعار، تعریفیں خیالات، نئے الفاظ کو حسب ضرورت استعمال کر سکتے ہیں۔

تدریسی عمل میں جدت لانا آج وقت کی اہم ضرورت بن گئی ہے۔ اگر کسی وجہ سے ہمارے پاس جدید ٹیکنالوجی کے آلات نہ ہوں تب بھی ہم فلیش کارڈز، چارٹس، مختلف قسم کی تصاویر کا بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ ہمیں ضرورت کے مطابق اکتسابی تجربات کرتے رہنا چاہیے۔ تاکہ تمام طلبہ کو مستقبل کے لیے تیار کیا جا سکے۔ ان کی طبع زاد صلاحیتوں کی نشوونما ہو سکے۔ ان کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہونا چاہیے تاکہ بآسانی از خود لکھ سکیں، اپنے خیالات جذبات و احساسات قلمبند کر سکیں۔ بعض طلبہ معلمین سے ڈرے سہمے ہوئے رہتے ہیں، اس لیے وہ اکثر پریڈ میں بھی نہیں آتے اور کالج سے راہِ فرار اختیار کر لیتے ہیں، کالج ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں قطعی وجوہات کو تلاش کر کے بروقت مناسب تدابیر و رہنمائی سے ہم طلبہ کا دل جیت سکتے ہیں۔

نظم و غزل کی تدریس کے لیے اساتذہ کی پیشگی تیاری انتہائی ضروری ہوتی ہے۔ نثر میں خیالات وضاحت، دلیلوں کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں، جبکہ نظم و غزل میں شاعر انتہائی اختصار سے کام لیتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اسے سمندر کو کوزے میں بند کرنا کہتے ہیں۔ شاعر اپنی بات کو اشاروں کنایوں میں اختصار سے کام لیتے ہوئے اپنی بات میں تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ غزل کا ہر شعر اپنے اندر ایک مکمل منظر نامہ رکھتا ہے۔

دوران فہمائش نظم یا غزل کی ہیئت سے طلبہ کو کلی طور سے روشناس کرائیں۔ غزل کے اجزا کو سمجھانا چاہیے۔ مثلاً مطلع، مقطع، ردیف، قافیہ کی بندش وغیرہ سے واقفیت دلانا نیز یہ بتانا کہ شاعر اپنے تخلص کو کس شعر میں استعمال کرتا ہے، اسے ہم کیا کہتے ہیں۔ اس سلسلے میں جناب رشید احمد تراپ لکھتے ہیں:

''نظم یا غزل کی ہیئت سے طلبہ کو بھرپور طریقے سے روشناس کرانا بھی معلم کی ذمے داری ہے۔ مطلع، مقطع، ردیف، قافیہ وغیرہ سے واقفیت دلانا شاعر کے تخلص استعمال کرنے کے مواقع اور بعض اوقات شعر کی ضروریات کے تحت نام اور تخلص دونوں کا استعمال مقطع کے علاوہ بعض غزلوں کے مطلع میں تخلص کا استعمال، طویل ردیف اور مختصر ردیف کا فرق جیسے امور سے آگاہی طلبہ کو ان کے فہم و ادراک میں مدد دے سکتی ہے۔ مثلاً احسان دانش اکثر جگہوں پر دانش بطور تخلص لاتے ہیں لیکن اس شعر میں احسان دانش لکھا ہے۔''

دوستی احسان دانش کچھ نہیں اس کے سوا
زندگی بھر اعتراف حسن زن کرتے رہو!

(اخبار اردو اسلام آباد مئی 2008، اردو دنیا جولائی 2008، صفحہ 12)

نظم و غزل میں پوشیدہ اشاروں، کنایوں اور ان کے مفہوم کو سمجھانا چاہیے۔ مختلف علامات کے مفاہیم سے بھی طلبہ کی ذہنی ترقی میں مدد مل سکے گی۔ مثلاً گل و بلبل، ہجر و وصال، گل و خار، زلفیں و گیسو، عاشق و معشوق، نیز جدید استعارات میں لب، پنکھڑی، خورشید چراغ، تجربات سبق، فانوس شمع، شب تاریک وغیرہ کا استعمال مقام کے اعتبار سے ہوتا ہے یہ بتایا جائے۔

غزل و نظم کی تدریس کے دوران یہ بات ذہن میں

تدریسی عمل میں جدت لانا آج وقت کی اہم ضرورت بن گئی ہے۔ اگر کسی وجہ سے ہمارے پاس جدید ٹیکنالوجی کے آلات نہ ہوں تب بھی ہم فلیش کارڈز، چارٹس، مختلف قسم کی تصاویر کا بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ ہمیں ضرورت کے مطابق اکتسابی تجربات کرتے رہنا چاہیے۔ تاکہ تمام طلبہ کو مستقبل کے لیے تیار کیا جا سکے۔ ان کی طبع زاد صلاحیتوں کی نشوونما ہوسکے۔ اُن کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہونا چاہیے تاکہ بآسانی اُن خود لکھ سکیں، اپنے خیالات جذبات و احساسات قلمبند کر سکیں۔

رہے کہ اس کی ہیئت کو طلبہ کے سامنے رکھیں، پورا موضوع، واقعہ یا منظر جس کا شاعر نے کلام میں استعمال کیا ہے اسے تفصیل سے پیش کیا جائے۔ مثلاً علامہ اقبال کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

اگر جہاں میں میرا جوہر آشکارا ہوا
قلندری سے ہوا ہے تونگری سے نہیں !

علامہ اپنی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرا جوہر دنیا میں نمایاں ہوا اور مجھے عزت اور بلند درجہ ملا ہے تو اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ میرے پاس دولت کی فراوانی ہے بلکہ میں تو دراصل بے زر تھا۔ یہ سب کچھ تو مجھے درویشی اور خدامستی کی بدولت حاصل ہوا۔

دوران تدریس جہاں ضروری ہو قواعد کے استعمال سے متعلق معلومات دی جانی چاہیے۔ بعض اوقات کلام میں تکرار لفظی کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ اردو زبان کی بڑی خصوصیت میں سے ہے بعض اوقات تکرار سے مبالغہ یا کثرت ظاہر ہوتی ہے۔ جیسے وہ چلتے چلتے رک گیا ہنستے ہنستے اس کا برا حال ہوگیا اس نے تمام ماجرا، رو رو کر سنایا۔ کھیلتے کھیلتے وہ گر پڑا، آتے آتے یہ فن آئے گا۔ چلتے چلتے مجھے کوئی مل گیا تھا، چلتے چلتے، چلتے جاؤ تب منزل کو پاؤ گے۔ رہ رہ کے لوگ مجھ کو پڑھیں گے ورق ورق، اس نے ہر ہر فن پر عبور حاصل کرلیا۔ طلبہ کو تکرار لفظی کے استعمال سے متعلق مفصل معلومات دینا چاہیے، ہوسکے تو اس کی چند مثالیں پیش کی جائیں، مثلاً یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

مرے آشیانے کے تھے چار تنکے
مکاں اڑ گیا آندھیاں آتے آتے

بعض اوقات آہستہ آہستہ یا رفتہ رفتہ کے معنی ہوتے ہیں خاص کر 'ہوتے ہوتے' تو ان معنوں میں بہت آتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی دوسرے افعال ان معنوں میں آتے ہیں، مثلاً:

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہدو
کہ آتی ہے اردو زبان آتے آتے

غزل یا نظم کو ترنم سے پڑھیں تو اس کا اثر طلبہ پر خاطر خواہ ہوتا ہے لیکن اگر تحت اللفظ میں پڑھ رہے ہوں تو اس انداز سے ادائیگی کریں کہ شعر کے وزن، بحر تقطیع اور اس کی روانی میں کوئی فرق نہ آئے الفاظ کی ادائیگی اس انداز سے ہو کہ شعر کا مفہوم واضح ہو جائے چنانچہ اس ضمن میں رشید ترابی فرماتے ہیں:

''شعر کو نثر میں تبدیل کرنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ شعر کی ترتیب کا درست ادراک ہو۔

چونکہ شعر میں الفاظ کی ترتیب یکسر مختلف ہوتی ہے اس لیے غلط ادائیگی کے سبب غلط نثر بنانے کا احتمال رہتا ہے جس سے مفہوم میں خاصا فرق پڑ سکتا ہے مثلاً فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم کے ایک انتخابی جلسے میں ایک کارکن مقرر نے علامہ اقبال کے ایک معارف شعر:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

شعر کے پہلے دو لفظ 'ایک ہوں' (بمعنی متحد ہو جائیں) کو 'ایک ہوں' (میں اکیلا ہی ہوں) پڑھ دیا'' (اخبار اردو اسلام آباد، مئی 2008، اردو دنیا جولائی 2008، صفحہ 12)

شعر کو نثری عبارت میں تبدیل کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ اپنی جانب سے کوئی اضافہ نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔ طویل نظم یا مثنوی کو پیش کرتے وقت تمام واقعات کو ایک دوسرے سے مربوط کر کے پیش کرنا ہوگا مثلاً مد و جزر اسلام، شکوہ جواب شکوہ، گورستان شاہی، شاہنامہ اسلام، قطب مشتری، پھول بن، بوستان خیال، شہادت الحقیقت وغیرہ۔

یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ تشریح کرتے ہوئے کسی غیر ضروری بات کو اتنا نہ بڑھا دیں کے وقت ہاتھ سے نکل جائے اور نہ کسی ضروری قصہ یا واقعہ کو بیان کرنے میں انتہائی اختصار سے کام لے لیا جائے کہ متعلقہ مضمون کا حق ادا نہ ہو مثلاً علامہ اقبال کا یہ شعر:

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے

اس شعر میں علامہ اقبال فلسطینی عرب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ میں جانتا ہوں کہ تیرے وجود میں وہ آگ بھری ہوئی ہے، جس کی جلن اور حرارت کی طرف سے دنیا کو اب تک اطمینان نہیں ہوا ہے یعنی تیرے مجاہدانہ کارنامے زمانے بھر پر آشکارا ہیں اور قومیں اب تک ڈری سہمی ہوئی ہیں کہ تو نے کروٹ لی تو پھر یہ پرانا دور شروع ہو جائے گا اور تیری پیش قدمی کا سیل کسی کے روکے نہ رک سکے گا۔

آج کے اس دور میں سچا انسان در در پھرتا ہے اور ایسا ویسا اپنے کھوٹے سکوں کو چلا دیتا ہے۔ اس سے متعلق مظفر حنفی فرماتے ہیں:

محنت کسی کی ،نام کسی کا ہوا بلند
ذرے سمٹ گئے تو بگولا ہوا بلند

مندرجہ بالا تمام اہم نکات کے علاوہ معلمین حضرات درج ذیل نکات کو تدریس کے دوران ملحوظ رکھیں:

رشید احمد کے مطابق شعر کے پس منظر کو یا اس میں موجود جذبے کو نمایاں کیا جانا چاہیے، غزل یا نظم کے شعر اپنے اندر جذبات و احساسات کی اک نئی دنیا رکھتے ہیں جب تک صحیح تشریح نہ ہوگی اس کا حق ادا نہ ہوگا، غزل میں شاعر کبھی عشق حقیقی یا کبھی عشق مجازی کو بیان کرتا ہے لہٰذا ان احساسات و جذبات کو اجاگر کرنا چاہیے۔ مثلاً مولانا حسرت موہانی کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

اللہ رے جسم یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

اگر اسے حقیقی روپ میں لیا جائے تو ہم حسرت موہانی کے انداز تخیل کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے جس انداز سے سرور کائنات ؐ کے جسم اطہر کی تعریف کی گئی ہے۔ اپنی تدریس کا تعلق دیگر مضامین سے بھی جوڑیں مخصوص علامات اور تراکیب کی موقع موقع سے وضاحت کرتے رہیں۔ طلبہ کو مختلف شعریات سے واقف کرایا جائے بطور خاص مضمون آفرینی، دقت پسندی مبالغہ پروری، صنائع و بدائع کے جواز، ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالی جائے۔ اردو سے متعلق مشکل الفاظ اور مختلف علوم و فنون کی اصطلاحات و تلمیحات کو حل کیا جائے۔

تدریس سے پہلے نظم و غزل سبقاً سبقاً ضرور پڑھ لیں، تاکہ شعر کے تمام الفاظ کا صحیح تلفظ اور مفہوم کے سلسلے میں کسی قسم کا تذبذب باقی نہ رہے۔ اس کے بغیر ہم طلبہ کو صحیح طور پر تدریس نہیں کر سکیں گے۔ ابتدا میں طلبہ سے نظم یا غزل کے چند شعر پڑھوائے جائیں درس میں بلند خوانی بھی ضرور کرائی جائے۔ نظم یا غزل کے ہر شعر کی مکمل تفہیم کے بعد طلبہ کو اس کا مفہوم اختصار کے ساتھ لکھوا بھی دیا جانا چاہیے لیکن تفہیم کے بغیر مفہوم لکھوانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، دوران تدریس آموختہ سننے کا اہتمام کیا جائے۔ طلبہ کو بدل بدل کر پوچھا جائے ممکن ہو تو شامل نصاب شعرا کی اہم غزلوں، نظموں کو یاد کرایا جائے اور پھر ان سے زبانی سنا بھی جائے۔ مخصوص علامات و تراکیب کی وضاحت بھی کرتے چلیں۔

Dr. Ejaz Ahmad Ejaz, 'Darus Salam' Azad Colony, Akola

عصر جدید میں ترجمے کی افادیت

ارشاد نیازی

اگر ادب، سماج کا آئینہ ہے تو ترجمہ ادبی وتہذیبی ارتقا کی شناخت اور رفاقتوں کے احساس کا نام ہے۔ عہد موجود میں ترجمے کی اہمیت اور افادیت سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔ وہ بھی ایسی صورت میں جب کہ 'گلوبل ولیج' کا تصور عام ہورہا ہے اور 'دنیا ایک آنگن' میں سمٹ آئی ہے۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب ہم ایک شہر سے دوسرے شہر، ایک صوبے سے دوسرے صوبے اور ایک ملک سے دوسرے ملک جانے میں برسوں لگادیتے تھے۔ اس لیے کہ ہمارے پاس نہ صرف وسائل کی کمی تھی بلکہ زبان کی بھی مجبوری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ غیر ملک اور وہاں کے باشندے ہمیں اجنبی لگتے تھے اور ہم خود کو تنہا محسوس کرتے تھے۔ اس طرح معاشرے میں ایک دوسرے کو سمجھنے اور نزدیک آنے میں جہاں سب سے بڑی رکاوٹ زبان رہی، وہیں اس رکاوٹ کو دور کرنے میں 'ترجمے' نے اہم رول ادا کیا ہے۔

تہذیب کے ارتقا کا عمل حقیقت میں ترجمے کی بنیاد پر قائم ہے۔ یہ ایک ایسا سفیر ہے جس کے توسط سے علم کا لین دین ہوتا ہے۔ مذہب، ادب، تعلیم، فلسفہ، صنعت، حرفت، سیاست، تجارت اور تہذیب وثقافت کے مختلف پہلوؤں سے ترجمے کا مضبوط رشتہ ہے۔ یہ انسانی تجربے کا حصہ رہا ہے کہ جب جب دو تہذیبوں کا ٹکراؤ ہوا ہے، ترجمے نے دونوں کے مابین پُل کا کام انجام دیا ہے۔ مسلمانوں کے ہندوستان آنے کے بعد عربی تہذیب اور ہندوستانی تہذیب میں ٹکراؤ ہونا لازمی تھا۔ نتیجتاً دونوں تہذیبیں قریب آئیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوئیں۔ عربی کے بعد عہدِ مغلیہ میں ایرانی تہذیب اور فارسی زبان کا بول بالا ہوا اور یہ زبان نہ صرف لال قلعہ اور دہلی تک محدود رہی بلکہ بہت حد تک ہندوستان کی زبان بن گئی۔ نتیجے میں فارسی سے سنسکرت اور سنسکرت سے فارسی اور ملک کی دوسری زبانوں میں ترجمے ہونے لگے۔ دونوں تہذیبیں قریب آئیں اور اتنی قریب آئیں کہ 'دوئی' مٹ گئی اور ایک نئی تہذیب جسے گنگا جمنی تہذیب کہتے ہیں ابھر کر سامنے آئی۔ زبانِ اردو بھی انھیں تہذیبوں کے میل ملاپ کی عطا ہے۔ انگریزوں کے آنے کے بعد یہ ہوا کہ ترجمے کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ یورپ کی زبانوں اور بطور خاص انگریزی کے وسیلے سے علم ومعلومات کی دنیا سجنے، سنورنے اور آباد ہونے لگی کیونکہ ''ملوکیت میں وہ افراد یا طبقے ہمیشہ ممتاز رہے، جنھوں نے حاکموں کی زبان سیکھنے میں سبقت کی۔ حاکموں نے بھی محسوس کیا کہ امن واستحکام کے لیے صرف زورِ بازو ہی کافی نہیں ہے۔ دلوں کو بھی مسخر کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے محکوم قوموں کی زبان اور ثقافت سے آشنائی ضروری ہے۔ اجنبیت اور مغائرت کو کم کرنے کے لیے ترجموں کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔''(1) اسی کے ساتھ یہ بھی کہنا چاہیے کہ ''ترجمہ کے ذریعہ ہی ایک زبان دوسری زبان کے اظہارات اس کے مزاج اور نحوی ساخت سے متعارف ہوکر اپنا رنگ روپ بدلتی اور وسعت حاصل کرتی ہے۔ اکثر دوسری زبانوں کے شاہکاروں کا ترجمہ بھی ادیبوں کو نئے ادبی میلانوں اور فنی معیاروں کا احساس دلاکر نئے تجربات پر اکساتا ہے اور نئے ادبی رجحانات کا محرک ثابت ہوتا ہے۔''(2) اس سلسلے میں ظ. انصاری کا خیال ہے کہ:

''اردو تو ایک باقاعدہ زبان بنی ہی ترجموں کی بدولت، ورنہ جب تک کھڑی بولی کے روپ میں تھی اسے کسی بڑے قلم کار نے ادبی تصنیف کے قابل نہ سمجھا۔ بولی سے زبان تک کا طویل فاصلہ ایک صدی کے اندر طے کرلینے میں ترجموں کا بڑا ہاتھ ہے۔ کہیں یہ ترجمے کتابی صورت میں ہوئے اور کہیں محض خیال، استعارے اور اصطلاحوں کی صورت میں... بہرحال یہ مسلم ہے کہ عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی کے علاوہ بھاشاؤں کے ترجمے اور ترجمانی کو اردو زبان کی تعمیر اور تربیت میں بڑا دخل ہے۔''(3)

> تہذیب کے ارتقا کا عمل حقیقت میں ترجمے کی بنیاد پر قائم ہے۔ یہ ایک ایسا سفیر ہے جس کے توسط سے علم کا لین دین ہوتا ہے۔ مذہب، ادب، تعلیم، فلسفہ، صنعت، حرفت، سیاست، تجارت اور تہذیب وثقافت کے مختلف پہلوؤں سے ترجمے کا مضبوط رشتہ ہے۔ یہ انسانی تجربے کا حصہ رہا ہے کہ جب جب دو تہذیبوں کا ٹکراؤ ہوا ہے، ترجمے نے دونوں کے مابین پُل کا کام انجام دیا ہے۔

یہ تو ہم جانتے ہیں کہ ایک زبان کے بولنے والے گروہ یا جماعت میں فکر وخیال اور جذبات واحساسات کے اظہار کے لیے ایک ہی زبان کا استعمال کیا جاتا ہے مگر دو مختلف زبانوں کے بولنے والوں کے مابین تبادلۂ خیال اور فکر واحساس کے اظہار خیال کے لیے ترجمہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی نہیں آج جبکہ چھوٹے، بڑے ملک اور قومیں نیز عام آدمی بھی دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلے مختلف ملک، زبان اور زبان کے بولنے والوں سے اپنا تعلق اور محبت کا رشتہ استوار کرنا چاہتے ہیں تو ایسے میں صرف ادب اور مذہبی صحائف کا مطالعہ ہی کافی نہیں رہا بلکہ دوسری، زبان اور زبان کے بولنے والوں کے اخلاق، تہذیب، سماج، قومی نفسیات اور ملکی جمالیات کا علم اور مطالعہ ضروری ہوا جس کا انحصار ظاہر ہے ترجمہ پر ہی ہوگا۔ کہنا چاہیے کہ آج کی ضرورتوں نے اس کے وسائل اور رسائی کے دائرہ کار کو کافی پھیلا دیا ہے اور ترجمہ اپنے مقاصد میں مزید وسیع سے وسیع تر ہورہا ہے۔ بقول محمد حسن:

''عالم گیر آگہی کا نور اور سرور ایک زبان کے دامن میں تو سمٹنے سے رہا۔ جب بھی ایک زبان کے بولنے والے دوسری زبانوں کے علم وآگہی، جذبے اور شعور، فکر و احساس، تکنیک اور سائنس تک پہنچنا چاہیں گے ترجمے کا سہارا لیں گے۔''(4)

'بنیادی طور پر ترجمہ لسانی وتہذیبی مفاہمہ ہے'، اسی کے ساتھ ''ترجمہ ایک طرف تو انسانی علوم میں اضافے اور ذہنی سرحدوں کو کشادہ کرنے کا ذریعہ بنتا ہے تو دوسری طرف اس کے ذریعے نئے نئے خیالات زبان میں داخل ہوتے ہیں اور زبان کی قوت اظہار میں نئے امکانات پیدا ہوتے ہیں اور اس کے ذریعہ ایک بین الاقوامی اندازِ نظر پیدا ہوتا ہے کیونکہ یہ ترجمہ بذاتِ خود بین الاقوامی نقطۂ نظر کی پیداوار ہے۔''(5)

یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ سائنس کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں اور نئی نئی تحقیقات وایجادات نے انسانی زندگی کو آسانیاں فراہم کی ہیں۔ سائنسی تحقیقات کی مشکل میں آلات اور ساز وسامان جو عطا ورحمت کی طرح ہمیں میسر ہیں، ان کی کمی وفقدان کی وجہ سے زندگی کا تصور ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ لیکن ان سائنسی اضافے سے تعارف وملاقات ترجمہ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ سائنس نے پچھلے سو، ڈیڑھ سو سال میں جتنی ترقی کی ہے، ویسی ترقی پوری انسانی تاریخ میں نہیں ہوئی ہوگی۔ ترقی کی اس تیز رفتاری کی خاص وجہ تمام دنیا کے سائنس دانوں کے مابین امدادِ باہمی کا نتیجہ ہے۔ پہلے ایک ملک میں ہوئی ایجادات وتحقیقات بہت دیر سے دوسرے ملکوں تک پہنچتی تھیں لیکن آمد ورفت کی سہولت اور ذرائع ابلاغ وترسیل کے وسائل نے جو آسانیاں فراہم کی ہیں ان سے سائنس داں آپس میں تبادلۂ خیال کے ساتھ اپنے کام سے دوسروں کو آگاہ بھی کرتے ہیں۔ اسے دوسری زبان اور ملک تک پہنچانے کے لیے ترجمہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے اس علمی، تحقیقی اور معلوماتی دنیا کے باہمی تبادلۂ خیال کی ضرورت کے نتیجے میں ترجمہ کی معنویت کو عالمی سطح پر استناد حاصل ہوگیا ہے۔ ''اس میں شک نہیں کہ آج جب دنیا کی طنابیں کھینچ رہی ہیں اور عالم گیر سطح پر ایک اکائی بنتا جارہا ہے.... جب تک نئے خیالات کا خون اور نئی آگہی کا نور رگ وپے میں سرایت نہ کرے گا زندگی دشوار ہے۔''(6)

یہ دنیا ایک اسٹیج ہے۔ ایسا اسٹیج جہاں مختلف زبان اور زبان کے بولنے والے طرح طرح کی زبانوں کا لباس پہن کر بلکہ اپنی اپنی زبانوں سے سج سنور کر اسٹیج پر اپنے علم اور فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مشہور مقولہ ہے کہ ''دو کوس پر پانی بدلے، آٹھ کوس پر زبان۔'' ان سبھی زبانوں اور ان کے بولنے والوں کے درمیان فرق وامتیاز کو ختم کرنے اور ان میں زبان کی سطح پر تطابق اور رسائی کے لیے عالمی سطح پر ترجمے کی ضرورت کو محسوس کیا جاسکتا ہے کیونکہ ترجمہ ہی مختلف زبانوں کے بولنے والوں کے مابین رشتۂ اخوت ومحبت کی ایک مضبوط کڑی ہے۔ دنیائے ادب میں جس عالمی ادب کا تصور بہت زمانے تک مبہم تھا اب اس کے امکان، اہمیت اور ضرورت کے نقوش زیادہ روشن ہوگئے ہیں۔ ظاہر ہے اس سلسلے کی درمیانی کڑی ترجمہ ہے۔ یعنی ترجمہ کے ذریعے ہی عالمی ادب کی تعمیر ہوئی ہے۔ ''جس طرح دیے سے دیا جلتا ہے، اسی طرح علوم سے علوم پیدا ہوتے ہیں۔ اگر دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں کو ٹٹولا جائے تو اس کا پتہ چلے گا کہ ان کی نشوونما کے مختلف مرحلوں میں دوسری زبانوں کے اثر کو بھی بڑا دخل ہے۔''(7) وہ اس لیے کہ ''جب کوئی قوم علوم وفنون میں ترقی کا پہلا قدم اٹھاتی ہے تو سب سے پہلے علمی زبان کے تراجم سے اپنی زبان کو سرمایہ دار بناتی ہے اور اپنے علمی خزانوں کو معمور کرتی ہے۔''(8) دور جانے کی ضرورت نہیں خود اردو زبان وادب میں انگریزی کے اثرات کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ فکر وخیال، اسالیبِ بیان، نئے طرز احساس اور ڈکشن کے علاوہ کئی اصناف کی ابتدا انگریزی زبان کے زیر اثر ہوئی ہے جیسے تنقید، ناول، افسانہ اور سوانح وغیرہ۔ نیز یہ کہ اس زبان نے نہ صرف نئی اصناف سے آشنا کیا بلکہ ان اصناف کو فنی

پورے ہندوستان میں جاری فکری وتہذیبی اسلوب کو ہم ترجمہ کے وسیلے سے ہی جان سکتے ہیں اور عوام تک پہنچا سکتے ہیں۔ ایک صوبے یا علاقائی زبان کے عظیم ادب اور ادیبوں کا تعارف ہم ترجمہ سے ہی حاصل کرتے ہیں اور اس کے ذریعے ہی ہم ہندوستانی ادب میں فکری سطح پر موجود اتحاد ومساوات کی روایت میں ہم آہنگی قائم کرسکتے ہیں۔ اس سے قومی اتحاد کو طاقت بھی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ جیسے جیسے ہندوستانی زبانیں ترقی کی راہ پر گامزن ہوکر اعلیٰ تعلیم کا وسیلہ ہوں گی ویسے ویسے دنیا کی زبانوں کے اعلیٰ ادب کا ترجمہ کرنے کی ضرورت باقی رہے گی۔

وقار بھی بخشا اور پیرایۂ اظہار کے نئے نئے سانچے بھی فراہم کیے۔

ہندوستان جیسے عظیم ملک کے لیے لسانی سطح پر ترجمے کی ضرورت اور معنویت ہمیشہ سے رہی ہے اور رہے گی۔ ہندی، ہندوستان کی قومی زبان ہے لیکن بائیس اور زبانوں کو 'آئین ہند' کی آٹھویں فہرست میں قومی زبان کے طور پر درج کیا گیا ہے۔ صرف اس لیے نہیں کہ ان زبانوں کو تحفظات فراہم کیے جائیں بلکہ اس سے اتحاد واتفاق کی فضا قائم رہے اور زبان کی سطح پر 'آئین ہند' میں کوئی امتیاز نہ پیدا ہوسکے۔

پورے ہندوستان میں جاری فکری وتہذیبی اسلوب کو ہم ترجمہ کے وسیلے سے ہی جان سکتے ہیں اور عوام تک پہنچا سکتے ہیں۔ ایک صوبے یا علاقائی زبان کے عظیم ادب اور ادیبوں کا تعارف ہم ترجمہ سے ہی حاصل کرتے ہیں اور اس کے ذریعے ہی ہم ہندوستانی ادب میں فکری سطح پر موجود اتحاد ومساوات کی روایت میں ہم آہنگی قائم کرسکتے ہیں۔ اس سے قومی اتحاد کو طاقت بھی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ جیسے جیسے ہندوستانی زبانیں ترقی کی راہ پر گامزن ہوکر اعلیٰ تعلیم کا وسیلہ ہوں گی ویسے ویسے دنیا کی زبانوں کے اعلیٰ ادب کا ترجمہ کرنے کی ضرورت باقی رہے گی۔ اس لیے کہ کسی بھی ملک اور سماج کے ادبی وتہذیبی ارتقا کا آئینہ تخلیقی ادب کی طرح ترجمہ بھی ہے۔ ہندوستان کے تہذیبی ارتقا میں اس کا اہم کردار رہا ہے کیونکہ ترجمہ ہی وہ اکیلا وسیلہ ہے جس کی مدد سے مختلف تہذیبوں، مذاہب اور ادب میں معاشرتی سطح پر مکالمہ قائم ہوسکتا ہے۔ ترجمے کے ذریعے جہاں ہم کسی تخلیق کو دوسری زبان اور زبان کے بولنے والوں تک پہنچاتے ہیں، وہیں دوسری طرف ہم تخلیقی احساس سے بھی دوچار ہوتے ہیں۔ معلوم یہ ہوا کہ تخلیقی سطح پر بھی ترجمے کی اپنی معنویت ہے جو ادب کی ثروت مندی اور ترقی ورفتار میں ایک اہم کردار ادا کررہی ہے۔

صنعتی وتجارتی دنیا میں بھی ترجمہ کی بڑی اہمیت ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ سرکاری زبان قانونی طور سے تاجروں اور صنعت کاروں پر عائد نہیں ہوتی لیکن ہندوستان میں تاجروں اور صنعت کاروں کو اپنا وجود باقی رکھنا ہے تو انھیں ترجمہ کی مدد لینی ہوگی۔ اپنی کمپنی کے مال' کو ہندوستان سے باہر دوسرے ملکوں یا عالمی سطح پر پہنچانے کے لیے انگریزی، ہندی اور دنیا کی دوسری زبانوں کا سہارا لینا ضروری ہے۔ اگر ہندوستان میں مختلف صوبوں، شہروں اور گاؤں تک اپنے 'پروڈکٹس' کو پہنچانا ہے تو اس کے لیے صوبائی اور علاقائی زبانوں میں ترجمہ کرنا ہی ہوگا۔ اس طرح دیکھا جائے تو تجارت اور صنعت کی دنیا کے کاروبار کو چلانا بھی بغیر ترجمہ کے ممکن نہیں ہے۔

صنعت وتجارت کے بعد اب ذرائع ترسیل وابلاغ کے وسائل پر نظر ڈالیں تو وہ 'پرنٹ میڈیا' ہو یا 'الیکٹرانک میڈیا' ترجمہ تو ذرائع ابلاغ وترسیل میں روح کی طرح موجزن ہے۔ جس طرح سے میڈیا کا بلاسٹ ہوا ہے اور ترسیلی نظام دن دونی رات چوگنی ترقی کررہا ہے، ایسی حالت میں ترجمہ کے بغیر ترسیل کا مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے۔ مثلاً ملکی سطح پر آج خبر رساں ایجنسیاں اپنی خبریں ہندی یا انگریزی میں بھیجتی ہیں مگر صوبائی یا علاقائی زبانیں ان کا ترجمہ کرکے، ٹی وی اسکرین، پر دکھاتی ہیں اور

اخباروں میں شائع کرتی ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ ترجمہ اور ذرائع ترسیل ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہوئے ہیں جیسے جسم اور روح۔ ایسے میں میڈیا کے لیے ترجمہ کی اہمیت بے حد بڑھ جاتی ہے۔ بطورِ خاص آج کی تیز رفتار زندگی میں ترسیل وابلاغ کی 'تیز رفتاری' کے ساتھ ترجمہ کی معنویت میں مزید وسعت پیدا ہورہی ہے لیکن ان سب کا ذکر کرنا ایک مضمون میں ممکن نہیں اس لیے کہ ترسیلی نظام میں ترجمے کی معنویت کے اتنے حوالے ہیں کہ اس پر الگ سے مضمون لکھا جاسکتا ہے۔

'تقابلی مطالعے' کے افق کو بھی وسیع کرنے میں ترجمہ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ''تقابلی ادب سے وہ ادب مراد ہے جو مختلف ادبی، فکری اور تہذیبی اثرات کو قبول کرتا ہو، جس کے ذریعہ مختلف ادبیات کے درمیان لین دین، تطابق وتخالف، تحریکات وتمثال، افکار واقدار کے تبادلے کا سلسلہ قائم ہو اور اس سلسلے کی سماجی اور اقتصادی عوامل ومحرکات کا مطالعہ کیا جاسکتا ہو۔''(9) اس سے فن پاروں، فنکاروں اور زبانوں کے مرتبے، درجات، ان کی خصوصیات اور اثرات کی نشاندہی میں قابلِ لحاظ مدد ملتی ہے۔ اس سلسلہ میں 'شلیگل' نے ادب کے آفاقی نظریات کے پیش نظر تخلیقی جمالیات کا نظریہ پیش کیا۔ اس کے بعد 'گوئٹے' نے پہلی بار آفاقی ادب world literature بات کہی جس کا مفہوم تھا ایک ایسی وراثت جس کی پیش کش عظیم شاعروں اور جمالیاتی تخلیق کاروں کے ذریعے ہوتی ہے اور جو انسانیت میں چھپی عوامی روح کو روشنی میں لاتا ہے۔ دراصل یہی وہ زمانہ ہے جس میں دنیا کے بڑے بڑے حادثات وانقلابات رونما ہوئے، عالمی جنگیں ہوئیں، صلیبی جنگیں لڑی گئیں، آزادی کی مختلف تحریکوں نے جنم لیا، دنیا کی مختلف زبانوں میں ادبی تحریکات پروان چڑھیں۔ 'ہیروشیما' اور 'ناگا ساکی' پر بم گرائے جانے کے بعد دنیا بھر کے ادیبوں نے انسانیت کو بنیاد بنا کر اس ظلم وبربریت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اس صدائے احتجاج اور اجتہاد کے ردِّعمل سے جملہ ادبیاتِ عالم کا وجود ابھر کر سامنے آیا، جس نے ادب کے تقابلی مطالعے کی راہ ہموار کی۔ یہیں سے ادب میں کچھ ایسے مشترک اقدار سامنے آئے، جن کی بنیاد پر عالمی ادب میں وحدت اور ایک طرح عالمی تصور اور بین الاقوامی اثرات کی نشاندہی کی جانے لگی۔

'تقابلی مطالعہ' اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ کس طرح ایک ادب، دوسرے ادب سے خوشہ چینی کرتا ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یونانی افکار اور ادب نے ساری دنیا کو کیسے متاثر کیا اور کس طرح یونانی ادب لاطینی ادب سے مربوط ہے۔ ساتھ ہی ہندوستان کا علم وادب سارے عالم میں کس طرح سے پھیلا اور ہندوستانی ادب نے ایرانی اور مشرقِ وسطیٰ کے ادب پر کیسے اثر ڈالا۔ جاحظ کے قول کے مطابق ''عربوں نے علم بلاغت ہندوستان سے سیکھا۔'' معلوم یہ ہوا کہ ہر قوم وملک کے ادب نے دوسری قوم وملت کے ادب میں کم وبیش اثر ونفوذ کیا ہے۔ فرانس کا عہد نشاۃ الثانیہ دورۂ کلاسیکی یونان اور رومی ادب سے خالی نہیں ہے۔ سترھویں صدی کے وسط سے مشرق کے علمی ذخیرے یوروپ کی توجہ کا مرکز بنے اور مستشرقین نے اسلامی ادب کے ایک بڑے ذخیرے کو مغربی زبانوں میں منتقل کیا۔

تقابلی مطالعہ کے ادبی، فکری، لسانی، موضوعاتی اور اسلوبیاتی رجحانات کے اس لین دین، تطابق وتخالف سے جہاں ادب کو ترقی ملتی ہے، وہیں بہت سے نئے نئے الفاظ، اصطلاحات، محاورات، کہاوتیں اور ضرب الامثال وغیرہ ایک ادب سے دوسرے ادب میں منتقل ہوکر اس کے کینوس کو وسیع کرتے ہیں اور قاری بیک وقت دو ادب اور تہذیب وثقافت سے واقفیت حاصل کرتا ہے۔ یہی نہیں تقابلی ادب کے مطالعہ سے قومی اور بین الاقوامی سطح پر کئی ادبی ثقافتوں کے بین otherness کے احساس کو کم کرکے باہمی اتفاق togatherness کے احساس کو فروغ دیا جاسکتا ہے اور اس طرح بین الاقوامی تہذیب وثقافت اور بین الاقوامی ہم آہنگی کو مضبوط کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستانی پس منظر میں 'تقابلی ادب' کی اساسی فکر یہی ہے کہ مختلف ہندوستانی زبانوں کے درمیان مختلف رنگ و روپ کے باوجود ان سبھی میں معنوی یکسانیت موجود ہے۔ اسی کے پیش نظر تقابلی ادب کے ذریعہ ہندوستانی ادب میں پوشیدہ ہندوستانی تہذیب وثقافت کی اساسی یکجہتی کو نمایاں کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ کام کسی ایک زبان کو اساس بنا کر کیا جاسکتا ہے، جس کا ادب زیادہ سے زیادہ تہذیبوں کی عکاسی کرتا رہا ہو۔ اردو زبان اس کے لیے زیادہ موزوں ہوسکتی ہے کیونکہ اس کا دائرہ کار آغاز سے ہی وسیع رہا ہے۔ اردو ادب کو مرکز میں رکھ کر دوسری ہندوستانی زبانوں کے ادب کے تقابلی مطالعہ کے ذریعہ ہندوستانی تہذیبی وثقافتی، ہم آہنگی کو اجاگر کیا جاسکتا ہے۔ اس سے قومی ادب، بین الاقوامی ادب اور عام ادب general literature کی جو تعقلی وراثت ہے اس سے منسلک کرنے میں تقابلی ادب ایک اہم رول ادا کرسکتا ہے اور ادبی ثقافت کے میدان میں صوبائی اور علاقائی سرحدوں کو مسمار کرکے غیر ملکی geneophobia سے بھی نجات دلاسکتا ہے لیکن ''ہر تقابلی مطالعہ کی بنیاد ظاہر ہے ترجمہ پر ہوگی۔ فنون لطیفہ کے دوسرے شعبوں مثلاً رقص، موسیقی اور مصوری کی طرح ادب نے کوئی عالم گیر زبان ایجاد نہیں کی اور زبان، ادب کا وسیلہ اظہار ہے اور ہر اہم زبان سے واقفیت اور وہ بھی اتنی اور ایسی واقفیت کہ اس کے ادب سے بہرہ مند ہوا جاسکے کسی ایک فرد کے لیے ممکن نہیں۔ اس لیے تراجم پر انحصار لازم ہے۔''(10)

مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ ترجمہ انسانی شعور اور عالمی فکر وتہذیب میں رشتۂ اخوت ومحبت اور مساوات قائم کرنے والا پُل ہے، جو علم وادب اور سائنس وٹکنالوجی کے شعبہ میں علاقائیت اور قومیت کے سمٹے اور محدود دائرے سے باہر نکل کر انسانی اتحاد اور جذباتی رشتے کے ارتکاز کا جواز فراہم کرتا ہے۔ دراصل یہی ترجمہ کی ضرورت، اہمیت، معنویت کا مضبوط اور بیّن ثبوت ہے۔

مصادر:

(1) ترجمہ کی اہمیت: شہباز حسین، ص188، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت، قمر رئیس

(2) 'مقدمہ' ترجمہ کا فن اور روایت، قمر رئیس، ص11-10

(3) ترجمے کے بنیادی مسائل: ظ. انصاری، ص81، مشمولہ فن ترجمہ نگاری، خلیق انجمن (ترجمہ) ثمر آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی 1995

(4) ترجمہ، نوعیت اور مقصد: محمد حسن، ص69، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت، قمر رئیس (مرتبہ)

(5) کلامِ فیض کے انگریزی تراجم: ڈاکٹر ابو شہیم خاں، ص17، کتابی دنیا، دہلی 2009

(6) ترجمہ، نوعیت اور مقصد: محمد حسن، ص74، مشمولہ: ترجمہ کا فن اور روایت، قمر رئیس (مرتبہ)

(7) مغربی تصانیف کے اردو تراجم: مولوی میر حسن، 'مقدمہ'، عبدالقادر سروری، ص19395

(8) دورِ تراجم: حاجی احمد فخری، مجلّہ 'اردو' دکن (ماخوذ از ترجمہ کا فن۔ مرزا حامد بیگ)

(9) مشرق ومغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ: محمد حسن، ص393، ترقی اردو بیورو، دہلی 1990

(10) ایضاً، ص397

Dr. Irshad Niyazi Dept of Urdu, Delhi University, Delhi - 110007

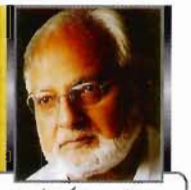

محمد بشیر مالیر کوٹلوی

افسانے میں مکالمہ کیسے لکھا جائے؟

افسانے میں ہمارے تخلیق کردہ کرداروں کا اظہار بہت ہی اہمیت رکھتا ہے۔ اظہار کے بغیر کردار کی ذہنی سوچ اور اس کی نفسیات کا ہمیں علم ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر کردار خاموشی سے ایک دوسرے کو گھورتے رہیں تو بات آگے کیسے بڑھ سکتی ہے؟ قاری کی دلچسپی کیونکر قائم رہ سکتی ہے۔ انسان اپنی اندرونی کیفیات کا اظہار تین طریقوں سے کرتا ہے۔ جب وہ حروف سے نا آشنا تھا تو اُس کے اظہار کا ذریعہ محض اشارے اور کنائے تھے۔ جب اُس کو زبان کا سلیقہ آیا تو وہ مکالمے کے ذریعے سامنے والے پہ اپنا اظہار کرنے لگا۔ جب اُس کی زندگی میں حرف آئے تو وہ تحریر کے ذریعے اپنی بات دوسرے پر واضح کرنے لگا تحریر اُس کے اظہار کا ذریعہ بنی۔ تحریر کے ذریعے وہ کوسوں دور بیٹھا اپنی بات دوسرے انسان تک پہنچانے لگا اپنے دکھ سکھ سے دوسروں کو آگاہ کرنے لگا۔ اگر بات اشاروں کی کریں تو ضرورت پڑنے پر نارمل انسان بھی اشاروں سے بات کرتے ہیں جو ایک عام بات ہے مثلاً آنکھ مارنا، ہاتھ سے ہاں یا نہ کا اشارہ کرنا، سر سے رضامندی یا انکار کا اظہار کرنا وغیرہ۔ دوسرے اشارے گونگے بہرے لوگوں کے ہوتے ہیں وہ الگ سے ایک تعلیم ہے گونگے اور بہرے لوگ آپس میں ہاتھوں کے اشاروں سے باتیں کرتے اور سمجھتے ہیں۔ ہمارے سامنے ایسا کوئی افسانہ نہیں آیا جس کے کردار گونگے اور بہرے ہوں ویسے بھی اُن کی زبان (اشارے) عام فہم نہیں ہوتی۔ ڈرامہ، ناول یا افسانہ، ان کے کردار اپنا اظہار مکالموں سے کرتے ہیں۔ مکالمہ ہی کردار کی عکاسی کرتا ہے۔ مکالمے کی اپنی تکنیک ہے۔ مکالمہ تخلیق کرتے ہوئے ہمیں کئی باتوں کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ سب سے اہم بات تو یہ کہ مکالمہ بہت زیادہ طویل نہیں ہونا چاہیے۔ مکالموں کا طویل ہونا افسانے کا سب سے بڑا عیب مانا جاتا ہے۔ مکالمہ کم سے کم جملوں میں ہونا چاہیے۔ الفاظ کم ہوں اور بات مکمل ہو، وہی مکالمہ خوبصورت اور بہتر مانا جاتا ہے۔ طویل مکالمے میں جھول آجانا قدرتی بات ہے۔ لمبے مکالمے پڑھ کر قاری اکتا جاتا ہے، اور اس کہانی پن پر برا اثر پڑتا ہے۔ اس ضمن میں موٹی سی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک باتونی آدمی، جو زیادہ بڑبڑ کرتا ہے، کی بات کا اثر لوگ کم ہی لیتے ہیں۔ ایسے بڑبولے سے لوگ، جلد ہی اکتا جاتے ہیں اور اس سے دور بھاگتے ہیں اسی طرح طویل اور بے معنی مکالموں سے قارئین کرام پرہیز کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں کم گو انسان جب بھی بولے گا کم بولے گا اور پتے کی بات کرے گا۔ اگر آپ کے کردار کا مکالمہ طویل ہے اور پورا مکالمہ افسانے کی ضرورت ہے جس کو کسی طرح سے مختصر نہیں کیا جاسکتا۔ ایسی صورت میں مکالمے کو دو تین حصوں میں توڑ کر پیش کیا جاسکتا۔ اس طرح طویل مکالمہ بھرپور اظہار کا وسیلہ بھی بن جاتا ہے اور اختصار کا دامن ہاتھ سے نہیں جاتا۔ مثلاً دو تین کرداروں کے درمیان بات ہو رہی ہے۔ راوی لمبے مکالمے میں اس طرح وقفہ دے گا چھ سات جملوں کے بعد راوی اپنی بات شروع کردے جیسے ''یہ بات کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔ کچھ سوچ کر پھر بولا'' یہاں سے مکالمے کا ٹکڑا ہوگیا۔ بولنے والا کردار چھ سات جملے پھر بولے گا۔ بیچ میں پھر ٹکڑا کردیجیے۔ کردار جو بات سن رہے ہیں ان میں سے ایک بولا ''پھر کیا ہوا؟'' دوسرا کردار خفگی سے بولا ''سن تو لے یار پھر بات کرلینا'' اُس نے پھر کہنا شروع کیا چھوڑا ہوا مکالمہ پھر شروع کیا جائے گا۔ مکالمہ اور زیادہ لمبا ہو تو پھر توڑ دو جیسے وہ کہتے کہتے رک گیا اور کنپٹی کھجا کر پھر بولا مکالمہ پورا کردیجیے اس طرح مکالمہ ٹکڑے ہوکر مختصر ہوجائے گا۔ اس کی طوالت کا قاری کو احساس بھی نہیں ہوگا۔ بات بھی مکمل ہوجائے گی۔ اس طرح اختصار بھی ہوجاتا ہے۔ اظہار بھی مکمل ہوجاتا ہے۔ طویل مکالمہ افسانے کو کمزور بنا دیتا ہے۔ اسے اس طرح مختصر کردینا چاہیے۔

افسانے کے کرداروں کی اندرونی کیفیت اور نفسیات کا اظہار ضروری ہے آپ کا کردار جو بھی ہے جس بھی قماش کا ہے ظاہر ہے آپ اُس کے خالق ہیں آپ کو اس کی عادات واطوار کی مکمل جانکاری ہوگی آپ اُس کی نفسیات کو بخوبی سمجھتے ہیں اُس کا اظہار آپ سے بہتر اور کون کرسکتا ہے۔ اُس کی عمر کے مطابق اس کی سوچ کے مطابق آپ کو اس کی زبان سے مکالمے کہلوانا ہیں۔

ضروری ہے کہ آپ اُس کردار کو اپنے اوپر اوڑھ لیجیے آپ اپنی ہستی کو بھول جائیں اپنے کردار کی زندگی جی لیجیے بس تھوڑی دیر کے لیے۔ مان لیجیے آپ کا کردار ایک چھوٹا بچہ ہے جب اُس کی زندگی کے پل آپ جئیں گے تو آپ اُس کی زبان بول اُٹھیں گے۔ توتلی زبان بھی بولیں گے۔ بچکانہ بات بھی کریں گے۔ یہی مکالمے کی خوبصورتی ہوگی۔ اگر آپ کا کردار نوجوان ہے آپ کے مکالموں میں جوشیلا پن ہونا ضروری ہے۔ آپ کا کردار پاگل بھی ہوسکتا ہے۔ آپ کا کردار قاتل بھی ہوسکتا ہے۔ بمبئی کا ڈان بھی ممکن ہے۔ مندر کے باہر بیٹھا بھکاری بھی ہوسکتا ہے۔ مسجد کا مولانا بھی ہوسکتا ہے۔ شدھ ہندی بولنے والا نیتا بھی کردار ویشیا بھی ہوسکتا ہے۔ کردار پتی ورتا، ٹوٹ کر پیار کرنے والی بیوی کا بھی۔ آپ کو اپنے ہر کردار کی نفسیات کو سمجھنا ہے۔ اُس کے سوچنے سمجھنے کی سطح کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے عین مطابق مکالمے لکھنے ہیں۔ آپ کے تحریر کردہ مکالمے آپ کے کرداروں کے مطابق ہیں تو سمجھیے آپ کامیاب افسانہ نگار ہیں۔ مکالمے کے مطابق آپ کو اس زبان کا علم بھی ہونا ضروری ہے جس کا آپ استعمال کر رہے ہیں۔ میرا ایک افسانہ یوپی اور بہار کے ملے جلے علاقے سے تعلق رکھتا تھا میں نے افسانے کے مکالمے اردو میں لکھے بعد میں ایک شخص سے رابطہ قائم کیا جو اُسی علاقے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک ایک مکالمہ کی زبان اُس شخص کی مدد سے اُس علاقے کی زبان میں تبدیل کر لی۔ اس طرح کام آسان ہوگیا۔ مکالموں میں اور پختگی آ گئی۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ آپ کے سبھی کردار ایک ہی بھاشا نہیں بول سکتے۔ مختلف بھاشائیں بولنے والے کردار ہوں گے۔ مثلاً بمبیا بولی، بھوجپوری، لکھنوٴ کی پرکشش لہجہ والی زبان اور پنجابی زبان، پڑھا لکھا سردار ہوگا اس کی زبان اَن پڑھ دیہاتی پنجابی سے مختلف ہوگی۔ بہر حال ہر کردار اپنی شخصیت کے عین مطابق آپ سے مکالمہ طلب کرے گا۔ اس کے مطابق آپ اسے مکالمہ نہیں دیں گے۔ تو وہ آپ سے روٹھ جائے گا۔ مکالمہ آپ کے افسانے کے لیے بہترین جزیات کا کام بھی کرتا ہے۔ بہر کیف آپ کو اپنے تخلیق کردہ کرداروں کی زندگی کے کچھ پل جینا ہوگا۔ اُس کے احساسات کو ذاتی طور پر محسوس کرنا ہوگا اس کی صورت میں آپ ان کے جذبات کی صحیح عکاسی کر پائیں گے۔

افسانے میں مکالموں کی بلاوجہ بھرمار بھی افسانے کو کمزور بنا دیتی ہے۔ مکالمے حسب ضرورت مختصر اور جامع ہونا ضروری ہیں۔ مکالموں کی بے جا بھرتی درست نہیں۔ کچھ افسانے ایسے بھی پڑھنے کو ملتے ہیں جس میں صرف مکالمہ ہی پائے جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ افسانچوں میں تو کارگر ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ اس کی ہیئت چند جملوں تک محدود ہوتی ہے۔ بھرپور افسانوں میں صرف مکالموں کے زور پر اختتام پر پہنچنا، افسانے کے دیگر لوازمات کے بغیر بہت مشکل ہے۔ ریڈیائی ڈراموں میں یہ بات ممکن ہے، وہ صرف مکالموں کے زور پر زندہ رہتے ہیں۔ کیوں کہ ان کا تعلق صرف سماعت سے ہوتا ہے۔ بصارت سے نہیں۔ بہر حال یہ بات ہمیں ملحوظ خاطر رکھنا ہوگی کہ افسانے میں مکالموں کی خواہ مخواہ بھرمار نہ ہو، حسب ضرورت مکالمے اچھے لگتے ہیں۔

مکالمے کے سلسلے میں ایک بات اور سامنے آتی ہے

افسانے کے کرداروں کی اندرونی کیفیت اور نفسیات کا اظہار ضروری ہے آپ کا کردار جو بھی ہے جس بھی قماش کا ہے ظاہر ہے آپ اُس کے خالق ہیں آپ کو اس کی عادات و اطوار کی مکمل جانکاری ہوگی آپ اُس کی نفسیات کو بخوبی سمجھتے ہیں اُس کا اظہار آپ سے بہتر اور کون کرسکتا ہے۔ اُس کی عمر کے مطابق اس کی سوچ کے مطابق آپ کو اس کی زبان سے مکالمے کھلوانا ہیں۔

وہ یہ کہ کچھ افسانہ نگار علاقائی زبان کی بھرمار کر دیتے ہیں۔ علاقائی زبانوں کا ہمارے افسانوں میں دخل قدرتی ہے ہم اس سے پرہیز نہیں کر سکتے کیوں کہ ہمارے افسانوں میں کبھی کوئی کردار پنجابی ہے تو کوئی مدراسی ہے یعنی تامل ہے کوئی مراٹھی ہے۔ ان کا تعلق مختلف شعبوں سے ہوسکتا ہے مثلاً کردار پنواڑی ہے۔ آٹو والا ہے پیڈل رکشا والا۔ کن میلیا، مالشیا، ٹھیلے والا، بہاری بھیا وغیرہ وغیرہ ایسے کردار زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہوتے اس لیے اپنی مقامی بولی بولنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مان لیجیے کوئی سردار کردار ہے ان پڑھ، دیہات کا رہنے والا اُس کے منہ سے خالص پنجابی کے مکالمے کہلوایئے مگر حسب ضرورت۔ پنجابی مکالمہ لکھیے ساتھ میں اس کا ترجمہ اردو میں دیجیے اگر آپ بریکٹ میں اردو ترجمہ نہیں دیں گے صرف خالص پنجابی لکھ دیں گے وہ کافی نہ ہوگا۔ جب آپ کا افسانہ حیدرآباد میں پڑھا جائے گا۔ بنگال میں پڑھا جائے گا وہ پنجابی زبان سمجھ نہ پائیں گے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ آپ کا پنجابی مکالمہ سمجھنے کے لیے قاری بنگال میں کسی پنجابی کو ڈھونڈھے گا ظاہر ہے آپ کی تخلیق ناپسندیدگی کا شکار ہوجائے گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ مقامی زبان کے مکالموں کے ساتھ اردو میں اس کا ترجمہ دیا جائے تاکہ اردو والے بات سمجھ سکیں۔ کچھ زیادہ پڑھے لکھے افسانہ نگار آدھا افسانہ انگریزی کے جملوں سے بھر دیتے ہیں یہ مانا کہ انگریزی زبان ہر مقامی و غیر مقامی زبان میں سیندھ لگا چکی ہے آج ہر کوئی اپنی بول چال میں انگریزی جملے استعمال کرنا پسند کرتا ہے۔ ہمارا معاشرہ انگریزی بولنے کو ہائی سوسائٹی کی نشانی سمجھتا ہے۔ اپنا اسٹیٹس اونچا کرنے کے لیے لوگ بلاوجہ انگریزی زبان کے جملے استعمال کرتے ہیں کئی عام جملے ہماری روزمرہ زندگی میں ہماری گفتگو کا حصہ بن چکے ہیں۔ جیسے آئی لو یو (I love you) اس جملے کو کون نہیں سمجھتا۔ اَن پڑھ آدمی بھی اس کا مطلب جانتا ہے۔ فلموں نے ہمیں بہت کچھ سکھا دیا۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو (Happy Birthday to you) بائی گاڈ (By God) کون نہیں سمجھتا؟ آئی ایم سوری (I am Sorry) بھی سب جانتے ہیں۔ مکالموں میں ایسے جملوں کا ترجمہ کرنا شاید ضروری نہیں ان جملوں کو اگر اردو میں ہی لکھ دیا جائے تو بہتر ہے کیوں کہ یہ جملے ہماری زبان کا حصہ بن چکے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے الفاظ ہیں جیسے بیوٹی فل، اسمارٹ، فیٹ، شٹ اَپ، کیش، فول، سٹرانگ اور سائین وغیرہ ایسے الفاظ کو ہم مکالموں میں اردو رسم الخط میں لکھ دیں تو بہتر ان کے ترجمہ کی ضرورت نہیں۔ یہ عام فہم جملے اور الفاظ ہیں۔ اگر ہمارے کردار این آر آئی ہیں۔ ظاہر ہے وہ مکالموں میں انگلش کے جملے زیادہ بولیں گے۔ ان کا انگریزی میں زیادہ جملے بولنا حق ہے، ان کے کردار کی صحیح عکاسی یہی ہے۔ وہ ایسا ہی بولیں گے۔ مگر ساتھ ساتھ بریکٹ میں ترجمہ کرتے جائیے۔ ممکن ہے آپ کا قاری زیادہ پڑھا لکھا نہ ہو ان مکالموں کو نہ سمجھ پائے۔ مگر خیال رہے۔ کردار کا تعارف، راوی کا بیان منظر نگاری یعنی راوی کی زبان کسی طرح سے انگریزی نہ ہو ورنہ افسانہ اردو زبان کے دائرے سے نکل جائے گا۔ مکالموں کا بریکٹ ترجمہ ضرور کیجیے ورنہ آپ کے مکالمے معمہ بن کر رہ جائیں گے۔ انگریزی کے علاوہ علاقائی زبان کا بھی بریکٹ میں ترجمہ ضروری ہوجاتا ہے۔ ترقی پسندی کے زمانے میں اس بات کو کسی نے

سمجھا ہی نہیں تھا۔ منٹو چونکہ پنجابی تھے اس لیے پنجابی کے الفاظ بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ کبھی بریکٹ میں ترجمے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بشن سنگھ ایک جگہ کہتا ہے درفٹے موہنہ۔ غیر پنجابی اس کو کیا سمجھے گا، اس بات سے انکار نہیں کہ علاقائی مکالمے کردار کی اپنی مادری زبان ہوتی ہے۔ یہ کردار کی خوبصورتی سمجھیے کہ ان کی زبان ان کے مونہہ میں رکھ دی جائے مگر یہ مکالمے عام فہم ہوں۔ منٹو نے ٹھنڈا گوشت میں مایا اور بھین یا الفاظ استعمال کیے مگر اس کا ترجمہ بریکٹ میں نہیں دیا گیا۔ یہ سوچ لیا جائے کہ منٹو سمجھتے تھے کہ وہ صرف پنجاب کے لیے افسانے لکھ رہے ہیں اور ان کا قاری صرف پنجابی ہوگا۔ مایا۔ بھین یا دو گالیاں ہیں ماں اور بہن کی بلکہ گندی گالیاں ہیں جو دوآبہ یعنی جالندھر اور امرتسر کے علاقے کے لوگوں کا تکیہ کلام ہے۔ چونکہ منٹو امرتسر میں پلے بڑھے اس لیے اس علاقے کا ان کے افسانوں پر کافی گہرا ہے۔ جو ان کی استعمال کردہ پنجابی زبان سے ظاہر ہے۔ افسانہ تخلیق کرتے وقت ہمیں یہ احساس ہونا چاہیے کہ ہم اردو زبان میں اردو والو ں کے لیے افسانہ تخلیق کر رہے ہیں چاہے وہ دنیا کے کسی بھی خطے کا رہنے والا ہو۔ اس بات کی خوشی ہے کہ دور حاضر کے بیشتر افسانہ نگاروں نے اس بات کو سمجھا ہے۔ وہ قاری کی سہولت کے لیے بریکٹ میں ترجمہ دیتے ہیں۔ نہ وہ اپنے کرداروں کو مایوس کرتے ہیں نہ قارئین کو۔ بہرکیف ہمیں مکالمے کی اہمیت کو سمجھنا چاہیے مکالمہ افسانے کا اہم جز ہے جو تخلیقی عمل کے دوران ہماری خاص توجہ کا محتاج ہے۔

میں پنجاب کے ایک گھبرو جوان جیتے کی زندگی کے ایک پہلو پر افسانہ لکھ رہا تھا۔ جیتا پنجاب کا یک دیہاتی اور اَن پڑھ لڑکا تھا۔ تخلیقی عمل کے دوران میں نے ان کے مونہہ میں ایک مکالمہ رکھا تو وہ بولا ہی نہیں۔ خاموش ہوگیا۔ میں نے اُسے گھور کر دیکھا اور ڈانٹا 'جیتے—! بول— بولتا کیوں نہیں بھائی—!؟''

وہ غصہ سے مجھے گھورتا رہا میں نے اُسے پھر ڈانٹا۔

''میاں بولو— لب کشائی کرو—''

جیتا تقریباً چیخ اٹھا '' کی بولاں— سو واہ (کیا بولوں— خاک!!'' تُس اپنی بولی میرے مونہہ وچ رکھ دتی— میں تو نئیں بولیا جاندا'' (آپ نے اپنی زبان میرے مونہہ میں رکھ دی۔ مجھ سے بولا نہیں جارہا!'')

''اَیمیں پنجابی پنڈو بندے ہاں— سانوں ساڈی جبان دیئو!'' (ہم پنجابی دیہاتی بندے ہیں— ہمیں ہماری زبان دو)۔ مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے اردو فارسی سے گھڑے ہوئے مکالمے کاٹ دیئے اور پنجابی اردو میکس زبان جیتے کے مونہہ میں رکھ دی وہ طوطے کی طرح بولنے لگا اور خوش ہوکر بھنگڑا ناچنے لگا اور اس طرح میرا تخلیقی کام مکمل ہوگیا۔

سعادت حسن منٹو اپنے کرداروں سے بہت پیار کرتے تھے۔ اپنے کرداروں کی ذرا سی تکلیف ان کو برداشت نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنے کردار کے مونہہ میں اس کی حیثیت کے مطابق زبان رکھ دیتے تھے۔ کردار جی اٹھتا تھا۔ ان کے کردار آج بھی زندہ ہیں۔ مثلاً ٹوبہ ٹیک

سنگھ کا بشن سنگھ یوں کہیے کہ امر ہوگیا۔ وہ ایک پاگل تھا اور ایک پاگل کے مونہہ میں استاد منٹو نے اس کی اپنی ہی زبان رکھی۔ ملاحظہ ہو:

''اوپڑی دا گڈ گڈ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی لالٹین آف دی درفٹے مونہہ'' کیونکہ وہ یعنی بشن سنگھ دیہاتی آدمی تھا پنجابی تھا اور پاگل بھی اوپر دیا گیا مکالمہ کس قدر جامع ہے ایسی بات جس کا کوئی مطلب نہ ہو کوئی معنی نہ ہو ایک پاگل ہی کرسکتا ہے۔ اس مکالمے میں الفاظ پنجابی زبان کے ہیں مگر ایک دوسرے سے ان کا کوئی تعلق نہیں کوئی مطلب نہیں۔ بے دھیانہ۔ منگ دی دال۔ آف دی لالٹین وغیرہ بالکل بے ترتیب اور پریشان کن مکالمہ ہے میں سمجھتا ہوں یہی کہانی کی خوبصورتی ہے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ منٹو کے منتخب افسانوں میں سے ایک ہے۔ مکالمہ کردار کے عین مطابق ہے اس کے مونہہ میں رکھنا منٹو کے بہترین اسلوب کی مثال ہے۔ منٹو کردار کے مونہہ میں کبھی اپنی زبان نہیں رکھتے تھے۔ اس معاملے میں منٹو اپنے ہم عصروں میں سب سے آگے تھے۔ منٹو یہی زیادتی کرتے تھے کہ پنجابی مکالموں کا بریکٹ میں ترجمہ نہیں دیتے تھے۔ ایک افسانے میں منٹو استعمال کرتے ہیں کہ اس کی بھمیری بھل گئی۔ (یعنی حواس باختہ ہوگیا)۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ افسانے کی ہیئت میں مکالمہ ایک اہم جز ہے جو افسانے کو سنوار بھی دیتا ہے اور بدنما بھی بنا دیتا ہے۔ مکالمہ بہرحال ہمارے افسانوی کرارو ں کے اظہار کا ذریعہ ہے جس کے ذریعے ہم اپنے کردار کی ذہنی سوچ اُس کی نفسیات کا اظہار کرتے ہیں۔ مکالمے کو تخلیق کرتے ہوتے ہیں۔ سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ مکالمہ طویل تو نہیں، لمبا مکالمہ افسانے پہ بوجھ بن جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ مکالمے بلا وجہ اور کثرت سے تو نہیں تخلیق ہوگئے؟ مکالمے کم سے کم مختصر اور جامع ہونا ضروری ہیں۔ ہمارا مقصد افسانے کے کرداروں کی اندرونی کیفیت اندرونی خوشی اندرونی کشمکش کا اظہار ہے۔ اگر آپ کا مقصد کم سے کم مکالمے پورا کرتے ہیں تو مکالموں کی بھرمار کی ضرورت نہیں۔ مکالمے بامقصد اور کم سے کم ہی ہونا بہتر ہے۔ باقی دیگر سب سے بڑی اور اہم بات یہ کہ اپنے کردار کی حیثیت اُس کی نفسیات، عمر اور قابلیت کے مطابق اُس کے مونہہ میں زبان رکھیے اگر زبان دینے میں کمی بیشی ہوگئی تو افسانے کی مقبولیت پہ اثر انداز ہوسکتی ہے۔ اس بات پہ جوگندر پال نے بھی اکثر و بیشتر زور دیا ہے کہ کردار کے مطابق اس کے مونہہ میں زبان رکھیے۔ اس کے لب و لہجے کے مطابق بات کہلوایئے۔ آج کل کئی ایسے دوست افسانہ نگار ہیں جو ہر کردار کے مونہہ میں اپنی زبان رکھ دیتے ہیں۔ آپ کو کوئی نہیں کہے گا کہ آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں ہر آدمی مصروفیت کی صلیب پہ لٹکا ہوا ہے کسی کو فرصت نہیں کہ آپ کی اصلاح کرے آپ کو افسانے کے رموز کے بارے میں روشناس کروائے۔ آپ کو اپنی اصلاح خود ہی کرنا ہوگی۔

Mohd Bashir Malerkotlvi, Retd. Estate Officer Near Urdu Academy, Delhi Gate, Malerkotla - 148023 (PB) INDIA

عارف حسین جونپوری

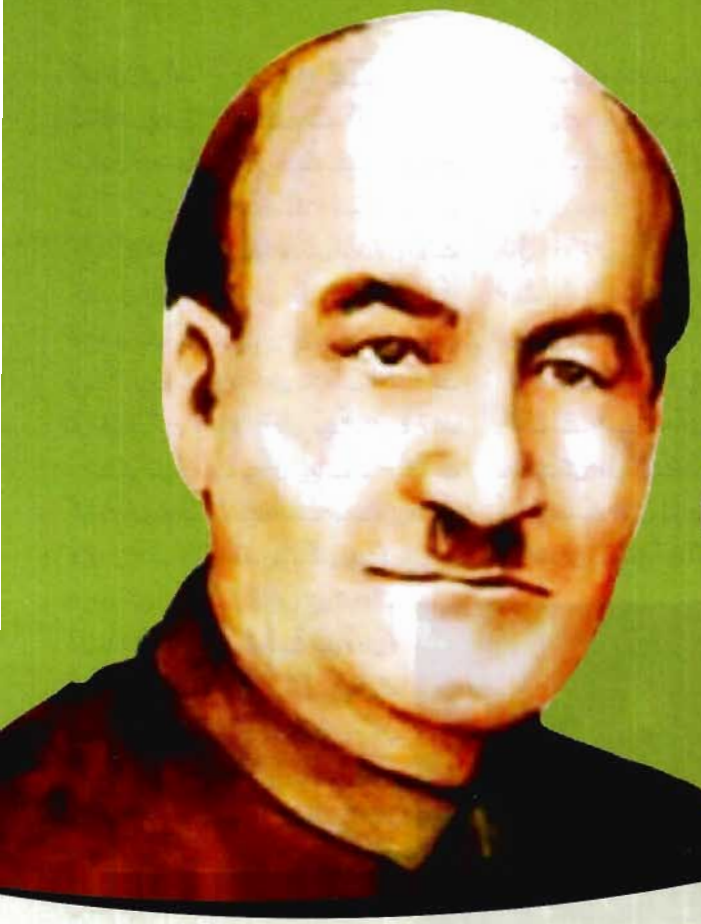

جوش ملیح آبادی کے مرثیے

صنف مرثیہ کا ذکر آتے ہی واقعۂ کربلا کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔ اردو میں مرثیہ اپنی ابتدا ہی سے واقعۂ کربلا سے منسلک ہوگیا۔ میر تقی میر سے عہد حاضر تک مرثیہ لکھے جاتے رہے ہیں۔ شخصی مرثیے بھی لکھے گئے اور اکثر شخصی مرثیے بہت مشہور بھی ہوئے ہیں مرثیے کا ایک اچھا خاصا حصہ واقعۂ کربلا کے ظلم و جور کی داستان بیان کرتا ہے۔ مرثیہ آج بھی ایک زندہ اور متحرک صنف سخن ہے۔ واقعۂ کربلا کے ذکر کے لیے اس کی ضرورت آج بھی قائم ہے۔ انیس و دبیر نے اس صنف کو ایسی بلندی سے ہمکنار کیا کہ آج یہ ادب و زبان کے ارتقا میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ انیس نے مرثیے کو نئے الفاظ، تراکیب، استعارے اور زبان و بیان کی ان نزاکتوں سے مالامال کیا۔ بلکہ اپنے مرثیوں میں اخلاق و انسانیت، انسانی اقدار اور تہذیب کے وہ معیار قائم کردیے ہیں جو آج اہل نظر کے لیے سرمۂ نظر بنے ہوئے ہیں۔ دبیر بھی انیس کے ہی میدان فکر کے رہرو ہیں اب ان دونوں شاعروں کے بعد ان کی پیروی تو خوب کی گئی ہے مگر ان کے جیسا فکری اجتہاد نظر نہیں آیا۔

شاہان اودھ اور ان کی مصنوعی تہذیب انیس و دبیر کی زندگی میں ہی روبہ زوال ہوچکی تھی اس لیے اس تہذیب کے آنگن میں مرثیے کا ارتقا کوئی خاص بات پیدا نہ کرسکا۔ یوں بعد کے شعرا نے بھی زبان و بیان منظر نگاری اور فصاحت و بلاغت کے جوہر دکھائے ہیں مگر وہ انیس و دبیر کی شاہراہ پر ہی گامزن رہے اس لیے وہ مرثیے کی تاریخ کا حصہ نہ بن سکے۔

جدید مرثیے کا دور جوش ملیح آبادی سے شروع ہوتا ہے۔ جوش یقیناً واقعۂ کربلا سے متاثر تھے اس کے سیاسی اور فکری پہلو سے آشنا تھے۔ مذہبی اعتبار سے وہ اس واقعہ کے محرکات اور نتائج سے واقف تھے۔ انھیں یہ معلوم تھا کہ واقعہ کربلا کیوں وقوع پذیر ہوا اور اگر یہ حادثہ نہ ہوتا تو پھر مذہب اسلام میں کیا کمی رہ جاتی یا کمی ہوجاتی۔ جوش ملیح آبادی نے علامہ اقبال اور محمد علی جوہر سے تاثر لیا ان کی حریت پسند شاعری کے کربلائی استعاروں سے اپنے مرثیے میں جذبۂ حریت پیدا کیا۔

جوش ملیح آبادی محمد علی جوہر اور اقبال کی فکری روش سے آگاہ تھے۔ انیس و دبیر اور اس عہد کی شاندار روایات ان کے سامنے تھیں ان کے دور تک شاعری کا مزاج بدل چکا تھا۔ شاعری کے مقاصد اور تقاضے بدل چکے تھے، لہٰذا انھوں نے اپنے مزاج کے مطابق مرثیہ کو ہیئت تو نہیں اظہار کے نئے سانچہ میں ڈھالا۔ انھوں نے اپنے عہد کے مسائل کا حل واقعۂ کربلا میں ڈھونڈا اور اُس سے عوام کے ذہن میں رجائیت کی لہریں مرتعش کرنے میں کامیاب رہے۔ ان کا پہلا مرثیہ 'آوازۂ حق' ہے جو 1918 میں کہا گیا اس وقت ہندوستان کی جنگِ آزادی اپنے شباب پر تھی جوش نے جدوجہد آزادی کی اس رزم آرائی کو 'تازہ کربلا' کا عنوان دیا:

اے قوم وہی پھر ہے تباہی کا زمانہ
اسلام ہے پھر تیر حوادث کا نشانہ
کیوں چپ ہے اُسی شان سے پھر چھیڑ ترانہ
تاریخ میں رہ جائے گا مردوں کا فسانہ
مٹتے ہوئے اسلام کا پھر نام جلی ہو
لازم ہے کہ ہر شخص حسین ابن علیؑ ہو

جوش کا دوسرا مرثیہ 'حسینؑ اور انقلاب' 1941 میں منظر عام پر آیا۔ 1941 بھی ملک کی جدوجہد آزادی کا اہم موڑ ہے۔ جوش نے کردار امام حسینؑ اور واقعۂ عظیم کو ایک نئی نظر سے دیکھا۔ عوام میں جوشِ حریت پیدا کرنے کے لیے حسینؑ اور کربلا کے استعارے کو پہلی بار استعمال کیا:

تاریخ دے رہی ہے یہ آواز دم بدم
دشت ثبات و عزم ہے دشت بلا و غم
صبر مسیحؑ و جرأت سقراط کی قسم
اس راہ میں ہے صرف اک انسان کا قدم
جس کی رگوں میں آتش بدر و حنین ہے

اُس سورما کا اسم گرامی حسینؑ ہے

جو کاروانِ عزم کا رہبر تھا وہ حسینؑ
خود اپنے خون کا جو شناور تھا وہ حسینؑ
اک دین تازہ کا جو پیمبر تھا وہ حسینؑ
جو کربلا کا داور محشر تھا وہ حسینؑ

جوش کا یہ مرثیۂ حسینؑ اور انقلاب مرثیے کی روایت کے ساتھ ہی سماج اور سیاست کی دنیا میں بھی انقلاب انگیز ثابت ہوا۔ عوام نے پہلی بار یہ محسوس کیا کہ کربلا کے ذکر سے ذہنوں میں کس طرح انقلاب لایا جاسکتا ہے۔

1941 میں عالمگیر جنگ اور ہندوستان کی تحریک آزادی دونوں اپنے شباب کی منزل میں تھیں۔ جوش نے اُس وقت قوم کو راہ عمل متعین کرنے کے لیے کربلا کے پس منظر سے آواز دی۔ جوش نے جب پہلی بار اس مرثیے کو امام باڑۂ آصفی لکھنؤ میں پیش کیا تو مجلس کا منظر جوش کی زبانی سنیے:

''حسینؑ اور انقلاب سننے کے لیے پورا ادبی لکھنؤ ٹوٹ پڑا تھا۔ امام باڑے میں تل دھرنے کی بھی جگہ باقی نہ تھی۔ لکھنؤ کے تمام شعرا تمام اساتذہ یہاں تک کہ مولانا صفی بھی تشریف لائے اور اس مجلس میں فقط شیعہ ہی نہیں، اہل سنت اور ہندو بھی شامل ہوئے تھے۔ چونکہ اس مسدس میں آہ وفغاں پر زور دینے کے بدلے، ایثار اور کردار حسینؑ پر عمل کرنے کی پہلی بار ترغیب دی گئی تھی اس لیے ارباب مجلس نے بالعموم اور اعیان سیاست نے بالخصوص بار بار کھڑے ہو کر اس جوش وخروش سے داد دی تھی کہ ان کی آواز کے تھپیڑوں سے منبر میں جنبش پیدا ہوگئی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سامعین اپنے گریبان پھاڑ کر میدان جنگ میں کود پڑیں گے۔'' (یادوں کے بارات، ص 261)

یہ مرثیہ اتنا مقبول ہوا کہ اکثر لوگوں کی زبانوں پر اس کے مصرعے اور بیت کیا پورا بند ہی جاری ہوگیا اور یہ سلسلہ آج بھی قائم ہے شب عاشور خیام حسینؑ کی منظر کشی جوش نے اپنے منفرد انداز سے اس طرح کی ہے:

وہ اہل حق کی تشنہ دہاں، مختصر سپاہ
باطل کا وہ ہجوم کہ اللہ کی پناہ
وہ ظلمتوں کے دام میں زہرا کے مہر و ماہ
تارے وہ فرطِ غم سے جھکائے ہوئے نگاہ
وہ دل بجھے ہوئے وہ ہوائیں تھمی ہوئی
وہ اک بہن کی بھائی پہ نظریں جمی ہوئی

وہ رات وہ فرات وہ موجوں کا خلفشار
عابد کی کروٹوں پہ وہ بے چارگی کا بار
وہ زلزلوں کی زد پہ خواتین کا وقار
اصغرؑ کا پیچ و تاب وہ جھولے میں بار بار
اصغرؑ میں پیچ و تاب نہ تھا اضطراب کا
وہ دل دھڑک رہا تھا رسالت مآب کا

ہاں وہ حسینؑ جس کا ابد آشنا ثبات
کہتا ہے گاہ گاہ حکیموں سے بھی یہ بات
یعنی درون پردۂ صد رنگ کائنات
اک کارساز ذہن ہے اک ذی شعور ذات
سجدوں سے کھینچتا ہے جو معبود کی طرف
تنہا جو اک اشارہ ہے معبود کی طرف

اس مرثیہ میں اکثر مصرعے اور شعر اک بھرپور اور واضح اکائی کی حیثیت رکھتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح اس قربانیِ عظیم کی مکمل تشریح کرتے ہیں اور شعری حسن کا اعلیٰ نمونہ بھی ہیں:

بکھرے ہوئے ہوا میں وہ گیسو رسول کے
تاروں کی روشنی میں وہ آنسو بتول کے
سوزاں ہے قلب خاک جو خون مبین سے
اک لو نکل رہی ہے ابھی تک زمین سے

'حسین اور انقلاب' کے بعد جوش کا مرثیہ موجد و مفکر جو 115 بند پر مشتمل ہے۔ 1956 میں شائع ہوا۔ ظاہری بات ہے کہ ملک کی آزادی کے 9 سال کے بعد یہ مرثیہ اُس وقت سامنے آیا جب ملک کی آزادی اور تقسیم کے بعد کا بحرانی دور اعتدال پر آچکا تھا۔ اس مرثیے کے عنوان 'مسکرا کر جب ہوئی طالع تمدن کی سحر' سے ہی ظاہر ہے کہ اس مرثیے میں نسل انسانی کے تہذیب وتمدن کے مدارج طے کرنے کی بات کی گئی ہے اور یہ تہذیب وتمدن کا ارتقا جب اپنے معیار سے پستی کی طرف گامزن ہونے لگا تو پھر حسینؑ اور کربلا کی ضرورت پیش آئی اور اس طرح جوش نے نسل انسانی کی تاریخ کے ساتھ واقعۂ کربلا کی اہمیت کو مربوط کردیا اور پھر جب شاعر براہِ راست واقعات کربلا کے محرکات سے ذہنوں کو آشنا کرتا ہے تو پھر اس طرح کہ:

وہ نہ تھا افتادِ طشت حق کا صوتی ارتعاش
مصطفےٰ سے دشمنی کا وہ ہوا تھا راز فاش
خیمۂ شبیرؑ کو گھیرے نہیں تھے بدقماش
گردن حق کے لیے تھی ریسماں کی وہ تلاش
اشقیا جھپٹے نہ تھے ابن شہ لولاک پر
اصل میں بت آستینوں سے گرے تھے خاک پر

اور اس کے بعد جوش پھر اپنے اصل موضوع پر آجاتے ہیں یعنی حسینؑ اور واقعۂ کربلا سے قوم میں بیداری کی لہر موجزن کرنے کی طرف:

کچھ خبر بھی ہے محبان حسین دور ہیں
موت ہے شبیریت کے دائرے میں آنکیں
اتباع مرشد حق پرور و عہد آفریں
کاروبار مرگ ہے بازیچۂ طفلاں نہیں
زہر سے لبریز ہے جام حسینؑ ابن علیؑ
جان دینا ہو تو لو نام حسین ابن علیؑ

رعب سلطانی کو ٹھکراؤ تو لو نام حسینؑ
بولتے رن میں نہ گھبراؤ تو لو نام حسینؑ
دشمنوں کی پیاس بجھواؤ تو لو نام حسینؑ
موت کی چھاتی پہ چڑھ جاؤ تو لو نام حسینؑ
حلق سے تینوں کا منھ موڑو تو لو نام حسینؑ
برگ سے فولاد کو توڑو تو لو نام حسینؑ

خود کو تینوں کی طرف ریلو تو لو نام حسینؑ
مسکرا کر آگ سے کھیلو تو لو نام حسینؑ
جملہ ممکن سختیاں جھیلو تو لو نام حسینؑ
اوّل اپنا امتحاں لے لو تو لو نام حسینؑ
ہاں پرکھ لو خوب ہمت کو تو لو نام حسینؑ
جانچ لو اپنی شرافت کو تو لو نام حسینؑ

اور پھر عظمت حسینی کا اور اک عظمت انسانی کے پس منظر میں اس طرح کرتے ہیں:

کردیا تو نے یہ ثابت اے دلاور آدمی
زندگی کیا موت سے لیتا ہے ٹکر 'آدمی'
کاٹ سکتا ہے رگِ گردن سے نجر آدمی
لشکروں کو روند سکتے ہیں بہتر آدمی
ضعف ڈھا سکتا ہے قصرِ افسر و اورنگ کو
آبگینے توڑ سکتے ہیں حصار سنگ کو

اور آخری بند میں آشوب روزگار کا ذکر کرتے ہوئے حسینؑ سے اس طرح مدد کے طالب ہوتے ہیں:

دیکھ پھر قعرِ جہنم بن چکا ہے روزگار
آنچ میں غلطیدہ ہے پھر خیمۂ لیل و نہار
سرزمیں پر حکمراں ہے باہزاراں اقتدار
آتش و دود و دخان و شعلہ و برق و شرار
زندگی ہے برسرِ آتش فشانی یا حسینؑ
آگ دنیا میں لگی ہے آگ پانی یا حسینؑ

اس بند کی ہیئت شاہکار فکری تنوع رکھتی ہے امام حسینؑ کو دنیا نے پانی نہیں دیا۔ لیکن آج دنیا آتش فشاں مادّے پر کھڑی ہے اور اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے دنیا حسینؑ سے پانی کی طلب گار ہے۔ اس بیت میں آج کے سماج اور سیاسی پس منظر میں گہری معنویت پوشیدہ ہے۔

جوش کا پانچواں مرثیہ طلوع فکر 'جب چہرۂ افق سے اٹھی سرمئی نقاب' کے عنوان سے ہے۔ یہ دراصل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یوم ولادت پر پیش کی گئی منقبت ہے اور قصیدہ بر ہیئت مسدس کے ذیل میں آتی ہے لیکن جوش کے کلام کے مرتبین نے اس کو بھی مرثیے کے ذیل میں شامل کردیا۔ مرثیے میں بہرحال مصائب کے چند بند ہونے چاہییے۔ اگرچہ وہ پیغام عمل ہی کیوں نہ ہو جوش کا منقبتی مسدس اگرچہ شاہکار ہے مگر چونکہ میں اس کو مرثیے کے ذیل میں نہیں جانتا اس لیے ہم جوش کے دیگر مراثی کی طرف ذہن مرکوز کرتے ہیں۔

جوش کا چھٹاں مرثیہ عظمت انساں 88 بند پر مشتمل ہے۔ 'اے قلم، چوب خضر، حبل متین ارشاد' مصرع اس مرثیے کا عنوان ہے۔ اس مرثیے کا آغاز قلم کے قصیدے سے شروع ہوتا ہے:

اے قلم چوب خضر حبل متین ارشاد
شانۂ گیسوئے خم دار عروس ایجاد
قلزم وقت میں تو زمزمۂ باد مراد
تیری تاریخ میں بیتی ہوئی صدیاں آباد
کرۂ خاک صد انوار و صد آثار کے ساتھ
رقص میں ہے تیری پازیب کی جھنکار کے ساتھ

جوش نے اپنے ہر مرثیے کی ابتدا کسی نہ کسی موضوع سے کی ہے پہلے مرثیے کا چہرہ شاعر غم زمانہ غم جاناں یا واقعۂ کربلا یا حیات انسانی کے کسی ایک رخ سے سرخ رو کرتا تھا مگر جوش نے بدلتے ہوئے نظام زندگی اور حیات کے نئے تقاضوں کے پیش نظر اپنے مرثیوں کے لیے مواد نیا تلاش کیا۔ 'زندگی اور موت' محمود آل احمدؔ کی نظر میں' ان کا ایک اہم مرثیہ ہے 86 بند پر مشتمل یہ مرثیہ 'ہاں انا ہے وہ دبیر نفس و دارائے حیات' سے شروع ہوتا ہے جس میں انسان کی خاص فطرت انا اور غرور پر جوش نے فلسفیانہ طرز گفتار اختیار کیا ہے:

ہاں انا ہے وہ دبیر نفس دارائے حیات
شور جس کا گرم دن گل بانگ جس کی سردرات
جس پہ مبنی جذبۂ حفظ حیات و حب ذات
کیا زمیں کیا آسماں جس کی جلو میں کائنات
کج اسی کے بانکپن سے ہے کلاہِ زندگی
یہ رسولِ ذہن و انساں ہے الہ زندگی

'انا' کے بعد اس مرثیے میں جوش نے موت کے بارے میں جو منفی اور مثبت خیال ہوسکتے تھے اپنی انفرادی فکر سے مزین کیا ہے۔ لیکن موت کسی طرح شیریں بن سکتی ہے یہ کربلا کے ذیل میں بہت ہی اثر انگیز طریقے پر بیان کیا ہے:

اے محمدؐ اے سوارِ توسنِ وقت رواں
اے محمدؐ اے طبیب فطرت نباض جاں
اے محمدؐ اے فقیہِ نفس و نقاد جہاں
موت کو تو نے وہ بخشی آب و تاب جاوداں
زندگانی کے پجاری موت پر مرنے لگے
لوگ پیغام اجل کی آرزو کرنے لگے

خلق کو تو نے، تمنائے شہادت بخش دی
اس تمنائے شہادت نے شجاعت بخش دی
پھر شجاعت نے بھڑکنے کی حرارت بخش دی
اس حرارت نے گداؤں کو حکومت بخش دی
اس قدر عجلت سے گوروئے زمیں پر چھا گیا
مدعی چکرا گئے تاریخ کو غش آگیا

جوش کا آٹھواں مرثیہ 'ہاں اے صباح طبع شب تار سے نکل' پانی کے عنوان پر ہے۔ 59 بند کا یہ مرثیہ 1971 میں تصنیف ہوا:

ہاں اے صباح طبع شب تار سے نکل
اے فکر سوئے آب خضر گنگنا کے چل
اے کلک نغمہ بار برستی گھٹا میں ڈھل
اے چشمۂ تخیل برگ آفریں ابل
جس میں ہو رقص و رنگ و روانی کی داستاں
اے دل کی آگ چھیڑ وہ پانی کی داستاں

25 بند صرف پانی کی مدح میں کہے گئے ہیں۔ مختلف ماہیت، مزاج، قسم اور نہ جانے کتنے گوشے، جوش نے پانی کے وصف بیان کرنے میں لکھ دیے۔ یہ انھیں کا حصہ ہے۔ انیس کے بعد ایک رنگ کا مضمون ہوتو سو رنگ سے باندھوں، کہنا انھیں کو زیب دے گا۔

جوش کا نواں مرثیہ بعنوان 'آگ' ہے۔ آگ یعنی سوز خلوت پرور و جلوت نواز' مصرعہ اوّل ہے۔ اس مرثیے میں صرف 9 بند ہیں اور 1959 میں تصنیف ہوا۔ یہ مرثیہ مکمل تصنیف ہوا تھا مگر جوش کے پاس اس کا مسودہ نہ رہا۔

جوش کے مراثی، انیس و دبیر کے مراثی کے بعد کئی طرح سے اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جوش نے مرثیے کے عنوان کو موضوع کے اعتبار سے مکمل طور پر برتا یہ اُن کی جولانی طبع تھی کہ انھوں نے آگ، پانی، موت، زندگی، وحدتِ انسانی اور انسانی نفسیات کی ساری گتھیاں مدنظر رکھتے ہوئے ایسے موضوع کو ایسی بلندی عطا کردی کہ اُس کے بعد کسی جدید مرثیہ گو کے یہاں یہ لوازمات نہیں ملتے۔ حتیٰ کہ جمیل مظہری، نسیم امروہوی اور علامہ نجم آفندی بھی اس صف میں نہیں کھڑے ہوسکتے وجہ صاف ہے کہ جوش کی قوت اظہار میں جو بے باکی ہے وہ کسی کو نصیب نہیں اور جس آزادانہ فکر کے ساتھ وہ میدان عمل میں آتے ہیں وہ بھی کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہے۔ ان کے مسدس طلوع فکر کا مقطع ہی ان کی آزادانہ سوچ اور دل گردے کی مضبوطی کا مظہر ہیں اس طرح تو میر انیس بھی نہیں کہہ سکے:

لے وہ نجف کی سمت سے آنے لگی صدا
اے جوش نکتہ سنج میری انجمن ہی آ
آ اور جھوم جھوم کے نغمات تو سنا
ساقی میرا سلام ادب سے کہ میں چلا
مولائے کائنات اور آواز دے مجھے
اے جبریل قوت پرواز دے مجھے

■

Arif Husain Jaunpuri, Mohd Sahadarper West, Station Road, Pratapgarh - 230001 (UP)

تلوک چند محروم
کی شاعری میں
حب الوطنی

قاضی حبیب احمد

حب الوطنی کے موضوع پر اردو میں جن شعرا نے لکھا ہے ان میں چکبست کے بعد سب سے زیادہ اہمیت تلوک چند محروم کو حاصل ہے۔ محروم نے 1960 میں اپنی وفات سے چھ برس پہلے اپنی قومی نظموں کا مجموعہ 'کاروانِ وطن' شائع کیا تھا جو 188 نظموں پر مشتمل ہے۔ ایسی انفرادیت قومی شاعری میں کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ کاروانِ وطن کے مقدمے میں فراق گورکھپوری یوں رقم طراز ہیں:

''حضرت محروم کسی ایسے موضوع کو ہاتھ میں نہیں لیتے، جو ان کے دل کے قریں نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ حب الوطنی کی یہ اعلیٰ نظمیں ہیجان، تعصب اور جذباتیت سے پاک صاف ہیں۔ دھیمے دھیمے سوز و گداز، نرمی اور غنائیت کے طفیل ان میں سے بیشتر نظمیں ذہن پر نقش ہو جاتی ہیں۔ یہ ایک گراں مایہ انسانی دستاویز ہے''۔

('کاروانِ وطن' تمہید، ص 14-13)

تلوک چند محروم کی پیدائش دریائے سندھ کے کنارے ایک قریہ میں ہوئی جو اب پاکستان میں ہے۔ یہ مقام علم و ادب سے قطعاً عاری تھا۔ محروم نے جو کچھ قابلیت بہم پہنچائی تھی، یہ ان کی شخصی کوشش اور اکتساب کا نتیجہ تھا ورنہ ان کے بچپن کا ماحول نہایت حوصلہ شکن تھا۔ مادری زبان ملتانی تھی۔ انھیں اپنے وطن کی اس تعلیمی کسمپرسی کا احساس ہے لیکن پھر بھی حب الوطنی کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، یہ شعر ملاحظہ ہو:

اپنے وطن کی شان میں کہتا ہوں چند شعر
ہر چند شعریت سے ہے عاری یہ سرزمیں
دوزخ عزیز اہلِ عقوبت کو ہو اگر
اہلِ جہاں ہمیں بھی ہے پیاری یہ سرزمیں

تعجب کی بات ہے کہ محروم نے اٹھارہ، انیس سال میں نہ صرف اردو زبان سیکھی بلکہ شعر کہنے لگے جس سے ان کی ذہانت، طبع رسا اور موزونیِ طبع کا پتہ چلتا ہے۔ انیس برس ہی کی عمر میں انھوں نے اپنی مشہور قومی نظم 'کاروان وطن' لکھی جس کا پہلا شعر ہی چونکا دینے والا ہے:

اے خدا وندِ مہ و مہر دعا ہے تجھ سے
اختر ہند کو ہم اوجِ ثریا کر دے

تلوک چند محروم نے اچھی مشق و مزاولت کے نتیجے میں بہت جلد منجھی ہوئی شاعری شروع کر دی اور مشہور رسالوں جیسے 'زمانہ' کانپور اور 'مخزن' لاہور میں اپنا کلام شائع کرانے لگے۔

محروم کو اپنے وطن سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ سیکولر روایات اور مشترکہ کلچر کے زبردست حامی اور پرچارک تھے۔ ان کی شاعری میں جابجا اس کا اظہار ہوا ہے۔ شروع میں انھوں نے اپنی غزلوں میں روایتی حسن و عشق کے مضامین لکھے۔ وقت کے ساتھ ان کے موضوعاتِ غزل میں بھی تنوع پیدا ہوا اور اسلوب میں بھی پختگی آئی۔ ان کی فکر و نظر کی سطح میں بھی تبدیلی آئی۔ اب وطن اور قوم سے محبت اور قومی عناصر کی پیشکش کے ساتھ ساتھ ایک آدھ قومی مسائل بھی ان کی شاعری کا حصہ بننے لگے۔ ناصحانہ، مصلحانہ، حکیمانہ اور فلسفیانہ خیالات در آنے لگے۔ محروم کی شاعری چاہے قومی نظمیں ہوں یا عشقیہ غزلیں دونوں میں ایک متانت اور وقار نظر آتا ہے۔ وہ اپنے اشعار کو آراستہ کرنے کے لیے استعاروں، کنایوں، تشبیہوں اور تمثیلوں سے بھی کام لیتے ہیں پھر بھی ان کے کلام میں روانی اور آمد کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان کے خیال اور اظہار میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ محروم اپنی زندگی میں جس قدر سادہ اور بے تکلف تھے، اسی طرح ان کی شاعری میں بھی ایک طرح کا بے ساختہ پن پایا جاتا ہے۔ ان کی غزلوں کے مجموعے 'شعلۂ نوا' پر تبصرہ کرتے ہوئے 'آثارِ محروم' میں فراق گورکھپوری یوں رقم طراز ہیں:

''محروم 'طوفانی جذبات' اور 'ہیجانی طوفان' کے شاعر نہیں۔ ان کی غزلوں کا کلاسیکی رکھ رکھاؤ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان غزلوں کا مطالعہ تعلیم کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کے بیشتر اشعار میں بہ یک وقت نغمگی اور اثر آفرینی پائی جاتی ہے۔''

محروم کی قومی شاعری کا یہ بڑا وصف ہے کہ انھوں نے اپنے دور کے اہم واقعات کو اپنی شاعری میں جذب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی پچاس سالہ شاعری میں انھوں نے ملک کے ہر بڑے سانحے کو موضوع بنا کر شعروں میں ڈھالا ہے۔

تلوک چند محروم نے جلیانوالہ باغ پر 'شکوۂ صیاد' کے نام سے ایک نظم لکھی۔ محروم اسے ایک قومی حادثہ قرار دیتے ہیں۔ اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

نغمۂ بلبلِ شیدا سے فقط لاگ نہ تھی
کون سا برگ وہ تھا جس کے لیے آگ نہ تھی

جلیانوالہ باغ کے پس منظر کو ایک اور نظم میں بھی انھوں نے پیش کیا ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں:

نادر کا قتل عام ہے مشہور آج تک
سفاک اس کا نام ہے مشہور آج تک
لیکن ہے جو نادرِ سفاک سے سوا
ڈائر کے قتل عام کا پُرہول ماجرا

محروم نے سدیشی تحریک اور ترک موالات پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔ بلا تخصیص مذہب و ملت شہیدانِ وطن کی خاک پر عقیدت کے پھول چڑھائے ہیں۔ ان کی ایک نظم 'ہندی نوجوانوں سے' میں انھوں نے اپنی شاعری کا فکری محور قومی یک جہتی کو قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

تو مسلم ہے کہ ہندو ہے غرض اس سے نہیں مجھ کو
محبت ہے وطن سے تجھ کو اتنا ہے یقیں مجھ کو
تری حالت نہ ہو حسرت فزا یاس آفریں مجھ کو
اگر مل جائے کچھ اس کا جوابِ دل نشیں مجھ کو
کیا ہے کیا وطن کے واسطے اے نوجواں تو نے

ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی اتحاد اور اخوت بڑھانے کے لیے محروم نے کئی نظمیں کہی ہیں۔ قحطِ ہند ہو یا قحط بنگال، محروم دل سوزی محسوس کرتے ہیں۔ مہاتما گاندھی کے برت پر مضطرب اور بے چین نظر آتے ہیں۔ شہیدانِ وطن کی یاد میں غمگین نظر آتے ہیں اور اپنی نظموں میں جابجا خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ چھوت چھات کی لعنت سے لوگوں کو متنبہ و خبردار کرتے ہیں۔ 'آزاد ہند' فوج کو 'ہندوستان کی فوجِ ظفر موج زندہ باد' کہتے ہیں:

تلوک چند محروم نے ملک کی آزادی تک انگریزوں کے خلاف قلم کا جہاد جاری رکھا تھا۔ جب ملک آزاد ہو گیا تو انھیں ایک الگ قسم کے کرب سے گزرنا پڑا۔ کیونکہ ملک آزاد ہونے کے بعد تقسیم ہو گیا تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کا جو شیش محل وہ زندگی بھر کی محنت سے تعمیر کر رہے تھے۔ آن کی آن میں چکنا چور ہو گیا۔ اُن کا آبائی قریہ گاجراں

پاکستان میں پڑتا تھا۔ تقسیم ملک کے دوران دنگے فسادات کا اثر تلوک چند پر بھی ہوا۔ بڑی مشکلیں جھیل کر وہ کسی طرح ہندوستان پہنچ پائے۔ وہ گاجراں سے اپنی نسبت اور جدائی سے بہت غمگین تھے۔ حب الوطنی کے جذبے سے ان کے یہ وداعی اشعار ملاحظہ ہوں:

آج اپنے وطن سے جارہا ہے محروم
مامن پیش نظر نہ منزل معلوم
ہنگامِ وداع ہم نے دیکھا اس کو
حسرت زدہ دل شکستہ حیراں مغموم

تقسیم ملک کے ہنگاموں کا ذکر تلوک چند نے اپنی نظم 'عتاب وطن' میں کیا ہے۔ اس میں ان مسلمانوں کا ذکر ہے، جنھوں نے اپنی جان پر کھیل کر ہندوؤں اور سکھوں کو بچایا تھا۔ قیامِ پاکستان پر اپنی دلی ناراضگی کے ساتھ کچھ سوالات اٹھا کر انھوں نے اس نظم کو استفہامیہ نظم بنادیا ہے۔

'کاروانِ وطن' میں تلوک چند محروم نے کئی مجاہدین جنگ آزادی پر بھی مستقل نظمیں لکھ کر انگریزوں کے ظالم پنجہ سے ملک کی رہائی کے لیے جدوجہد میں قلمی تعاون فراہم کیا ہے۔ انھوں نے جن مجاہدین آزادی پر لکھا ان میں سے چند یہ ہیں۔ مہاتما گاندھی، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، رفیع احمد قدوائی، سروجنی نائیڈو، لالہ لاجپت رائے، بھگت سنگھ وغیرہ۔ لالہ لاجپت رائے سے انھیں بہت عقیدت تھی اور ان پر کئی نظمیں لکھی ہیں۔

تلوک چند محروم سرکاری ملازم تھے، اس لیے انگریزوں کے خلاف کھل کر مخالفت نہیں کرسکتے تھے۔ اس لیے ان کی صدائے احتجاج اٹھتی ضرور تھی مگر حکام کے کانوں تک نہیں پہنچ پاتی تھی، ورنہ محروم بھی قید و بند کی اذیتیں اٹھانے پر مجبور ہوتے۔

تلوک چند محروم نے بہادر شاہ ظفر کی غزل کے اس مصرع 'اسیرو! کرو کچھ رہائی کی باتیں' پر ایک اچھی تضمین لکھی ہے جو بہت مقبول ہوئی۔ اس کے چند اشعار سنیے:

پر و بال اپنے اسیرو سنبھالو
اٹھو اور بھڑک کر قفس توڑ ڈالو
بگڑ جاؤ، پھندے سے گردن نکالو
بہم ہوکے بگڑی ہوئی کو بنالو
اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں
یہ صیاد ظالم ہے نامہرباں ہے
محبت جو چاہو تو اس میں کہاں ہے
دل آزاریوں میں یہ اک آسماں ہے
اذیت نئی، نت نیا امتحاں ہے
اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں
مری بات سن لو ادھر آؤ دیکھو
نہ وعدوں پہ صیاد کے جاؤ دیکھو
نہ کچھ آؤ دیکھو نہ کچھ تاؤ دیکھو
نکل جاؤ جب راستہ پاؤ دیکھو
اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں

اس نظم میں انھوں نے کئی استعارے استعمال کیے ہیں جو ان کے من پسند ہیں اور انھوں نے اپنی کئی دیگر نظموں میں بھی استعمال کیے ہیں جیسے صیاد، چمن، قفس وغیرہ، ان اشاروں کنایوں سے نظم کی خوبصورتی میں اضافہ ہوا ہے تو دوسری طرف یہ محروم کی مصلحت بھی تھی کہ وہ انگریز سامراج کے خلاف راست آواز نہیں اٹھا سکتے تھے۔

تلوک چند محروم کو اپنے وطن سے والہانہ محبت تھی اور

محروم کی قومی شاعری کلیہ بڑا وصف ہے کہ انھوں نے اپنے دور کے اہم واقعات کو اپنی شاعری میں جذب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی پچاس سالہ شاعری میں انھوں نے ملک کے ہر بڑے سانحے کو موضوع بناکر شعروں میں ڈھالا ہے۔

اس کا اظہار ان کی تقریباً ہر نظم سے ہوسکتا ہے۔ چاہے نظم کسی بھی موضوع پر ہو ایک آدھ شعر وہ اس میں حب الوطنی کا بھی رکھ دیتے تھے، ظفر کی تضمین والی مذکورہ نظم میں بھی حب الوطنی کے اشعار پائے جاتے ہیں، دو بند ملاحظہ ہوں:

پھر آئی ہے گلشن میں فصلِ بہاری
شہ گل کی اتری ہے آکر سواری
کہیں زلف سنبل نے اپنی سنواری
کہیں چشمِ نرگس میں ہے بے قراری
اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں

چمن کیا ہے معشوق گل پیرہن ہے
نرالی ہے سج دھج انوکھی پھبن ہے
بنی شاخ شاخِ شجر اک دلہن ہے
وہی دلربائی وہی بانکپن ہے
اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں

تلوک چند محروم کی شاعری میں حب الوطنی کے عناصر کے طور پر ہمیں یہاں کی تہذیب وتمدن، اساطیر و دیومالا اور تاریخ وجغرافیہ کے حوالے بکثرت ملتے ہیں۔ محروم نے ہندوستانی تیوہاروں پر بڑی سرشاری سے لکھا ہے۔ ان کی ایک نظم 'ویران کٹیا' میں رامائن کا ایک منظر نظم کیا گیا ہے۔ کچھ شعر ملاحظہ ہوں:

جی تھام کے باہر درودیوار کے ڈھونڈا
اور دونوں طرف پہلوئے کہسار کے ڈھونڈا
اس گل کو ہر ایک برگ میں گلزار کے ڈھونڈا
ہرڈال میں، ہر پات میں، اشجار کے ڈھونڈا
اشجار مجھے اس کا پتا کیوں نہیں دیتے
پتوں کی زباں ہے تو صدا کیوں نہیں دیتے
مرغانِ ہوا تم ہی بتا کیوں نہیں دیتے
سیتا پہ جو گزری ہے سُنا کیوں نہیں دیتے

ان اشعار کی سماعت سے مراثی انیس کی یاد تازہ ہوتی ہے۔

تلوک چند محروم نے بچوں کے لیے بھی بے شمار نظمیں آسان بحروں میں لکھی ہیں جن میں حب الوطنی کی روح پھونکی گئی ہے جو بڑی پیاری ہیں جن میں ترنم بھی ہے اور نغمگی بھی پائی جاتی ہے۔ وہ خود بھی استاد تھے اور بچوں کی نفسیات سے بخوبی آگاہ تھے اس لیے اُن کی بچوں کے لیے نظمیں بے حد مقبول ہوئیں اور ہندو پاک کی نصابی کتابوں میں شامل ہیں۔

تلوک چند محروم کی قومی شاعری 'کاروان وطن' کے نام سے شائع ہوچکی ہے۔ اس کے دو حصے ہیں 'فریاد جرس' میں 1906 سے 1947 تک کی یعنی ماقبل آزادی کی تمام قومی شاعری شامل ہے۔ آزادی کے بعد کی شاعری 'منزل' میں درج ہے جو 1947 سے 1960 تک کی نظموں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے مقدمے میں نیاز فتح پوری نے 'حرفے چند' کے عنوان سے جو دیباچہ لکھا ہے۔ اس کا چھوٹا سا اقتباس پیش ہے:

''حالی کا اثر سب سے زیادہ محروم ہی نے قبول کیا۔ وہی سادگی بیان، وہی پُرخلوص لہجہ، وہی صداقتِ جذبات اور وہی سب کچھ جو ایک مخلص دوست کہہ سکتا ہے۔ ان کے یہاں نہ مجاہدانہ جوش وخروش ہے نہ سرفروشانہ تبلیغ۔ لیکن صداقت اتنی زبردست پائی جاتی ہے کہ اس سے متاثر نہ ہونا ممکن نہیں۔

ان کے جذبات کا خلوص، انداز بیان کی متانت گویا ایک ٹھہرا ہوا سمندر ہے جو طوفان سے زیادہ گہرائی اپنے اندر رکھتا ہے اور ان کی شاعری محض ماتم ملک وملت نہیں، بلکہ مکمل داستان ہے۔''

Dr. Kazi Habeeb Ahmed, Asstt. Prof. of Urdu Dept. of Arabic, Persian & Urdu University of Madras, Marina Campus, Chennai-05 (T.N.).

یاسمین رشیدی

منٹو کی کہانیوں کا پسِ نوآبادیاتی مطالعہ

پس نوآبادیات وہ طرزِ فکر ہے جو اپنی مخصوص شعریات، ثقافت، تہذیب اور روایات کو بنیادی حوالہ بناتی ہے۔ جن رویوں اور طریقہ کار کو نوآبادیاتی کلامیہ کے تحت فرسودہ اور غیر حقیقی قرار دے دیا گیا، پس نوآبادیات انھیں سے معاملہ کرتی ہے۔ ایسی تحریروں کا مطالعہ پس نوآبادیات ازسرِنو کرتی ہے، جس کا مطالعہ نوآبادیاتی صورت حال کے تحت کیا گیا تھا۔ گویا پس نوآبادیاتی کلامیہ زبان و ادب کو اس کے مخصوص ثقافتی پس منظر میں اجاگر کرنے کی سعی ہے۔ اس ضمن میں بل آش کرافٹ لکھتے ہیں:

''ان کی (پس نوآبادیات کی) موجودہ شکل نوآبادیت کے تجربے کے نتیجے میں سامنے آئی ہے اور سامراجی قوتوں کے سامنے اپنے وجود کا احساس کراتی ہے اور ان طاقتوں سے اپنے اختلاف کو نمایاں کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں مابعد نوآبادیات کہا جاتا ہے۔''

(بل آش کرافٹ، مابعد نوآبادیات کا تعارف، مترجم مشرف علی، مشمولہ دانش (آرٹس فیکلٹی جرنل)، شمارہ 7، علی گڑھ، ص 166)

مزید لکھتے ہیں:

''مابعد نوآبادیاتی تصانیف کی گوناگوں ثقافتی ابتدائی تاریخ اور پیچیدگیوں کو پیش کرنے میں یوروپین نظریے کی نا اہلی کے سبب 'مابعد نوآبادیاتی نظریے' کا تصور وجود میں آیا۔''

(بل آش کرافٹ، مابعد نوآبادیات کا تعارف، مترجم مشرف علی، مشمولہ دانش (آرٹس فیکلٹی جرنل)، شمارہ 7، علی گڑھ، ص 176)

نوآبادکاروں نے ہمارے ادب کا مطالعہ مغربی معیارات پر کیا تھا۔ چونکہ یہ عمل صرف اپنی حکومت کے استحکام کے لیے اور نوآبادیاتی صورت حال کو مضبوط کرنے کے لیے تھا، کسی بھی صورت میں قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ ہر ادب کا اپنا مخصوص کلچر اور روایتیں ہوتی ہیں۔ ادبی شعریات خلا میں نہیں پیدا ہوتی۔ شعریاتی نظام خود مکتفی نہیں ہوتا اور نہ ہی مغربی شعریات کی رو سے مشرقی ادب کی قرأت ممکن ہے۔ شعریات کا اپنی ثقافت سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے، نوآبادکاروں نے مشرقی شعریات کا مطالعہ جن بنیادوں پر کیا تھا وہ پس نوآبادیات کی رو سے رد ہو جاتے ہیں کیونکہ اول تو انھیں ہماری ادبی شعریات کو غیر اہم قرار دے کر ہمارے ذہنوں کو غلام بنانا تھا تاکہ نوآبادیاتی صورت حال قائم رہے اور وہ ایسے ہی حکومت کرتے رہیں۔ داستان کے جس کلچر کو غیر حقیقی قرار دے کر رد کیا گیا وہ ہماری قدیم تہذیب کا ایک اہم حصہ ہے نیز ہمارے اجتماعی لاشعور سے قریب تر بھی ہے۔

پس نوآبادیات نہ صرف نوآبادیاتی رویوں کو رد کرتی ہے بلکہ ہماری ادبی شعریات کی بنیادوں پر ہی متن سے معاملہ کرتی ہے۔ اردو ادب میں نوآبادیاتی رویوں سے اختلاف کی جو صورت اکبر الہ آبادی کے ہاں نظر آتی ہے اس کی ایک جہت منٹو کے افسانوں 'نیا قانون'، 'خوشی تھوک'، 'نعرہ' اور 'ہتک' وغیرہ میں نوآبادیاتی فکر کے خلاف ایک شدید رد عمل نظر آتا ہے۔ منگو کوچوان کی انگریزوں سے شدید نفرت اسی پس نوآبادیات کی توسیع ہے۔

ان کے لال جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو!

صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ، نیچے کی طرف کھنچ گیا اور پاس ہی، گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر، ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آرہی تھی، ایک لرزش کے ساتھ گہری ہوگئی۔ گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔

بقول منگو کوچوان 'یہ انگریز جو آگ لینے آئے تھے۔ اب گھر کے مالک بن گئے ہیں۔' منگو کوچوان جو نوآبادیات کے خلاف منٹو کا ایک جیتا جاگتا، چلتا پھرتا احتجاج ہے، بہت حد تک ان تمام لوگوں کی ترجمانی کرتا ہوا نظر آتا ہے جو انگریزوں سے نفرت کرتے تھے، لیکن ان کی نفرت ان کے ذہن میں ہی مقید تھی۔ مگر منگو کی شخصیت کے مانند اس کی نفرت بھی ثنویت کا شکار نہیں تھی۔ اس کے اندر نفرت کا وہ لاوا ابھرا ہوا تھا، جو ہلکی سی چنگاری کا منتظر تھا۔ منگو کوچوان کو یہ چنگاری ایک اپریل کو نافذ ہونے والے 'نیا قانون' میں نظر آتی ہے۔ جس کی اہمیت منگو کوچوان کی نظر میں آزادی سے کم نہ تھی۔

''پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑخوں ... پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑخوں ... اب ہمارا راج ہے بچہ!''...

''وہ دن گزر گئے جب خلیل میاں فاختہ اڑایا کرتے تھے ... اب نیا قانون ہے میاں ... نیا قانون!''

منگو کے اندر بھرے ہوئے لاوے کو (جسے نوآبادیات کے خلاف ایک شدید ردعمل کے طور پر دیکھنا چاہیے)

چنگاری نے ہوا دی اور گورے سے اپنی بے عزتی کا بدلا لینے کے لیے وہ لاوا پھوٹ پڑا۔

اس کا گھونسہ کمان میں سے تیر کی طرح اوپر کو اٹھا اور چشم زدن میں گورے کی ٹھڈی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے کر اس نے گورے کو پرے ہٹایا اور نیچے اتر کر اسے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

آج ہم آزاد ہندوستان میں سانس لے رہے ہیں۔ صورت حال غلام ہندوستان سے قدرے مختلف ہے۔ انگریز بے شک ملک چھوڑ کر جا چکے ہیں پر ان کا لگایا ہوا نوآبادیات کا پودا آج پھل پھول کر تناور درخت کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ ہندوستان میں نوآبادیاتی سروکار وہی ہے، بس نوآبادکار بدل گئے ہیں۔ آج نوآبادکار کی صورت گوری نہیں جسے دیکھ کر منگو کوچوان کو متلی آئے، پر اس کے تن پر انگریزی لباس ضرور ہے۔ زبان پر — گٹ پٹ — بھی وہی پرانی ہے، حکومت کرنے کا انداز بھی وہی پرانا، مگر وہ زبان بدل گئی ہے، وہ ہاتھ بدل گئے ہیں، استحصال کے طریقے بدل گئے ہیں۔ آج کوئی انگریز کسی ہندوستانی پر حکومت نہیں کر رہا، ہندوستانی ہی اپنے ہندوستانی بھائی سے غلاموں جیسا سلوک کر رہا ہے۔ مغرب کو — رحمت اللہ علیہ کی کھونٹی — پر ٹانگنے والے یہ لوگ اپنی مٹی کی خوشبو، اپنی تہذیب، اپنی روایات، اپنی قدروں کو انگریزی گٹ پٹ میں فراموش کر چکے ہیں۔ ہندوستان ترقی کے راستوں پر گامزن ہے۔ آنے والے دنوں میں اس کا شمار دنیا کے طاقتور اور ترقی یافتہ ملکوں میں ہونے لگے گا۔ جانے یہ کیسی ترقی ہے؟ کہ جو موٹر میں گھومتی ہے، انگریزی شراب پیتی ہے، سگار کے کش لگاتی ہے اور اپنے غریب مزدور بھائیوں کو حقارت سے دیکھتی ہے۔ شاید یہ — چاندی کی لٹیا میں چائے پینے والے سجاد ظہیر — والی ترقی ہے۔ جو غریب کو اور غریب اور امیر کو زیادہ امیر کرتی جا رہی ہے۔ منٹو کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمارے ذہن میں یہ سوال بار بار سر اٹھاتے ہیں پر جواب ندارد ...

سوگندھی محض ایک طوائف نہیں ایک کوڈ (code) ہے۔ اس کوڈ کو ڈی کوڈ(decode) کرتے ہوئے یہ وضاحت کی جا سکتی ہے کہ سوگندھی / محکوم طبقہ کو استعمال کرنے والے سیٹھ / حاکم اس نظام کے سیگنیفائرز (signifiers) ہیں جسے ہم نوآبادیات کہتے ہیں۔ نوآبادیاتی ذہن جب اپنے زیر سایہ زندگی کرنے والوں کو یعنی محکوم طبقوں کو پوری طرح نچوڑ لیتا ہے تو پھر اس کے لیے محض اس کی — اونہہ — یعنی حقارت ہی ہوتی ہے۔ ’ہتک‘ اور منٹو کے دوسرے افسانوں کو اسی سیاق میں پڑھا جائے تو پس نوآبادیات کے کئی اشارے دریافت کیے جا سکتے ہیں۔

منٹو یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ طاقت / استحصال ہمیشہ مظلوموں کا شکار کرتی ہے۔ طاقت / ظالم کے آگے مظلوم صفحہ قرطاس کے مانند ہے۔ ’نیا قانون‘ اور ’خونی تھوک‘ کا اختتام اس کی بہترین مثال ہے، جہاں منگو کوچوان جیل میں بند ہے اور انگریزی لباس زیب تن کیے ہوئے صاحب (جن کے سر ایک قلی کا خون ہے) رہا کر دیے گئے ہیں۔ منٹو تا عمر نوآبادیاتی رویوں سے لڑتا رہا۔ خونی تھوک میں قلی کا ردعمل / احتجاج پس نوآبادیات کا اظہاریہ ہے۔

’’میرے پاس ... بھی ... کچھ ہے ... یہ لو ...‘‘

یہ کہتے ہوئے اس نے (قلی نے) مسافر کے منہ پر تھوک دیا...

مسافر کا منہ خونی تھوک سے رنگا ہوا تھا۔

نوآبادیاتی رویوں کے خلاف منٹو کا یہ بیانیہ پس نوآبادیاتی فکر کی بنیاد پر قائم ہے۔ ’نعرہ‘ اور ’ہتک‘ کا نوآبادیاتی مطالعہ اس کی آئرنی جہت کو اور بھی شدید کر دیتا ہے۔ 5 سال تک برابر کرایا ادا کرنے کے باوجود 20 روپے کرایا ادا نہ کر پانے پر کیشو لال کو مکان مالک نے جو گالی دی تھی، اس نے کیشو لال کے دل و دماغ میں بغاوت (پس نوآبادیاتی رویہ) کی چنگاری کو جنم دیا۔ اس کا رویہ سیٹھ کے تئیں تبدیل ہو گیا۔ گنجی چندیا اور دھپا مارنا دراصل منٹو کی مخصوص تراکیب ہیں جو ’نعرہ‘ کی پس نوآبادیاتی جہت سے متعلق ہیں۔

اس کے جی میں آئی کہ اس گالی کو جسے وہ بڑی حد تک نگل چکا تھا، سیٹھ کے جھریوں پڑے چہرے پر قے کر دے مگر وہ اس خیال سے باز آ گیا کہ اس کا غرور تو باہر فٹ پاتھ پر پڑا ہے۔ اپولو بندر پر، نمک لگی مونگ پھلی بیچنے والے کا غرور۔

سچ مچ اگر اس کا اپنا راج ہوتا تو وہ چوک میں بہت سے لوگوں کو اکٹھا کر کے سیٹھ کو بیچ میں کھڑا کر دیتا اور اس کی گنجی چندیا پر اس زور سے دھپا مارتا کہ وہ بلبلا اٹھتا، پھر وہ سب لوگوں سے کہتا کہ ہنسو، جی بھر کر ہنسو اور خود اتنا ہنستا کہ ہنستے ہنستے اس کا پیٹ دکھنے لگتا۔

کیشو لال کا نعرہ — ہت تیری — اور قلی کا — خونی تھوک — دونوں نوآبادیات پر منٹو کے طنز کو آشکار کرتے ہیں۔

منگو کوچوان کے اندر پل رہے لاوے کو چنگاری دکھانے کا جو کام نیا قانون نے کیا تھا، سوگندھی کے اندر وہی چنگاری سیٹھ کی — اونہہ — نے پیدا کی۔ سوگندھی جسے منٹو نے — صدیاں عطا کیں — ایک طوائف تھی، کسبی جو سماج پر ایک بدنما دھبا ہے، جو سماج کی وہ غلاظت صاف کرتی ہے جس کا ذکر بھی سماج کے لیے ممنوع ہے۔ وہ سوگندھی جس سے سماج کام تو لیتا ہے مگر اس کا وجود سماج کے لیے گالی ہے۔ سوگندھی سماج کے ان شریفوں پر ایک کتے کو ترجیح دے کر اپنا ردعمل / احتجاج ظاہر کرتی ہے۔ سوگندھی کے اندر سیٹھ کی — اونہہ — نے جو ہلچل پیدا کی تھی، وہ کیشو لال کی ذہنی کیفیت سے کافی مماثلت رکھتی ہے۔ کیشو لال اور سوگندھی دونوں کا احتجاج / ردعمل پس نوآبادیات کو قائم کرتا ہے۔

سوگندھی محض ایک طوائف نہیں ایک کوڈ (code) ہے۔ اس کوڈ کو ڈی کوڈ (decode) کرتے ہوئے یہ وضاحت کی جا سکتی ہے کہ سوگندھی / محکوم طبقہ کو استعمال کرنے والے سیٹھ / حاکم اس نظام کے سیگنیفائرز (signifiers) ہیں جسے ہم نوآبادیات کہتے ہیں۔ نوآبادیاتی ذہن جب اپنے زیر سایہ زندگی کرنے والوں کو یعنی محکوم طبقوں کو پوری طرح نچوڑ لیتا ہے تو پھر اس کے لیے محض اس کی — اونہہ — یعنی حقارت ہی ہوتی ہے۔ ’ہتک‘ اور منٹو کے دوسرے افسانوں کو اسی سیاق میں پڑھا جائے تو پس نوآبادیات کے کئی اشارے دریافت کیے جا سکتے ہیں۔

اردو ادب کے مطالعے میں پس نوآبادیاتی فکر کو مروج کرنے کی ضرورت ہے تا کہ ہم اپنی شعریات کی رو سے متن کی تعبیر / تشریح کریں۔ نوآبادیات کی جڑیں ہمارے معاشرے میں بہت اندر تک پیوست ہیں، جو ہماری تہذیب اور قدروں کو اندر سے کھوکھلا کر رہی ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ان کا — دھڑن تختہ — کیا جائے۔

■

Yasmeen Rashidi, Research Scholar, 140, Shipra Hostel, JNU, New Delhi - 110067

ناظر حسین خاں

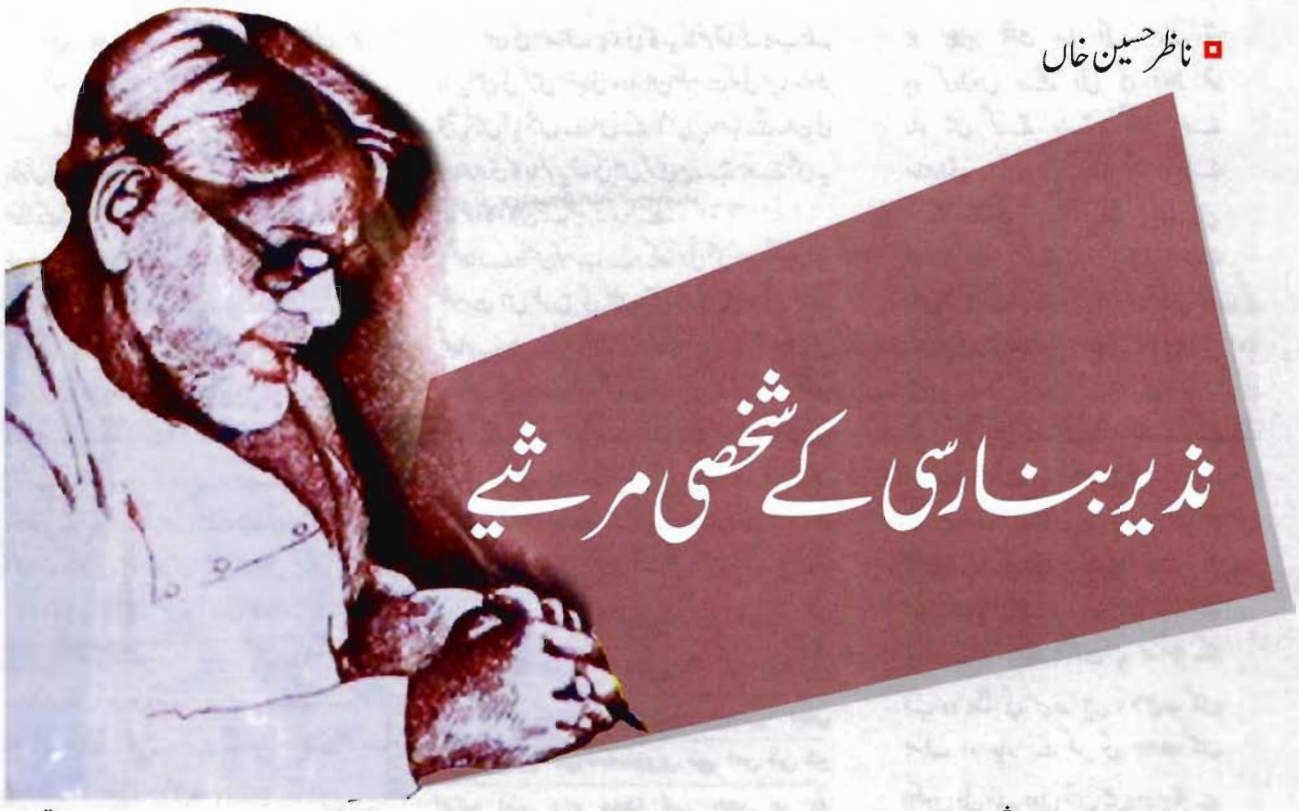

نذیر بنارسی کے شخصی مرثیے

نذیر بنارسی نے جن لوگوں پر شخصی مرثیہ لکھے ہیں ان میں ٹیگور، مدن موہن مالویہ، ڈاکٹر سمپورنانند، کملا پتی ترپاٹھی، شیو پرشاد گپت، پریم چند، سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا، چندر شیکھر آزاد، گاندھی جی، جواہر لال نہرو، ابوالکلام آزاد، لال بہادر شاستری، اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس سلسلے کا سب سے پہلا نام جسے نذیر بنارسی نے موضوع بنایا ہے وہ روندر ناتھ ٹیگور ہیں۔ بنگالی شاعر روندر ناتھ ٹیگور کی ولادت کلکتہ کے ایک معزز گھرانے میں ہوئی۔ ٹیگور بنیادی طور پر شاعر تھے، مگر انھوں نے ہر فن میں طبع آزمائی کی۔ ناول ہو یا ڈرامہ، افسانہ ہو یا انشائیہ، تحقیق وتنقید ہو یا پھر فلسفیانہ موضوع ہر میدان میں انھوں نے اپنی ایک الگ پہچان بنائی ہے۔ ان کو 1913 میں ان کے شعری مجموعے 'گیتانجلی' پر نوبل انعام دیا گیا۔ نذیر بنارسی نے ان کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے، ملاحظہ فرمایئے:

جس کو اب تک نہ پا سکا وگیان
ہے وہ بے پنکھ کلپنا کی اڑان
سب تو ان کو سمجھ نہیں سکتے
جس کا اب جیسا گڑ ہو ویسا گیان
جانے کتنی شتابدی کے بعد
آیا ٹیگور جیسا ایک انسان

ان کی ایک ایک وچار دھارا میں
ہے چھپا راگ رنگ کا طوفان
اس طرح راگ راگنی کا رچاؤ
جیسے پروت کی اونچی اونچی چٹان
پھوٹتے ہیں وہاں وہاں سے گیت
ٹوٹتی ہے جہاں جہاں سے تان

ٹیگور کے ہاں حقیقت پسندی، حب الوطنی کے علاوہ انصاف کا وسیع تصور اور ناانصافی اور ظلم سے بیزاری صاف طور پر عیاں ہیں۔ انھیں خوبیوں کی بنیاد پر ٹیگور نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پوری دنیا میں قابل احترام ہیں۔ اس حقیقت کا اعتراف شاعر نے یوں کیا ہے:

زندگی اس کی تلوار بھی ڈھال بھی
اس کے پابوس طوفاں بھی بھوچال بھی
ساز جیسا ہے ویسا ہے سُر تال بھی
رقص میں اس کا ماضی بھی اور حال بھی
کل وطن، آج دنیا طرفدار ہے
تب وہ بھارت تھا اب پورا سنسار ہے

نظم کے اس بند میں شاعر نے ٹیگور کی شخصیت کو تلوار اور ڈھال دونوں بتایا ہے۔ تلوار بروں کے لیے اور ڈھال کمزوروں کے لیے۔ ان کے حلقہ شاگردی میں ایک سے ایک بڑے لوگ شامل تھے۔ ان کے قول وفعل میں کوئی فرق نہیں تھا۔ چوتھے شعر میں شاعر نے لفظ رقص کا استعمال کیا ہے، یعنی ان کا جینا، اٹھنا، بیٹھنا، غرض زندگی کی ہر عادت واطوار میں ماضی اور حال دونوں ہی دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے ٹیگور نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پوری دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

اوپر اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ ٹیگور نے ہر فن میں اپنی فنکاری کا بھرپور مظاہرا کیا ہے۔ ان کی فنکاری میں مصوری اور موسیقی بھی ہے۔ ٹیگور کی مصوری نے اس فن کو ایک نئی راہ عطا کی جس پر یہ مسلسل آگے چلتی رہی۔ موسیقی کی بات کریں تو ان کی بنائی ہوئی دھنیں بنگال میں بہت مشہور ہوئیں۔ انھیں آج بھی 'روندر اسنگیت' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ بند ملاحظہ فرمایئے:

ساز کو چھیڑتے گنگناتے ہوئے
دیس میں دیس کے گیت گاتے ہوئے
سوئی انسانیت کو جگاتے ہوئے
آدمیت کی شوبھا بڑھاتے ہوئے
تازگی بخش دی رنگ سے راگ سے
بزم پر پھول برسا دیے آگ سے
پھونک دی ذرے ذرے میں روح شباب
اپنے گیتوں سے رگ رگ میں بھر دی شراب
بجھتے چہروں کو دے دی نئی آب و تاب
انقلاب اور اتنا حسیں انقلاب

دی جلا زندگی کے خد و خال کو
خود سنورنا پڑا حسن بنگال کو

مدن موہن مالویہ کا ذکر بنارس کے بغیر ادھورا ہے۔ بنارس ایک ایسا شہر ہے جس نے ملک کو ایک سے ایک نگینے عطا کیے ہیں، جنھوں نے ملک کی آزادی سے لے کر سماجی خدمات میں نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں۔ مالویہ جی کا نام اس ضمن میں قابل ذکر ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

یہ کاشی نگری ہے کاشی نگری کبیر و تلسی کا تذکرہ کیا
یہاں کی ماٹی نے جس کو چاہا اسے بڑا آدمی بنایا
وہاں سے لے آیا ان کو آخر ہماری کاشی کا آب و دانہ
وہ تھے تو پریاگ کے نواسی، نصیب نے کاشوی بنایا
وہ بن کے شردھا کے پھول گمکے، بتایا جیون یہیں پہ آ کے
اٹھی جو گنگا کی موج من میں تو دل کو گنگا جلی بنایا

مالویہ کا ایک شہرۂ آفاق کارنامہ 'بنارس ہندو یونیورسٹی' کا قیام ہے۔ یہ دارالعلوم انھیں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے جس میں آج دنیا کے کونے کونے سے طالب علم تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں۔ نذیر کے یہ اشعار اس حقیقت کو پوری طرح واضح کرتے ہیں:

جو آدمی سوچ بھی نہ پایا وہ مالویہ جی نے کر دکھایا
نئے سرے سے سجا سجائی کلاکو دل کی کلی بنایا
وہی برہمن سپوت جس نے جنم لیا بھارتی بھون میں
ہے اس کی محنت کا یہ کرشمہ میرے بنارس کے بانکپن میں
جھکا کے سر سب سے بھیک لے کر اٹھایا ہر بھارتی کا مستک
ہم ایسے انپڑھ کی زندگی کو سنوار کر زندگی بنایا
بنایا وہ ودیہ کا مندر جو شان ہے پورے ایشیا کی
ہے سارا سنسار جس سے پرچت وہ پرتبھا ہے مہانتا کی
مکٹ ہے وارانسی کے سر کا، وہ ودیہ کا حسیں شوالہ
تمام ودیارتھی جہاں کے ہیں، سندر سندر گلے کی مالا
ہیں ساچھی وشو ودھالیہ، ہے ان کا دنیا میں بول بالا
امٹ ہے ان کی ہر اک نشانی، امر ہے ان کا ہر اک اجالا

ڈاکٹر سمپورنا نند کی شخصیت نہ صرف ادب میں بلکہ ملک کے لیے محتاج تعارف نہیں۔ یہ اپنی انصاف پسندی کے لیے بہت مشہور تھے۔ نذیر نے ان کی انصاف پسندی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

تھی جس میں پرکھوں کی شان اس کا جنم دوس ہم منا رہے ہیں
ملے گا سمپورڑ سب کو آنند، اک ایسی کویتا سنا رہے ہیں
قلم چلا ہے تمھارا جب بھی نیائے کے واسطے چلا ہے
اگر کبھی ہاتھ اٹھا تمھارا، سہائتا کے لیے اٹھا ہے
اگر کبھی سر جھکا تمھارا تو شانتی کے لیے جھکا ہے
دیا نہ اپنی مہانتا کو، تیاگ پتر اپنا دے دیا ہے

ان کی انصاف پسندی کا یہ عالم تھا کہ جب تک وزیر اعلیٰ کی کرسی سنبھالی، دوران حکومت کوئی ایسا حادثہ پیش نہیں آیا جس سے ان کے دامن پر دھبا لگے۔ ان کی ایمانداری کا عالم یہ تھا کی اس کرسی پر رہتے ہوئے بھی یہ اپنا خود کا مکان تک تعمیر نہ کروا سکے:

تمھارے دامن کو سب نے دیکھا کوئی بھی دھبا نظر نہ آیا
حکومت اس طرح کی کہیں بھی لہو کا چھینٹا نظر نہ آیا
تمھارے دم سے گری عمارت، نئی طرح سر اٹھا رہی تھی
وہ جس کی حالت بگڑ چکی تھی وہ اپنی بگڑی بنا رہی تھی
نئے نئے گھاٹ بن رہے تھے نویتا سر اٹھا رہی تھی
نصیب منگل منا رہا تھا نگاہ گنگا نہا رہی تھی
عجیب ایماندار بھارت میں ایک بھارت کا سنتری تھا
مکان تک بن نہ پایا جس کا اک ایسا بھی مکھیہ منتری تھا

ٹیگور نے ہر فن میں اپنی فنکاری کا بھرپور مظاہرا کیا ہے۔ ان کی فنکاری میں مصوری اور موسیقی بھی ہے۔ ٹیگور کی مصوری نے اس فن کو ایک نئی راہ عطا کی جس پر یہ مسلسل آگے چلتی رہی۔ موسیقی کی بات کریں تو ان کی بنائی ہوئی دھنیں بنگال میں بہت مشہور ہوئیں۔ انھیں آج بھی 'روندرا سنگیت' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے

پریم چند کا نام اردو اور ہندی ادب کے لیے انجان نہیں ہے۔ انھوں نے دونوں زبانوں کو اپنی تخلیقی قوت سے ایک نئی جلا بخشی۔ ان کا تعلق بنیادی طور پر افسانے اور ناول سے تھا۔ ان دونوں ہی میدانوں میں پریم چند سر فہرست رہے۔ جہاں سوز وطن، واردات، زادراہ اور آخری تحفہ وغیرہ ان کے افسانوی مجموعے ہیں وہیں دوسری طرف اسرار معابد، بازار حسن، گوشۂ عافیت، نرملا، میدان عمل اور گئودان وغیرہ ناول قابل ذکر ہیں۔ پریم چند بنارس کے ایک گاؤں لمہی میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں بہت نشیب و فراز دیکھے اور زندگی کے اسی نشیب و فراز سے اپنے لیے ایک نیا راستہ بنایا۔ اس سلسلے میں نذیر بنارسی کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

مفلسی تھی تو اس میں بھی ایک شان تھی
کچھ نہ تھا، کچھ نہ ہونے پہ بھی آن تھی
چوٹ کھاتی گئی چوٹ کرتی گئی
زندگی کس قدر مرد میدان تھی
جو بظاہر شکستہ سا اک ساز تھا
وہ کروڑوں دکھے دل کی آواز تھا
راہ میں گرتے پڑتے سنبھلتے ہوئے
سامراجی کے تیور بدلتے ہوئے
آگئے زندگی کے نئے موڑ پر
موت کے راستے سے ٹہلتے ہوئے

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اردو اور ہندی ادب کی تاریخ میں پریم چند کا شمار سرفہرست کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے ہندوستان کی حقیقی زندگی کو پیش کیا ہے۔ اس وقت ملک کے نچلے طبقے کی جو حالت تھی اسے اپنا موضوع بنا کر نہ صرف اس حقیقت سے سب کو روشناس کرایا بلکہ خود بھی کروڑوں ہندوستانیوں کے دل پر اپنی چھاپ چھوڑ گئے:

بن کے بادل اٹھے، دیس پر چھا گئے
پریم رس، سوکھے کھیتوں پہ برسا گئے
اب وہ جنتا کی سمپت ہیں، دھنپت نہیں
صرف دو چار کے گھر کی دولت نہیں
لاکھوں دل ایک ہوں جس میں وہ پریم ہے
دو دلوں کی محبت محبت نہیں
فرد تھا، فرد سے کارواں بن گیا
ایک تھا، ایک سے اک جہاں بن گیا

شخصی مرثیہ کی اگلی کڑی سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا ہیں۔ نرالا ہندی ادب کے مشہور شاعر تھے۔ نظم کا یہ بند ملاحظہ فرمائیے جس میں شاعر نے نرالا کی موت پر اظہار افسوس کیا ہے:

ہوک دل سے اٹھی آنکھ نم ہو گئی
آج گنگا کی اک موج کم ہو گئی
ماں تیرے ساز کا تار ٹوٹا ہے کیا
آج آواز میں زندگی کیوں نہیں
کیوں ہے مرجھائی 'جوہی' کی ہر اک کلی
آج 'بیلا' کے منہ پر ہنسی کیوں نہیں

نظم کے اس بند میں شاعر نے نرالا کی موت پر غم کا اظہار کیا ہے۔ دل سے ہوک کا اٹھنا، آنکھ نم ہونا، گنگا کی موج کا کم ہونا، ساز کا تار ٹوٹنا اور کلیوں کا مرجھانا وغیرہ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اب یہ بند ملاحظہ فرمائیے جس میں شاعر نے ان کی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے:

شبد اس کے اٹل جیسے انگد کے پاؤں
کلپنا میں ہمالہ کی اونچائیاں

اس کی چپ اس کی گمبھیرتا کی دلیل
اس کے دل میں سمندر کی گہرائیاں

اس بند میں شاعر نے ان کی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پہلے مصرعے میں انگد کی تلمیح استعمال کی گئی ہے۔ انگد رام چندر کے وقت کا ایک بندر جس نے راون کے دربار میں جب اپنا پاؤں رکھا تو اس کا پاؤں کوئی نہ ہلا سکا، نرالا کے ارادے بھی اسی کے مانند تھے۔ ساتھ ہی شاعر نے ان کی سوچ کو ہمالہ کی اونچائی کی مانند اور دل کی گہرائی کو سمندر کی گہرائی بتایا ہے۔

دوسرے مصرعے میں ان کی سوچ کو ہمالہ کی طرح اونچا بتایا گیا ہے اور چوتھے مصرعے میں ان کے دل کی گہرائی کو سمندر کی گہرائی سے تشبیہ دی ہے۔

نذیر بنارسی نے ایسی ایسی شخصیات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے جو دیگر شعرا کے قلم کی رسائی سے دور رہے ہیں۔ اس ضمن میں چندر شیکھر آزاد کا نام قابل ذکر ہے۔ آزاد کا شمار آزادی کے دیوانوں میں ہوتا ہے۔ جس وقت ہندوستان میں آزادی کی جنگ عروج پر تھی اس وقت اس جنگ کے لڑنے والوں کے دو گروپ تھے۔ ایک نرم دل دوسرا گرم دل۔ نرم دل کے نگراں گاندھی جی تھے تو دوسری طرف گرم دل کے سربراہوں میں چندر شیکھر کا بھی شمار ہوتا تھا۔ نرم دل کے لوگ جہاں کسی بھی مسئلے کو باتوں کے ذریعے سلجھانے کی کوشش کرتے تھے وہیں دوسری طرف گرم دل کے لوگ خون کا بدلا خون سمجھتے تھے۔ جہاں گاندھی جی کا قاعدہ تھا کہ اگر کوئی آپ کے گال پر ایک تھپڑ مارے تو دوسرا گال بھی اس کے حوالے کر دیجیے، وہیں دوسری طرف گرم دل والوں نے یہ قانون بنایا تھا کہ اگر کوئی آپ کو ایک تھپڑ مارے تو آپ اس کو دو تھپڑ رسید کریں۔ گرم دل کے لوگوں نے آزادی کے لیے ایک نعرہ بنایا تھا کہ 'تم مجھے خون دو میں تمھیں آزادی دوں گا'۔ گرم دل کے اس جاں باز سپاہی کی شخصیت کو نذیر نے ہمارے سامنے اس طرح سے پیش کیا ہے:

کبھی بھری ہیں نہ آہیں نہ سسکیاں تم نے
قفس کی توڑی ہیں ہنس ہنس کے تیلیاں تم نے
تمھارے ذکر سے جھوم اٹھتے ہیں وطن کے جواں
وطن کو دی ہے جوانی کی مستیاں تم نے
لیا ہے تم نے غلامی کی بیڑیوں سے بھی کام
گلا کے بیڑیاں ڈھالی ہیں گولیاں تم نے
نثار رنگِ چمن تم پہ اے چمن کے شہید
وطن کو ناز ہے تم پر میرے وطن کے شہید

اس بند میں شاعر نے چندر شیکھر آزاد کی جواں مردی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ آزاد نے ہر مصیبت کے وقت ہمت سے کام لیا اور ڈٹ کر انگریزوں کا مقابلہ کرتے رہے، اس لیے جب بھی آزاد کا نام زبان پر آتا ہے تو ملک کے نوجوانوں پر ایک عجیب سا سرور چھا جاتا ہے۔ وطن پر قربان کرنے والے ایسے شہیدوں پر وطن کو ناز ہے، اس لیے شاعر بھی ان پر سلام بھیجتا ہے۔

ہندوستان کی تاریخ میں اہنسا کے پجاری کہے جانے والے گاندھی جی کا نام صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں ایک الگ مقام رکھتا ہے۔ نذیر بنارسی نے ان کو 'امن کا دیوتا' اور 'بوڑھا مالی' وغیرہ کے نام سے یاد کیا ہے۔ اس سلسلے کی ایک اور نظم 'آہ مہاتما گاندھی' ہے۔ جس کی تخلیق گاندھی جی کی موت کی خبر سنتے ہی ہوئی یا یوں کہیں کہ یہ نظم قلم برداشتہ لکھی گئی۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

نذیر بنارسی نے ایسی ایسی شخصیات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ھے جو دیگر شعرا کے قلم کی رسائی سے دور رھے ھیں۔ اس ضمن میں چندرشیکھر آزاد کا نام قابل ذکر ھے۔ آزاد کا شمار آزادی کے دیوانوں میں ھوتا ھے

تیرے ماتم میں شامل ہیں زمین وآسماں والے
اہنسا کے پجاری سوگ میں ہیں دو جہاں والے
تیرا ارمان پورا ہوگا اے امن و اماں والے
تیرے جھنڈے کے نیچے آئیں گے سارے جہاں والے
میرے بوڑھے بہادر اس بڑھاپے میں جواں مردی
نشاں گولی کے سینے پر ہیں گولی کے نشاں والے
اسی کو مار ڈالا جس نے سر اونچے کیے سب کے
نہ کیوں غیرت سے سر نیچا کریں ہندوستاں والے
میرے گاندھی زمیں والوں نے تیری قدر جب کم کی
اٹھا کر لے گئے تجھ کو زمیں سے آسماں والے

نظم 'امن کا دیوتا' کا یہ بند ملاحظہ فرمائیے جس میں شاعر نے گاندھی جی کی موت پر افسوس کا اظہار کیا ہے:

آدمیت کا طرفدار اٹھا دنیا سے
امن عالم کا علمدار اٹھا دنیا سے
ایشیا بھر کا وفادار اٹھا دنیا سے
وقت کا قافلہ سالار اٹھا دنیا سے
اے اجل آدمی دنیا سے گزر سکتا ہے
کارنامہ تیرے مارے کہیں مر سکتا ہے
صرف عنوان ہی بدلا ہے کہانی ہے وہی
مرنے والے کی ہر اک زندہ نشانی ہے وہی
امن عالم کے علمدار کا پانی ہے وہی
ہم وہی اور ارادوں کی جوانی ہے وہی
ہر ادا ایسی کہ منہ پھیر دے خونخواروں کا
ہر نظر ایسی کہ دم توڑ دے تلواروں کا

اس سلسلے کی اگلی کڑی جواہر لال نہرو ہیں۔ جن کو نذیر بنارسی نے اپنی کئی نظموں کے ذریعے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ان میں تروینی سے گنگا تک، راکھ کی ساکھ، پھول سے جن کو پیار بہت تھا اٹھ گیا ان کا پھول، راکھ کیا گا رہی ہے سنو اور جواہرات وغیرہ نظمیں قابل ذکر ہیں۔ نظم 'راکھ کی ساکھ' کے یہ بند ملاحظہ فرمائیے:

وہاں وہاں پہ گئی راکھ مرنے والے کی
جہاں جہاں سے تھی مرحوم کی شناسائی
رہے وہ زندہ تو چھائے رہے زمانے پر
مٹے تو خاک بھی سارے جہاں کے کام آئی
بنے گی جا کے کسانوں کے ہونٹ کی مسکان
یہ راکھ کھیت کے پودوں میں لہلہائے گی
یہ راکھ لائے گی بر مالیوں کے دل کی مراد
ہنسے گی پھولوں میں کلیوں میں مسکرائے گی

نظم 'پھول سے جن کو پیار بہت تھا اٹھ گیا ان کا پھول' کے یہ بند ملاحظہ فرمائیے:

پھول کا ہے انبار نظر میں دل میں غم کے شول
موت نے کر کے ختم کہانی اور بھی کر دی طول
دیش کے کونے کونے پہنچی ان کی چتا کے دھول
پھول سے جن کو پیار بہت تھا اٹھ گیا ان کا پھول

ان کی طرح سنسار میں پھیلی اڑ کر ان کی راکھ
ہو گئی اونچی سارے جگت میں اور وطن کی ساکھ
ان کے کہے پر ہم نہ چلے تو ہوگی بھیانک بھول
پھول سے جن کو پیار بہت تھا اٹھ گیا ان کا پھول

اس سلسلے کو مزید برقرار رکھتے ہوئے شاعر نے لال بہادر شاستری کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے شاستری جی کو لال بہادر شاستری، مانجھی جو مرگیا ہے تو دریا اداس ہے اور ہولی کا دوسرا رخ وغیرہ نظموں کے ذریعے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ نظم 'لال بہادر شاستری' کے یہ بند ملاحظہ فرمائیے:

گنگ و جمن کی گود کا پالا
سب سے بانکا سب سے نرالا

قد میں چھوٹا پد میں ہمالا
چلتا پھرتا پریم شیوالا
امن کی خاطر جنگ کا حامی
لال بہادر اسم گرامی
نہرو خصلت گاندھی فطرت
بھارت ماں کے دل کی راحت
ڈیڑھ برس کل عمر وزارت
سارا زمانہ محو حیرت
دیش کی گرتی ساکھ اٹھا دی
چار دنوں میں دھوم مچا دی

نظم 'مانجھی جو مر گیا ہے تو دریا اداس ہے' کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

گنگا ہے آج سوگ میں جمنا اداس ہے
ترینی رو رہی ہے ترنگا اداس ہے
ساحل کی طرح آج ہیں لہریں سکوت میں
مانجھی جو مر گیا ہے تو دریا اداس ہے
پھرتا ہے دل میں لاش تمنا لیے ہوئے
ہر بھارتی ہے آج جنازہ لیے ہوئے
صلح کی جانب ہاتھ بڑھا کے
آپس کے مت بھید مٹا کے
جنگ کے ہر شعلے کو بجھا کے
آگ کو ہنستا پھول بنا کے
جیت کے سب کے دل کو دوبارہ
لال وطن کا جان سے ہارا

اندرا گاندھی ہندوستان کی تاریخ کی وہ پہلی خاتون ہیں جنھیں یہاں کا وزیر اعظم بننے کا شرف حاصل ہوا۔ ہندوستان میں طبقات نسواں کی مثالی کردار کا سہرا انھیں کے سر جاتا ہے۔ ان کے دور حکومت میں ملک نے ترقی کی نئی راہ تلاش کی۔ مگر افسوس ہمیں ان کی سرپرستی زیادہ دنوں تک نصیب نہیں ہوئی۔ ان کو قتل کر دیا گیا۔ جس وقت یہ حادثہ پیش آیا اس وقت پورا ملک صدمے میں تھا، ہر طرف مایوسی تھی، نذیر بنارسی کو بھی ان کی موت کا گہرا صدمہ لگا۔ انھوں نے اپنے غم کا اظہار کرنے کے لیے قلم کا سہارا لیا اور 'شہید وطن اندرا گاندھی' کے عنوان سے ایک نظم تخلیق کی۔ اس نظم میں نذیر پوری طرح اندرا گاندھی کی موت کے غم میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نظم کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

ہم بے سرو سامانوں کا غم سب پہ عیاں ہے
بھارت میں چتا جلتی ہے دنیا میں دھواں ہے
شان اس کی ہمالہ کی بلندی سے عیاں ہے
سمٹے تو وہ استھی ہے پھیلے تو جہاں ہے
پہلے تو لہو ان کا تھا ان کے ہی بدن میں
اب ان کا لہو دیس کی رگ رگ میں رواں ہے
جو گولیاں کھا کھا کے سر راہ گری تھی
کتنوں کے لیے آج وہ منزل کا نشاں ہے

ان اشعار میں شاعر کہتا ہے کہ ان کی موت سے صرف ہندوستان والوں کو ہی صدمہ نہیں پہنچا بلکہ پوری دنیا کے لوگ اس غم میں مبتلا ہیں۔ شاعر نے ان کی شان کو ہمالہ کی بلندی کی طرح بتایا ہے۔ جب تک وہ حیات سے تھیں ملک کی خوب خدمت کیں اور مرنے کے بعد ملک کی خدمت کا وہی جذبہ ملک کے ہر بچے میں دیکھنے کو مل رہا ہے، اس لیے ہندوستان کا ہر فرد اپنے کردار کو انھیں کے کردار کی طرح بنانا چاہتا ہے۔ نظم کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے جن میں شاعر نے ان کی اولاد کا ذکر کرتے ہوئے انھیں پیڑ کی وہ گھنی چھاؤں بتائی ہے جس کے سائے میں لوگ تھکان دور کرتے ہیں:

وہ اپنا جواں لال ہمیں سونپ گئی ہے
وہ قافلہ اب اور بھی تیزی سے رواں ہے
وہ کتنی گھنی چھاؤں ہمیں دے کے گئی ہے
آج ان کا لگایا ہوا ہر پیڑ جواں ہے
نازاں ہے نذیر اس پہ خواتین زمانہ
وہ آج نہ ہونے پہ بھی خاتون جہاں ہے

اندرا گاندھی ہندوستان کی تاریخ کی وہ پہلی خاتون ہیں جنھیں یہاں کا وزیر اعظم بننے کا شرف حاصل ہوا ... ان کو قتل کر دیا گیا۔ جس وقت یہ حادثہ پیش آیا اس وقت پورا ملک صدمے میں تھا، ہر طرف مایوسی تھی، نذیر بنارسی کو بھی ان کی موت کا گہرا صدمہ لگا۔ انھوں نے اپنے غم کا اظہار کرنے کے لیے قلم کا سہارا لیا اور 'شہید وطن اندرا گاندھی' کے عنوان سے ایک نظم تخلیق کی۔

نذیر بنارسی کے شخصی مرثیے میں اگلا نام ہندوستان کے سابق وزیر اعظم مرحوم راجیو گاندھی کا ہے جنھیں ہندوستان کا سب سے کم عمر وزیر اعظم بننے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ان کے سیاسی شعور کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ کم عمری میں انھوں نے ملک کی باگ ڈور سنبھالی۔ مگر افسوس یہ سرپرستی بھی ہمیں زیادہ دنوں تک نصیب نہیں ہوئی اور انھیں بھی قتل کر دیا گیا۔ نذیر بنارسی نے اپنی شاعری کے ذریعے ان کے قاتلوں پر حملہ کرتے ہوئے راجیو کی خصوصیت کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

ایسے انسانوں کا بھارت دیس میں کیا کام ہے
جن سے بھارت دیس کی انسانیت بدنام ہے
وہ محبت کا پجاری کتنا خوش انجام ہے
ساری دنیا کی زباں پر آج جس کا نام ہے
جسم کے ٹکڑے تو ہو پر ملک کے ٹکڑے نہ ہوں
ٹکڑے ٹکڑے ہونے والے کا یہی پیغام ہے

آیئے اب نذیر کے ان اشعار کا مطالعہ کریں جن میں انھوں نے ملک کے قانون کو نشانہ بنایا ہے، ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ راجیو بھلے ہی آج ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر تاریخ کے پنوں میں ہمیشہ ان کا نام سنہرے لفظوں میں لکھا جائے گا:

راج کے پد سے اونچی کام کی اونچائیاں
یہ بتایا اس نے مر کے جس کا راجیو نام ہے
حادثہ اتنا بڑا اور پورا بھارت بے خبر
یہ نہ ثابت ہو سکا اب تک کہ کس کا کام ہے
وہ نگاہوں سے گزر کر بھی گزر سکتا نہیں
اپنا راجیو راکھ ہو سکتا ہے مر سکتا نہیں

'نذیر بنارسی کے شخصی مرثیہ' پر مشتمل اس مضمون میں نذیر نے جن جن شخصیات پر قلم اٹھایا ہے، ان کا بہت ہی مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ اس نے جن شخصیات کو موضوع بنایا ہے اس کی شخصیت کے ساتھ اس کے کردار کو بھی قاری کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کسی کا علم، کسی کا اخلاق، کسی کی جواں مردی یا کسی کا اپنے ملک کے لیے جان قربان کرنے کا جذبہ غرض شاعر نے سارے پہلوؤں کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔

Nazir Husain Research Scholar, Dept of Urdu, Aligarh Muslim University, Aligarh -

ظفر سعیدی

میر قدر بلگرامی

حیات اور شاعری

سید غلام حسنین میر قدر بلگرامی ضلع لکھنؤ کے مشرقی علاقے بلگرام کے محلّہ سلہٹرہ میں 1833 میں پیدا ہوئے ان کے جدامجد سید محمد عرب سے نقل مکانی کر کے یہاں آباد ہوئے تھے، ان کا سلسلہ نسب امام زین العابدینؒ سے وابستہ ہے، تاہم یہ بات صیغۂ راز میں ہے کہ ان کا عقیدہ ومسلک کیا تھا کیونکہ انھوں نے اپنے مسلک وعقیدے کو مبہم طریقے سے بیان کیا ہے، جیسا کہ درج ذیل شعر سے واضح ہوتا ہے:

خدا معلوم کیا گوگو ہے قدر کا مذہب
کہ شیعہ ہے نہ سنی ہے، مسلماں ہے نہ ہندو ہے

چنانچہ مذکورہ شعر کے مطابق یہ کہنا درست ہوگا کہ میر قدر نظریاتی طور پر مساوات کے علمبردار اور سیکولر نظریے کے حامل شاعر تھے اور ان کے دل میں عام عقائد و مسالک کا احترام تھا، نواب واجد علی شاہ کے عہدِ حکومت میں لکھنؤ کے تقریباً ہر گھر میں شاعری کی طرف میلان تھا، میر قدر بلگرامی اسی عہد میں لکھنؤ گئے، وہ کمسنی ہی سے نہایت تیز طبع تھے، شاعری کی طرف ان کا بھی طبعی میلان ہوا، میر قدر نے اولاً شیخ امان علی سحر کی شاگردی اختیار کی اور ان کے ذریعے قدر تخلص سے نوازے گئے تاہم عروض وقافیے کی انھوں نے مرزا محمد رضا برق سے تعلیم حاصل کی میر قدر کو عروض وقافیے کے فن سے غایت درجہ دلچسپی تھی، لکھنؤ جیسے شہر میں جہاں اردو کے عظیم شعرا موجود تھے، اردو زبان وادب کے حوالے سے سبھی کو ان کی فنی تحقیقات پر اعتماد حاصل تھا، ابتدا میں ان کی غزلیات کی اصلاح سحر نے کی، بعد میں وہ اپنی غزلوں پر برق سے اصلاح لی، جب مشق سخن بڑھی اور کلام میں رنگینی اور طبیعت میں مضمون آفرینی پیدا ہوئی تو ان کے اساتذہ سحر اور برق کا انتقال ہوگیا اور ان دونوں اساتذہ کی وفات کے بعد میر قدر نے اپنے کلام پر امام بخش ناسخ کے شاگرد امداد علی بحر سے اصلاح لی، بحر ان کی شاگردی کو اپنے لیے وجہ افتخار تصور کرتے تھے۔

1856 میں بہار لکھنؤ خزاں کا شکار ہوئی، 1857 میں نواب واجد علی شاہ کی فوج انگریز فوجوں سے نبرد آزما ہوئی، شاہ کی فوج کو شکست ہوئی، اور شاہ کی حکومت تاراج اور لکھنؤ شہر تباہ ہوگیا تو میر قدر لکھنؤ سے بلگرام منتقل ہوگئے، حسن اتفاق سے اسی زمانے میں غدر کے مصائب

1856 میں بہار لکھنؤ خزاں کا شکار ہوئی، 1857 میں نواب واجد علی شاہ کی فوج انگریز فوجوں سے نبرد آزما ہوئی، شاہ کی فوج کو شکست ہوئی، اور شاہ کی حکومت تاراج اور لکھنؤ شہر تباہ ہوگیا تو میر قدر لکھنؤ سے بلگرام منتقل ہوگئے، حسن اتفاق سے اسی زمانے میں غدر کے مصائب سے دوچار مرزا غالب کے خواہر زادے مرزا عباس بیگ دہلوی، نواب غلام حسین شاہجہاں پوری اور خاندان تیموری کے چشم و چراغ مرزا قادر بخش صابر دہلوی کی بلگرام آمد ہوئی، یہاں میر قدر کی موجودگی کا جب انھیں علم ہوا تو اردو ادب کی ان عظیم شخصیات نے غدر کے تمام ایام بلگرام میں گزارنے کا عزم کیا

سے دوچار مرزا غالب کے خواہر زادے مرزا عباس بیگ دہلوی، نواب غلام حسین شاہجہاں پوری اور خاندان تیموری کے چشم و چراغ مرزا قادر بخش صابر دہلوی کی بلگرام آمد ہوئی، یہاں میر قدر کی موجودگی کا جب انھیں علم ہوا تو اردو ادب کی ان عظیم شخصیات نے غدر کے تمام ایام بلگرام میں گزارنے کا عزم کیا، غدر کے موقعے پر جان و مال کی غیر معمولی تباہی کے بعد جب ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط ہوگیا تو وہ تلاش معاش کے لیے صوبہ پنجاب گئے اور وہاں بحیثیت منشی سرکاری فوج میں ملازم ہوگئے، لیکن پنجابی زبان نہ راس آنے کے سبب مستعفی ہوکر دہلی آگئے اور اپنی نظم و نثر میں اصلاح کے لیے مرزا غالب کی شاگردی اختیار کی۔

غالب اور بحر جب تک بقید حیات رہے میر قدر اپنے شعر وسخن میں ان دونوں مشہور شاعروں سے اصلاح کے لیے رجوع ہوئے، اسی سبب ان کے کلام میں دہلی کی سادگی اور لکھنؤ کی نغمگی محسوس ہوتی ہے۔ میر قدر نے اپنی درج ذیل رباعی میں ان چاروں اساتذہ کا تذکرہ کیا ہے:

سیکھے سحر و برق سے بندش کے بند
پھر غالب و بحر بتائے پیوند!
مجھ سا بھی زمانے میں نہ ہوگا اے قدر
بدنام کنندۂ نکو نامی چند

صوبہ اودھ کی جب ازسرنو ضلع بندی کی گئی اور بلگرام خطے کو ضلع ہردوئی میں ضم کیا گیا تو وہ دہلی سے بلگرام واپس آئے، اسی زمانے میں اتر پردیش کے بیشتر علاقوں میں عصری تعلیمی ادارے قائم ہوئے، چنانچہ ضلع ہردوئی کے ڈپٹی کمشنر مرزا عباس بیگ دہلوی کی سفارش سے حاکم ضلع نے ان کو ہردوئی ہائی اسکول میں زبان فارسی کی تعلیم کے لیے بحیثیت مدرس متعین کیا، وہاں ان کی شاعری سے ان کے تلامذہ مستفید اور فن شاعری کی طرف مائل ہوئے، اسکول میں ملازمت کے دوران بھی ان کا مشق سخن جاری رہا اور بعض اوقات ہمہ تن اسی میں مصروف رہے، اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے ان کو کئی بار مصلحتاً فہمائش کی مگر شاعری سے غیر معمولی تعلق کے سبب فہمائش پر توجہ نہ دی۔ چنانچہ ہیڈ ماسٹر نے اس حوالے سے ایک شکایت نامہ محکمۂ تعلیم کو یہ لکھ کر ارسال کیا کہ

منشی میر قدر علم ریاضی سے نابلد ہیں، ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم بہادر سید نے ریاضی کی تعلیم کے لیے ان کو لکھنؤ کے نارمل اسکول میں وقت گزاری کا حکم صادر کیا، وہاں انھوں نے فن ریاضی میں کسی قدر واقفیت حاصل کی، بعدہ وہ ضلع لکھنؤ کے مہونا اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوگئے اور 1857 میں ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم اودھ مسٹر کالن براونگ نے حسنِ خدمت کے تئیں ان کو بطور اعزاز ضلع ہردوئی کے ایک اسکول میں فارسی زبان کے مدرس کی حیثیت سے مقرر کیا، میر قدر نے اسی کی طرف درج ذیل رباعی میں اشارہ کیا ہے:

درجے میں بڑھا ہوا ہے جس تس سے قدر
دورنا ہوا رتبہ یہ کہے کس سے قدر
اول تو مدرس بھی ہے ہردوئی کا
پھر اس پہ ہے ہم عدد مدرس سے قدر

آخری مصرعہ میں 'ہم عدد' اور 'قدر' کے اعداد پر غور کریں تو 304 ہوتا ہے یعنی اس وقت ضلع ہردوئی میں مدرسین کی مجموعی تعداد 304 تھی اور ان میں میر قدر نمایاں تھے اور تمام برسرِ خدمت مدرسین پر ان کو برتری حاصل تھی، میر قدر نے اپنا 'قدر' تخلص تدریسی خدمات سے پیشتر تجویز کیا تھا، یہ خدا کی شانِ کریمی نہیں تو اور کیا کہ اعلیٰ عہدہ بھی ملا تو ان کے تخلص کے عین مطابق۔

میر قدر بے حد ذہین و فطین شاعر تھے، ان کو اساتذہ کے کئی ہزار اشعار یاد تھے، بیشتر ہمعصر شعرا نے جب کبھی ان کے کسی شعر پر تنقید کی تو انھوں نے اس تنقید کا دندانِ شکن جواب دیا، بعض اعتراضات اور ان کے جوابات درج ذیل ہیں۔

میر قدر کا ایک شعر ہے:

دل شرر تھا سوزشِ غم سے اچھل کر رہ گیا
میں جہاں بیٹھا بہ رنگِ شمع جل کر رہ گیا

نواب غلام حسین خاں حسین نے اس شعر پر تنقید کی کہ شمع کے لیے بیٹھنا نہیں بلکہ اٹھنا استعمال ہوتا ہے، میر قدر نے اپنے مذکورہ شعر کی تائید میں مشہور شاعر مصحفی کا یہ مطلع پیش کیا:

شمع کی طرح سے چپ بیٹھے ہیں آسن مارے
گر ہلاتے ہیں زبان جاتے ہیں گردن مارے

میر قدر نے ایک مشاعرے میں جب یہ شعر پڑھا:

قاصد یہ کہنا پا کے میرے یار کا مزاج
پوچھا ہے اک غریب نے سرکار کا مزاج

شہ نشیں پر موجود خواجہ وزیر کے ایک شاگرد نے اس شعر پر اعتراض کیا کہ محبوب کو سرکار کہنا کہاروں کا طریقہ ہے، میر قدر نے جواباً کہا، آپ کے استاد وزیر کا یہ شعر ہے جس میں محبوب کو سرکار کہا گیا ہے:

باغ کو جائے گا ابر سیہ مست اٹھا
پیش خیمہ تو روانہ ہوا سرکار کا آج

میر قدر نے مزید کہا کہ میاں معروف دہلوی کا بھی اسی ضمن میں ایک شعر ہے:

ان دنوں سرکار پر معروف نے کھائے تھے گل
جن دنوں صاحب لیے پھرتے تھے بلبل ہاتھ پر

میر قدر کے مدلل جواب کے بعد خواجہ وزیر کے شاگرد نے سر جھکا لیا اور معاً بعد حاضرین کے قہقہوں سے

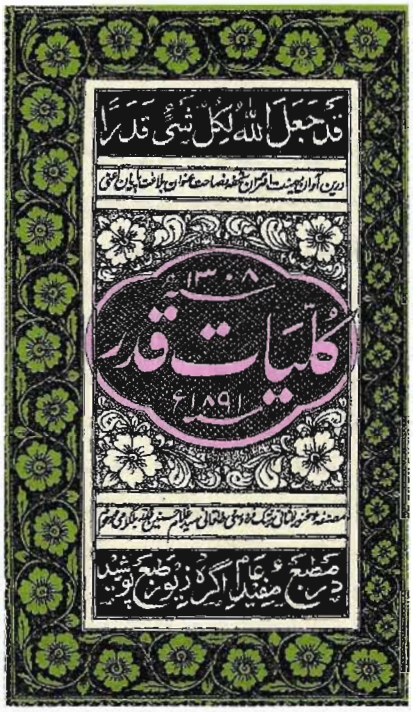

محفل گونج اٹھی۔ اسی طرح میر قدر کے شعر:

کالی آنکھیں ہیں غضب زلفیں بلا خال آفت
ایک سے ایک ہیں کلجگ کے زمانے والے

مذکورہ شعر پر موجد لکھنوی (کالکا پرشاد) نے اعتراض کیا کہ خود جگ کے معنیٰ زمانہ ہے، آخر زمانہ کا تکرار کیوں؟ میر قدر نے جواب دیا کہ کال اور جگ باہم مل کر اسم مرکب اور اسم مرکب کے سبب یہ علم ہے اور علم ہونے کی وجہ سے لفظ زمانہ کا ادخال جائز ہے جیسا کہ ناسخ کا شعر ہے:

تین ترہنی ہیں دو آنکھیں مری
اب الہ آباد بھی پنجاب ہے

میر قدر نے کہا 'ترہنی' یعنی تین بہنی گنگا، جمنا اور سرسوتی ندیاں ہیں، چنانچہ ترہنی پر لفظ تین کا ادخال اسی طرح ہے جس طرح لفظ زمانہ کا جگ پر، میر قدر کی اس معمولی تشریح سے موجد لکھنوی بے حد خوش ہو کر بولے کہ شاعری میں طبع آزمائی صرف وہی شخص کرے جسے آپ کی طرح مثالیں یاد ہوں۔

میاں بحر نے مثنوی قضا و قدر کی تاریخ جب یوں بیان کی:

یہ سنۂ مثنوی قدر ہے
مثنوی قدر مہ قدر ہے

تو مرزا دبیر کے شاگرد ذکی بلگرامی نے اس شعر پر اعتراض کیا کہ مہ قدر سے اگر قدر کا چاند مراد ہے تو اس صورت میں قافیہ مکرر ہے اور اگر ماہ کے بجائے 'شب قدر' مراد ہے تو اس میں لفظ 'شب' موجود ہونا چاہیے، میر قدر نے وضاحت کی کہ یہاں شب کے بجائے قدر مراد ہے اور یہ فنی لحاظ سے درست ہے اور اس کی تائید کے لیے شیخ سعدی کا یہ شعر پڑھا:

دہل زاد گہ دو نوبت دہ بشارت
کہ دو شم قدر بود امروز نوروز

عارف خراسانی نے حافظ شیرازی کے شعر:

صلاح کار کجا و من خراب کجا
ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

پر اعتراض کیا کہ حافظ شیرازی نے اس مطلع میں ایسا پیچ کھایا ہے کہ معاذ اللہ، میر قدر نے کہا کہ ہاں ایک جگہ روی ساکن ہے اور دوسری جگہ متحرک اور فن شاعری میں اس عیب کو 'غلو' کہتے ہیں۔ تاہم جب شاعر اس عیب کا اظہار کر دے تو وہ قابل گرفت نہیں ہوتا اور یہ نکتہ فن قافیہ کی کتابوں میں مذکور ہے، حافظ شیرازی نے اس شعر کے حوالے سے دوبارا اظہار معذرت کیا ہے کہ اول صلاح کار یعنی صحت کجا اور من خراب کہاں دوسرے کجا سے کجا تک راہ میں فرق پیدا ہو گیا ہے یعنی روی متحرک ہو گئی ہے، میر قدر کی اس وضاحت سے عارف حیران رہ گئے، میر قدر نے اس مباحثے کو درج ذیل قطعہ میں بیان کا ہے:

نوشت مطلع پرنور خواجہ شمس الدین
بدیں فروغ گہربار و از سحاب کجا
صلاح کار کجا و من خراب کجا
ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بکجا
فتاد عقدہ در اندیشہ خردہ گیراں را
ز لفظ تا بکجا و دگر خراب کجا

که یک روی متحرک دگر روی ساکن
خطاست بہر خطا حکم ارتکاب کجا

غلو اگرچہ بود عیب مر قوافی را
تر است پایہ ایں چہ احتساب کجا

مباش غرہ بدیں یک دو نکتہ دانستن
نظر بود ہمہ کس را بہر کتاب کجا

نخست گفت کہ اے صاحبان دانش و داد
صلاح کار کجا و من خراب کجا

سپس ز نفس خطا تازہ کرد عذر خطا
ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

اشارہ چست و عبارت بلیغ و عذر لطیف
اگر خطا بود اینہا دگر صواب کجا

مباش رنجہ ز غوغاے مدعی اے قدر
سخن یکے است جواب ترا جواب کجا

میر قدر کی اس کے علاوہ دیگر ہمعصر شعرا سے بھی فن شاعری میں بحث ہوئی جو کہ ضبط تحریر میں نہ آسکی، اگر ان کی فن شاعری میں بحث و مباحثہ کی تمام باتیں محفوظ ہوتیں تو شعر و شاعری کے شیدائیوں کی معلومات میں اضافہ ہوتا، البتہ یہ کہاوت مشہور ہے کہ اگر تمام چیزیں حاصل نہ ہوں تو اس کے سبب تھوڑی چیزوں کو ترک نہیں کرنا چاہیے، چنانچہ اس کہاوت کے مطابق میر قدر کے چند شعری مباحثے یہاں ذکر کیے گئے تاکہ میر قدر کی شعری پختگی کے تعلق سے قارئین کی معلومات میں اضافہ ہو۔

میر قدر کی تدریسی خدمات کے تعلق سے منقول ہے کہ جب کینیک کالج کے اورینٹل ڈپارٹمنٹ کے درجہ فارسی کے مدرس منشی محمد ظہیر الدین بلگرامی کا انتقال ہوا، اس وقت مرزا عباس بیگ دہلوی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد مذکورہ کالج کے ممبر منتخب ہوئے، انھوں نے میر قدر کے لیے وہ خالی جگہ تجویز کی اور ہر دوئی سے ان کو طلب کیا اور کمشنر کی منظوری سے آپ کی وہاں تقرری ہوگئی۔ میر قدر نے اس کالج میں سات سال چھ ماہ نہایت جانفشانی اور دلچسپی سے تدریسی خدمات انجام دی اور طلبا پر خصوصی توجہ اور آپ کے فیض تعلیم سے اورینٹل کالج کے طلبا نے اعلیٰ درجے کی علمی لیاقت حاصل کی اور ہمیشہ امتحانات میں کامیاب ہوئے، اسی زمانے میں میر قدر نے اورینٹل ڈپارٹمنٹ کے سنسکرت کے پروفیسر پنڈت جٹاشنکر پانڈے بھٹاچاریہ بنارسی سے عروض ہندی (پنگل) کی تعلیم حاصل کی، میر قدر نے ان سے اس فن میں استفادہ کرکے مارہ مہرہ کا اردو زبان میں ترجمہ کیا جس میں انھوں نے فن عروض کی نئی باتیں بیان کی، افسوس کہ بے وقت ان کی وفات کے سبب قواعد عروض کی طرح فن قافیہ میں ایک تفصیلی کتاب معرض وجود میں نہ آسکی:

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

میر قدر نے کینیک کالج میں 1883 تک تعلیمی خدمات انجام دی، جنوری 1884 میں وہ والی دکن میر محبوب علی آصف جاہ کی تخت نشینی کی تقریب میں مرزا غالب کے نواسے مرزا بیگ خان کی فہمائش سے کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے، وہاں سے حیدرآباد کا سفر مقصود تھا، تاہم والی دکن سے بنارس میں ملاقات ہوگئی۔

میر قدر کی اس کے علاوہ دیگر ہمعصر شعرا سے بھی فن شاعری میں بحث ہوئی جو کہ ضبط تحریر میں نہ آسکی، اگر ان کی فن شاعری میں بحث و مباحثہ کی تمام باتیں محفوظ ہوتیں تو شعر و شاعری کے شیدائیوں کی معلومات میں اضافہ ہوتا، البتہ یہ کہاوت مشہور ہے کہ اگر تمام چیزیں حاصل نہ ہوں تو اس کے سبب تھوڑی چیزوں کو ترک نہیں کرنا چاہیے، چنانچہ اس کہاوت کے مطابق میر قدر کے چند شعری مباحثے یہاں ذکر کیے گئے تاکہ میر قدر کی شعری پختگی کے تعلق سے قارئین کی معلومات میں اضافہ ہو۔

وہاں انھوں نے ان کی شان مرتبت میں قصیدہ تہنیت پیش کیا اور اس کے صلے میں خصوصی لباس سے نوازے گئے اور براہِ کلکتہ آصف جاہ کے ہمراہ حیدرآباد آئے اور حکومت آصفیہ کے ملازم ہوگئے، تنخواہ چار سو روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ یہ شاعری میں ان کے کمال فن کا اعزاز تھا کہ اس دور میں اتنی زیادہ تنخواہ پر وہ ملازم ہوئے۔ (موجودہ دور میں ہندوستان میں چار سو روپے ایک کروڑ 32 لاکھ کے مساوی ہے) یہ حقیقت ہے کہ کسی فن میں کمال سے انسان کو ضرور اعزاز حاصل ہوتا ہے، تاہم موجودہ زمانے میں اب اردو زبان ہمارے گھروں سے نکلتی جارہی ہے اور بدلتے حالات میں اردو شاعری دم توڑ رہی ہے، ہر طرف ہندی اور انگریزی زبانوں کو فروغ حاصل ہے، میر قدر حالانکہ انگریزی کا ایک حرف نہیں جانتے تھے اور عربی زبان سے بھی معمولی واقفیت تھی، مگر شاعری میں چونکہ ان کی ساری عمر گزری تھی اور اساتذہ کا فیض پایا تھا، اسی کے باعث وہ اوج کمال تک پہنچے۔

میر قدر مرحوم نہایت ضعیف و ناتواں شخص تھے، مستزاد یہ کہ دمہ اور ضعف معدہ کے مریض تھے، آب و ہوا کی تبدیلی کے باعث ان بیماریوں میں اضافہ ہوا، علاج کی غرض سے حیدرآباد سے لکھنؤ گئے لیکن وہاں بھی شفایاب نہ ہوئے اور باون سال کی قلیل عمر میں 14 ستمبر 1884 بروز اتوار شہر لکھنؤ میں ان کی وفات ہوگئی اور وہیں قبرستان میر خدا بخش میں ان کی تدفین ہوئی۔

میر قدر بلگرامی کے بکثرت تلامذہ تھے، ان کے فرزند کا ان کی حیات میں انتقال ہوا، ان کی یادگار ان کا کلام رہ گیا، ان کی متعدد تصنیفات ہیں مثلاً (1) دیوانِ غزلیات و قصائد، دو جلدیں (2) مثنوی قضا و قدر (3) عطر مجموعہ شرح مجموعہ سخن (4) رسم عرفی شرح قصائد عرفی (5) نظم الارکان فی تقطیع ابیات گلستان (6) قواعد العروض پنگل معروف بہ مارمہرہ (7) مصطلحات اردو (نامکمل) (8) متفرقات۔

مثنوی قضا و قدر کے آخر میں ان کی مسدس بھی شامل ہے، عطر مجموعہ کے لیے انگریز حکومت نے ان کو انعام سے نوازا تھا، قواعد العروض دراصل مارمہرہ کا ترجمہ ہے، ان کے تمام اشعار پر مشتمل کلیات 'کلیات قدر' کے نام سے موجود ہے جو کہ 1891 میں مطبع مفید عام آگرہ (یوپی) سے شائع ہوئی ان کا علیحدہ سے کوئی دیوان نہیں ہے، ان کی کلیات سے دیوان مرتب کیا جاسکتا ہے، ان کی تاریخ وفات ان کے شاگردوں اور دیگر ہمعصر شعرا نے مختلف اشعار میں بیان کی ہے، چونکہ ان کی تاریخ وفات سے متعلق اشعار سیکڑوں کی تعداد میں ہیں، اس مختصر مضمون میں ان تمام اشعار کو نقل کرنا مشکل ہے، لہٰذا تاریخ وفات کی نشاندہی کے لیے منشی محمد احمد کا یہ شعر کافی ہے:

آہ کہ شد رنگ و بو از چمن شاعری
موبہ کہ استاد قدر رفتہ زد ارفنا

رنگ و بو: 1301ھ
استاد قدر: 1884ء

Zafar Sayeedi, Ashoka Plaza, 1st Floor
102, Masabtank, Hyderabad - 500028 (AP)

کوثر مظہری

سید وحید اختر نقوی

وحید اختر اس لحاظ سے جدید اردو شاعری میں ایک اہم اور منفرد مقام پر فائز نظر آتے ہیں کہ انھوں نے غزل، پابند نظم اور آزاد نظم میں فکر وفن کے جوہر دکھانے کے علاوہ اپنی مرثیہ نگاری سے بھی اردو کے شعری سرمائے کی شان بڑھائی ہے۔ وہ ابتدا سے ہی ترقی پسند تحریک کے رجحانات سے متاثر تھے اور شاعری کے علاوہ تنقید نگاری میں بھی اپنی خاص جگہ بنانے میں وہ کامیاب رہے۔

ان کا اصل نام سید وحید اختر نقوی تھا۔ 12 اگست 1935 کو وہ مومن پورہ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور سید نذر عباس ان کے والد تھے۔ تاہم ان کا آبائی وطن نصیر آباد، جائس (اتر پردیش) تھا۔ وحید اختر کو خاندانی طور پر فارغ البالی حاصل نہیں تھی۔ ان کا بچپن، لڑکپن اور جوانی تینوں سخت دشواریوں سے گزرے۔ انھوں نے خود ہی لکھا ہے کہ پرائمری اسکول کے زمانے سے ہی زندگی کی سختیوں، دشواریوں اور جسم و جان کے رشتے کو برقرار رکھنے کی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔

وحید اختر کا خاندانی ماحول خاصا مذہبی اور روایتی تھا۔ محرم کے دنوں میں مذہبی امور و رسوم کی پابندی بڑھ جایا کرتی تھی۔ قرآن خوانی، نماز اور روزے کی پابندی وحید اختر کا شیوہ بن چکی تھی۔ اسکول کے زمانے ہی میں انیس کے مرثیے سنے اور پڑھے، جس سے ان کا ذوقِ شعری بیدار ہوا۔ خود بھی مرثیہ خوانی کرنے لگے اور ذرا طبیعت مائل ہوئی تو مرثیے بھی کہنے لگے۔

وحید اختر ایک ذہین و فطین شخص تھے۔ ایک تو ایام طفولیت سے لے کر جوانی تک انھوں نے دکھ اٹھائے تھے، دوسرے یہ کہ اپنوں کی بے مروتی نے انھیں انا پرست بھی بنا دیا۔ یوں بھی ان کی طبیعت میں ایک طرح کی تندی و تلخی تھی۔ وہ آسانی سے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ وحید اختر کی طبیعت کی تیزی، انانیت اور ایک طرح کے خلاقانہ تیور کا اندازہ ان کی شاعری اور تنقیدی مضامین سے بھی ہوتا ہے۔

اورنگ آباد میں انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد وحید اختر 1952 میں بی۔ اے میں داخلے کی غرض سے حیدرآباد تشریف لے گئے۔ حیدرآباد کی ادبی فضا میں وحید اختر نے کم و بیش آٹھ برس گزارے۔ چوں کہ وہ بہت ذہین اور اسکالرشپ سے معمور شخصیت کے حامل تھے اس لیے جلد ہی انھیں شہرت ملی اور حیدرآباد کے حلقہ ادب میں شامل ہو گئے۔

وحید اختر نے لکھا ہے کہ جب عثمانیہ کے دروازے بند ہو گئے تو انھیں علی گڑھ کا رخ کرنا پڑا۔ 1960 میں انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی اور وہ پریشاں حالی میں علی گڑھ آ گئے۔ یہاں ان کے مقدر نے ساتھ دیا اور وہ جنرل ایجوکیشن سنٹر میں شعبۂ علوم انسانی میں لکچرر ہو گئے۔ دو برسوں کے بعد ایرانی خاتون مہ لقا سے ان کی شادی ہو گئی۔ اپنی شادی پر وحید اختر طمانیت اور سکون کا اظہار کرتے تھے۔

علی گڑھ آنے سے پہلے وحید اختر کو شہرت مل تو گئی تھی لیکن یہاں آنے کے بعد ان کی ذہانت اور علمی درّاکی کو ایک طرح کی سمت ملی اور تصنیف و تالیف کے کام میں نکھار پیدا ہوا۔ یہیں آنے کے بعد ان کے تینوں شعری مجموعے پتھروں کا مغنی (1966)، شب کا رزمیہ (1963)، زنجیر کا نغمہ (1981) شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ خواجہ میر درد، تصوف اور شاعری (1971) اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ فلسفہ اور ادبی تنقید (1972) جیسی کتابیں بھی علی گڑھ کے زمانے ہی میں شائع ہوئیں۔ اس کے بعد مراثی کا مجموعہ 'کربلا تا کربلا' بھی علی گڑھ کے دوران قیام 1990 میں شائع ہوا۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو وحید اختر کی ادبی زندگی کو استحکام بخشنے میں علی گڑھ کا بڑا اہم رول رہا ہے۔

1995 میں وحید اختر نے ایران کا آخری سفر کیا۔ اس سے پہلے بھی وہاں ان کا قیام رہ چکا تھا۔ وہاں وہ رسالہ التوحید (انگریزی) کے وہ مدیر (1984) رہے تھے۔ اس بار کے سفر میں وہ عارضہ قلب میں مبتلا ہوئے اور پھر اسی سال گردے کی خرابی ہوئی جس کے سبب انھیں حیدرآباد کے اپولو اسپتال میں داخل کرایا گیا۔ اس کے بعد چند مہینوں میں 1996 میں انھیں آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ (AIIMS) میں داخل کرایا گیا۔ آخر کار وہ وقت آ پہنچا کہ وہ 13 دسمبر 1996 کو آغوش اجل میں چلے گئے اور اپنے ادبی وجود کا سکّہ جہان ادب پر بٹھا گئے۔

وحید اختر اردو شعر و ادب کا ایک ایسا نام ہے جو 'ہست اور بود' کے ساتھ اپنی موجودگی ثابت کر چکا ہے۔ 'ہست' اس لیے کہ ان کی شاعری اور تنقیدی تحریروں کا اعتراف کیا جا رہا ہے، گرچہ انھیں حاشیے پر رکھنے کی کوششیں بھی ہوئیں۔ 'بود' اس لیے کہ اب بھی اُن کی تمام چیزیں اشاعت پذیر ہونے کی منتظر ہیں۔ لیکن کسی بھی تخلیقی آگ کو بہت دنوں تک دبایا نہیں جا سکتا۔

■

ماخذ: وحید اختر (مونوگراف): کوثر مظہری، **ناشر:** ساہتیہ اکادمی، دہلی

وحید اختر

انتخاب کلام وحید اختر

پتھروں کا مغنّی

مطربِ خوشنوا زندگی کے حسین گیت گاتا رہا
اس کی آواز پر انجمن جھوم اٹھی
اس نے جب زخمِ دل کو زباں بخش دی
سننے والوں نے بے ساختہ آہ کی
عشق کے ساز پر جب ہوا زمزمہ زن
شورِ تحسیں میں خود اُس کی آواز دب سی گئی

مطربِ خوشنوا پھر بھی تنہا رہا

تشنگی مشام اُس کو بادِ صبا کی طرح گُل بہ گُل لے گئی
کاسۂ چشم نے پر تو گل بھی پایا نہیں
درد اُس کا کسی محرمِ درد کے واسطے
در بہ در، شہر در شہر پھرتا رہا
داد و تحسیں کے ہنگامۂ ذوق کش میں اُسے
ہر طرف سے ملامت کے پتھر ملے
مطربِ خوشنوا پتھروں سے پٹکتا رہا اپنا سر
پتھروں کو زباں تو ملی، پر تکلم نہیں
پتھروں کو ملے ہونٹ، لیکن تبسم نہیں
پتھروں کو ملی آنکھ، لیکن نظر کون دیتا اُنھیں
پتھروں کو ملے کان، پر ذوقِ نغمہ نہیں
پتھروں کو خدا خالِ انساں ملے، دولتِ درد و غم کب ملی
پتھروں کو حسیں صورتیں تو ملیں، دل نہیں مل سکا
پتھروں کو ملے پاؤں، پر اعتمادِ سفر کون دے
پتھروں کو ملے ہاتھ پر عزمِ تیشہ زنی کون دے

سنگ سنتے ہیں، لیکن سمجھتے نہیں
دیکھتے ہیں، مگر فرق کرتے نہیں
بات کرتے ہیں، محسوس کرتے نہیں
ٹوٹ سکتے ہیں، لیکن پگھلتے نہیں
گرد بن کر یہ اڑ جائیں، سانچوں میں ڈھلتے نہیں

مطربِ خوشنوا پتھروں سے پٹکتا رہا اپنا سر
مطربِ خوشنوا پتھروں کو سناتا رہا دردِ دل
اپنا غم/اُن کا غم/سب کا غم
پتھروں نے سنا اور چپ چاپ ہنستے رہے
پتھروں کی اسی انجمن کا مغنّی ہوں میں
اور بے درد، بے حس، ستم گار پتھر سنیں گے کبھی
اُن کا وہ مطربِ خوشنوا/شکوہ سنجِ زماں
اپنے نغمات کی آگ میں جل گیا
پھر اُن ہی کے مانند پتھر کا بت بن گیا

(59ء)

معراج

نیند آنکھوں سے لگی بیٹھی ہے
نیم خوابیدہ نگاہوں نے سجا رکھے ہیں احساس کے آئینوں
میں اَن گنت اوراق
ساری تصویریں ہیں دھندلائی ہوئی
مطلعِ ذہن پہ چھایا ہے دھندلکے کا سماں
خوابِ نادیدہ و دیدہ ہیں بہم رقص کناں

نیند کے در پہ ہوئی دستک سی
کس نے زنجیرِ خیالات کو جنبش دی ہے
جگمگانے لگے احساس کے آئینوں میں رنگیں اوراق
بول اُٹھیں جاگتی سوتی ہوئی تصویریں بھی
مطلعِ ذہن سے پھوٹی شفق نور آثار
خوابِ نادیدہ نے آنکھوں سے ہٹا دی چلمن
ماضی و حال نے آیندہ زمانوں کی حدوں میں جھانکا
پاؤں کی چاپ سے گونج اٹھا سراپردۂ خواب
کھنچ گئیں پھیلی فضاؤں کی، خلاؤں کی طنابیں اک بار
چشمِ سیارو ثوابت سے لڑی ارض کی چشمِ بیدار
رقصِ افلاک بھی اب دسترسِ شوق میں ہے
خواب ہی خواب ہیں ہر سُو رقصاں
جل گئے شہپرِ جبریل کہیں سدرہ پر
اب ہے خود شوقِ سفر جادہ طراز و رہبر

کب کا تکمیل کو پہنچا سفرِ ہفت افلاک
پھر بھی زنجیرِ تخیل میں ہے جنبش اب تک
اس سے آگے بھی ہیں شاید کئی نادیدہ جہاں منتظرِ چشمِ بشر

(66ء)

دیمک

کرمِ خوردہ کاغذوں کے ڈھیر میں مدفون ہے
چاٹتا ہے حرف حرف
دائرے، قوسین، سنہ، تاریخ، اعداد و شمار
نقطہ و زیر و زبر، تشدید و مد
حاصلِ بینائی و ذوقِ نظر
باندھتا ہے وہم و تخمین و گماں کے کچھ حصار
پونچھتا ہے وقت کا گرد و غبار
چومتا ہے کتبۂ لوحِ مزار
چند نقطے اُڑ گئے ہیں، لفظ کچھ کا واک ہیں
اس کی نظروں میں خزینہ علم کا خار و خس و خاشاک ہیں

کیا علائم، کیا رموز، اشکال، الفاظ و حروف
آتشِ تغیّر کے ہاتھوں پگھل جاتے ہیں سب
وقت کی بھٹی میں تپ کر اک نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں سب
لمحہ لمحہ منکشف ہوتا ہوا سرِّ حیات
منجمد الفاظ کے سینے میں اپنا نور پھیلاتا نہیں
کرمِ خوردہ کاغذوں کی لاش میں
خوں اپنا دوڑاتا نہیں
کرم کاغذ ہے حریفِ روز و شب
چاٹتا ہے فضلۂ علم و ادب
اور سر اکڑائے خلاقانِ معنی کی طرف خندہ بہ لب

(24 دسمبر 1965)

غزلیں

دیوانوں کو منزل کا پتا یاد نہیں ہے
جب سے ترا نقشِ کفِ پا یاد نہیں ہے
افسردگیِ عشق کے کھلتے نہیں اسباب
کیا بات بھلا بیٹھے ہیں، کیا یاد نہیں ہے
ہم دل زدگاں جیتے ہیں یادوں کے سہارے
ہاں مٹ گئے جس پر وہ ادا یاد نہیں ہے
گھر اپنا تو بھولی ہی تھی آشفتگیِ دل
خود رفتہ کو اب در بھی ترا یاد نہیں ہے
لیتے ہیں ترا نام ہی یوں جاگتے سوتے
جیسے کہ ہمیں اپنا خدا یاد نہیں ہے
یہ ایک ہی احسانِ غمِ دوست ہے کیا کم
بے مہریِ دوراں کی جفا یاد نہیں ہے
بے برسے گزر جاتے ہیں اُمڈے ہوئے بادل
جیسے انھیں میرا ہی پتا یاد نہیں ہے
اس بار وحید آپ کی آنکھیں نہیں برسیں
کیا جھومتی زلفوں کی گھٹا یاد نہیں ہے

✪

کیوں تری قندیلی، خوش سخنی یاد آئی
زہرافشانیِ دنیائے دنی یاد آئی
پئے گل گشتِ چمن پھر دلِ دیوانہ چلا
پھر تری سروقدی، گل بدنی یاد آئی
جب کسی جسم پہ سجتے ہوئے دیکھا ہے لباس
تیری خوش قامتی، خوش پیرہنی یاد آئی
یوں نباہا ترا وعدہ ترے غم نے برسوں
غمِ ایام کی پیماں شکنی یاد آئی
جام اٹھاتے ہی دل اُمڈا تو بھر آئیں آنکھیں
چشمِ ساقی تری ساغر شکنی یاد آئی
یاد آئی نہ کبھی بے سروسامانی میں
دیکھ کر گھر کو غریب الوطنی یاد آئی
آج دکھلاتے گل افشانیِ گفتار وحید
لگ گئی چپ جو وہ غنچہ دہنی یاد آئی

✪

ہم کو منظور تمھارا جو نہ پروا ہوتا
سارا الزام سر اپنے ہی نہ آیا ہوتا
دوست احباب بھی بے گانے نظر آتے ہیں
کاش اِک شخص کو اتنا بھی نہ چاہا ہوتا
مفت مانگا تھا کسی نے، سو اُسے بخش دیا
ایسا سستا بھی نہ تھا دل، جسے بیچا ہوتا
جان کر ہم نے کیا خود کو خراب و رسوا
ورنہ ہم وہ تھے فرشتوں نے بھی پوجا ہوتا
اہلِ دنیا کو بہت ہم سے بھی امیدیں تھیں
زندگی! تجھ سے مگر اپنا نہ جھگڑا ہوتا
ناصحو! ہم کو بھی انجامِ جنوں ہے معلوم
اُس کو سمجھاؤ جو یہ سب نہ سمجھتا ہوتا
وہ خردمند، وہ باہوش وحید آج کہاں
ملنے والوں سے کبھی تم نے یہ پوچھا ہوتا

✪

رہے وہ ذکر جو لب ہائے آتشیں سے چلے
چلے وہ دور جو رفتارِ ساتگیں سے چلے
ہزاروں سال سفر کرکے پھر وہیں پہنچے
بہت زمانہ ہوا تھا ہمیں زمیں سے چلے
خرد بنی رہی زنجیرِ پائے شوق مگر
جنوں کے جتنے بھی ہیں سلسلے ہمیں سے چلے
فرات جیت کے بھی تشنہ لب رہی غیرت
ہزار تیرِ ستم ظلم کی کمیں سے چلے
زمانہ ایک ہی رستے پہ لاکے چھوڑے گا
رواں ہے ایک ہی دھارا، کوئی کہیں سے چلے
گمان و شک کے دوراہے پہ ہم سے آکے ملے
وہ قافلے جو کسی منزلِ یقیں سے چلے
ہمیں شکستِ حریفاں کا بھی ملال رہا
شکستہ دل جو ہم اُس بزمِ دل نشیں سے چلے
تمام گمرہیاں دیر اور حرم میں پلیں
تمام سلسلۂ کفر اہلِ دیں سے چلے
وحید سیلِ قیامت نے راہ رو کی تھی
جو بن کے اشک ہم اُس چشمِ نازنیں سے چلے

✪

جس کو مانا تھا خدا، خاک کا پیکر نکلا
ہاتھ آیا جو یقیں وہم سراسر نکلا
اِک سفر دشتِ خرابی سے سرابوں تک ہے
آنکھ کھولی تو جہاں خواب کا منظر نکلا
کل جہاں ظلم نے کاٹی تھیں سروں کی فصلیں
نم ہوئی ہے تو اُسی خاک سے لشکر نکلا
تھی تہی دست ہر اک شاخ خزاں تھی جب تک
فصلِ گل آئی تو ہر شاخ سے خنجر نکلا
خشک آنکھوں سے اٹھی موج تو دنیا ڈوبی
ہم جسے سمجھے تھے صحرا وہ سمندر نکلا
دشتِ بے حاصلیِ عمرِ تمنا کفِ خاک
بحر و حشت کے لیے بوند سے کم تر نکلا
زیرِ پا اب نہ زمیں ہے، نہ فلک ہے سر پر
سیلِ تخلیق بھی گرداب کا منظر نکلا
گم ہیں جبریل و نبی، گم ہیں کتاب و ایماں
آسماں خود بھی خلاؤں کا سمندر نکلا
عرش پر آج اُترتی ہے زمینوں کی وحی
کرۂ خاک ستاروں سے منوّر نکلا
ہر پیمبر سے صحیفے کا تقاضا نہ ہوا
حق کا یہ قرض بھی نکلا تو ہمیں پر نکلا
گونج اٹھا نغمۂ کُن دشتِ تمنا میں وحید
پائے وحشت حدِ امکاں سے جو باہر نکلا

✪

ترے سخن سے لبِ خوش مقال روشن ہیں
تری نگہ سے مرے خط و خال روشن ہیں
شعاعِ مہر نے شبنم کو دیے ہیں شہپر
ترے جمال سے میرے کمال روشن ہیں
تری نظر سے چھٹی دُھند، پھٹ گئے بادل
غبارِ خاطر و گردِ ملال روشن ہیں
جہاں جہاں ترے قدموں نے نقش چھوڑے ہیں
وہیں ستارۂ و بدر و ہلال روشن ہیں
تو دور ہو کہ قریں، تیرا نور ہے ہمراہ
شعاعِ ہجر و چراغِ وصال روشن ہیں
ترے نفس کا کرم، لطفِ جاں فروز کا فیض
خوشی کے پھول، غموں کے نہال روشن ہیں
وحید یورشِ تلخی و تیرگی ہے عبث
کہ میرے ماضی و فردا و حال روشن ہیں

✪

اک دشتِ بے اماں کا سفر ہے، چلے چلو
رُکنے میں جان و دل کا ضرر ہے، چلے چلو
حکام و سارقین کی گو رہ گزر ہے گھر
پھر بھی برائے بیت تو در ہے، چلے چلو
مسجد ہو، مدرسہ ہو کہ مجلس کہ مے کدہ
محفوظ شر سے کچھ ہے تو گھر ہے، چلے چلو
ظلمت ہے یاں بھی، واں بھی اندھیرے ہی ہوں تو کیا
نور اک ورائے حدِّ نظر ہے چلے چلو
اُترا کنارِ بحر عطش ایک قافلہ
ختم اس پہ تشنگی کا سفر ہے، چلے چلو
سر تک پہنچ نہ جائے کوئی تیزگام لہر
یاں خوں کی موج تا بہ کمر ہے، چلے چلو
جاں کے زیاں کا ڈر ہے طلب میں اگر تو ہو
ترکِ طلب میں بھی تو خطر ہے، چلے چلو

شہید عطش

(درحال علی اصغر ابن الحسین)

برسی نہیں نغموں کی گھٹائیں کئی دن سے — سنکی نہیں مدھ ماتی ہوائیں کئی دن سے
لب بستہ ہیں جینے کی دعائیں کئی دن سے — ناکردہ ہیں معصوم خطائیں کئی دن سے
وہ حبس ہے، آواز کا دم ٹوٹ رہا ہے
ہر گیت کا، ہر ساز کا دم ٹوٹ رہا ہے

اے خالقِ الفاظ، مسیحائے معانی — اے صانعِ لوح و قلم و سحر بیانی
اے صاحبِ کن سازِ سکوتِ ہمہ دانی — اے نغمۂ گل، صوتِ لبِ غنچہ دہانی
زاغ و زغن و بوم نوا سنج ہیں کب سے
لب بستہ ہیں مرغانِ خوش الحان ادب سے

تو نے ہی زباں بخشی ہے پتھر کے دہن میں — کانٹوں کو کیا محتسبِ غنچہ چمن میں
بوجہل کیے پیدا رسولوں کے وطن میں — پھر حکم دیا صبر کا ہر رنج و محن میں
جس سینے کو عرفان کے بخشے ہیں سمندر
اس سینے پہ رکھوا دیے خاموشی کے پتھر

مدت ہوئی معنی نے نہ کی چہرہ نمائی — الفاظ لیے پھرتے ہیں کشکولِ گدائی
تخئیل نے پرواز کی مہلت نہیں پائی — بے رنگ ہیں نظریں کہ دھنک ہاتھ نہ آئی
کیا شعر و ادب، گردِ لطافت نہیں ملتی
یوں زندہ ہیں جینے کی اجازت نہیں ملتی

یہ عہدِ پُرآشوب کہ ہم کو جو ملا ہے — اس بانیِ بیداد کا انداز نیا ہے
دِن نکلے تو معلوم ہو دل ڈوب رہا ہے — شام آئے تو بجھتا ہوا مرقد کا دیا ہے
ہر ایک نفس عمرِ عذابِ دو جہاں ہے
دھڑکن بھی مزاجِ دلِ نازک پہ گراں ہے

ہے قافلۂ وقتِ رواں سیلِ فنا کا — اڑتے ہوئے لمحات کا رکتا نہیں دریا
امّید کا ہر لمحہ ہے اک خوابِ رمیدہ — ڈھونڈو تو نشانِ کفِ پا بھی نہیں ملتا
اس راہ میں ہر موڑ کمیں گاہِ اجل ہے
جو ہاتھ ہے مجروح ہے، جو پاؤں ہے شل ہے

اِک سمت یہ پروازِ ترقی ہے بشر کی — ہے قبضۂ قدرت میں عناں شمس و قمر کی
افلاک میں ہے دھوم زمیں زاد نظر کی — مِنّت نہیں درکار دعاؤں کو اثر کی
ہر عقدۂ تقدیرِ جہاں کھلنے لگا ہے
خورشید بھی ہم وزنِ خزف تلنے لگا ہے

اور دوسری جانب ہیں غمِ زیست کے سائے — اندیشۂ جاں سے نہ یہاں نیند بھی آئے
اس آگ کے طوفاں میں کوئی چین نہ پائے — آنکھوں کے لیے خواب بھی اپنے ہیں پرائے
ذرّے کا بھی دل ٹوٹے تو ہل جاتی ہے دنیا
پرساں نہیں کوئی دلِ انساں کی تڑپ کا

انسان ہے انسان کی صحبت سے گریزاں — نے پاسِ مروّت ہے، نہ ہے عشق پہ ایماں
اخلاص کے پھولوں سے بھی خوشبو ہے پرافشاں — ہر نقش تعلق کا ہے خود آپ سے نالاں
اسرار زماں اور مکاں کے تو ہیں روشن
کھلتا نہیں کون اپنا ہے اور کون ہے دشمن

دل محض ہے اک آلۂ خوں فیض مشیں سے — دنیا سے تعلق، نہ علاقہ کوئی دیں سے
ہے علم کا سینہ بھی تہی سوزِ یقیں سے — احساس کا رشتہ ہے زماں سے نہ زمیں سے
ہیں جسم کہ مرغولے بھٹکتے ہیں ہوا میں
ہیں ذہن کہ شعلے سے بھڑکتے ہیں خلا میں

ہے شعبدۂ مکر فنِ اہلِ سیاست — بک جاتی ہے، لُٹ جاتی ہے افکار کی عصمت
ممنوع ہے، معتوب ہے ذہنوں کی دیانت — ممدوح ہے، مرغوب ہے ایماں کی تجارت
یہ طرفہ ستم وقت نے ایجاد کیا ہے
ویران ہیں گھر، روضوں کو آباد کیا ہے

گر کوئی کرے عظمتِ انساں کا سبق یاد — آوارہ وطن ہوتا ہے وہ خانماں برباد
ہے فکرِ معاش اُس کے لیے روز کی بیداد — آئین فقیہانِ ہوس کرتا ہے ارشاد
تقدیسِ محبت کا بھی ذکر آنے نہ پائے
یہ شمع تہہِ دامنِ فکر آنے نہ پائے

بیدار نگاہوں پہ ہے نظاروں کی قدغن — حسّاس دلوں کے لیے ہر بات ہے الجھن
تابندہ دماغوں میں ہیں افکار کے مدفن — فرخندہ جبینوں کا ہر اک سنگ ہے دشمن
اے بے ہنری! پاؤں اماں جاں کو تو بولوں
میزانِ مژہ پر غمِ کونین کو تولوں

بازارِ زر و سیم میں کھولی ہے وہ دکّاں — جس جنس کی قیمت نہیں جز نالۂ حیراں
در در پہ گیا لے کے میں شمعِ دلِ سوزاں — ہے کون خریدارِ دُرِ اشکِ غریباں
جو آنکھ بھی چھلکے، وہ مرا دیدۂ تر ہے
جو قلب ہو صد چاک، مرا لختِ جگر ہے

اس طور سے مضمون سخن جمع کیا ہے — ہر دامنِ گل بن کے صبا میں نے سیا ہے
شبنم میں تھا جو زہر، کرن بن کے پیا ہے — ہر ایک صدف کو دُرِ نایاب دیا ہے
تب فن نے بھی یوں میری مسیحائی ہے مانی
گر لفظ کو چھو لوں تو پُکار اُٹھیں معانی

اک عمر میں عقدہ یہ کھلا طبعِ رواں پر — سودائے سخن کی ہے بِنا صرف زیاں پر
نغمہ جو کوئی چھیڑیں تو بن جاتی ہے جاں پر — دانش کے گہر رولیں تو بندش ہے زباں پر
پتھر سے جو سر پھوڑیں تو نغمات کا خوں ہو
سورج سے اگر رشتہ ہے، ذرّات کا خوں ہو

اک عمر سے ہوں موردِ بیداریِ جاں کاہ — جھپکی بھی ہو گر آنکھ تو شاہد ہے خود اللہ
اس دشتِ سیہ بخت میں سایہ نہ کہیں چاہ — بچھڑے ہوئے خوابوں کو جو ڈھونڈوں تو نہیں راہ
بے مونسِ غم شامِ بلا کاٹ رہا ہوں
تنہائی کی سفّاک سزا کاٹ رہا ہوں

جو خواب بھی دیکھا وہ پریشاں نظر آیا — اپنا جسے سمجھا، وہ گریزاں نظر آیا
جس باغ کو سینچا، وہی ویراں نظر آیا — پوچھا جسے وہ چاک گریباں نظر آیا
جو ہے ستمِ دہر سے فریاد بہ لب ہے
کلیوں سے سبب چپ کا جو پوچھیں تو غضب ہے

اشفاق احمد

اشفاق احمد کی پیدائش 22 اگست 1925 بروز پیر شہر ہوشیار پور کے موضع خان پور میں ہوئی۔ ان کی تعلیمی زندگی کا آغاز گاؤں فیروز پور سے ہوا کیونکہ اشفاق احمد کی پیدائش کے بعد ان کے والد ڈاکٹر محمد خان کا تبادلہ فیروز پور ہوگیا، وہیں کے ایک اسکول سے اشفاق احمد نے 1843 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ نیز فیروز پور کے ہی ایک کالج 'رام سکھ داس' سے ایف اے کا امتحان کامیابی سے پاس کیا اور فیروز پور کے آر ایس وی کالج سے بی اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔

قیام پاکستان کے بعد اشفاق احمد اپنے خاندان کے ہمراہ ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ پاکستان ہجرت کے سبب معاشی بحران کا شکار ہوئے۔ میٹرک کی سند کام آئی۔ اسی کی بنیاد پر ریلوے میں ملازمت مل گئی جہاں صرف ایک دن رہے۔ اس کے بعد مہاجرین کیمپ میں ملازم ہوگئے۔ مہاجرین کیمپ میں ایک دن کے بعد دوسرے شعبے میں منتقل ہوگئے جہاں لاؤڈ اسپیکر پر اناؤنسمنٹ کرتے تھے، اشفاق احمد کی وابستگی ریڈیو پاکستان سے بھی رہی جہاں انھیں 80 روپے ملتے تھے۔ اشفاق احمد نے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایم اے اردو میں داخلہ لیا۔ ایم اے کے دوران ریڈیو آزاد کشمیر سے بھی وابستہ رہے۔ گھر والوں کے دباؤ میں نوکری ترک کردی تا کہ تعلیم کی طرف مکمل توجہ دے سکیں۔ لہٰذا اردو ایم اے کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا تو عابد علی عابد نے انھیں بحثیت لکچرار بھرتی کر لیا۔ اس طرح وہ دو سال تک 'دیال سنگھ کالج' میں تدریس کی ذمے داری ادا کرتے رہے۔ اسی دوران اٹلی میں اردو پڑھانے اور براڈ کاسٹر کی اسامی نکلی۔ اشفاق احمد کے پاس دونوں کا تجربہ تھا، اپنے تجربے اور صلاحیت کی بنیاد پر انٹرویو پاس کیا اور 1953 میں روم یونیورسٹی اٹلی میں اردو کے پروفیسر ہوگئے۔ ریڈیو روم سے پروگرام بھی پیش کرتے تھے۔ اٹلی میں رہ کر وہاں کی زبان بھی سیکھ لی۔ پاکستان لوٹنے کے بعد انھوں نے 'داستان گو' نام کا ایک ادبی مجلہ جاری کیا جس کا شمار اردو کے اولین رسائل میں ہوتا ہے۔ دو سال تک ہفت روزہ 'لیل و نہار' کی ادارت بھی کی۔ 1972 میں مرکزی اردو بورڈ کے ڈائرکٹر بھی رہے۔ اس ادارے سے ان کی وابستگی 1979 تک رہی۔ بعد میں یہ ادارہ اردو سائنس بورڈ میں تبدیل کر دیا گیا۔

اشفاق احمد کی ذہنی وابستگی تخلیقی تحریروں سے ہے۔ انھوں نے 1949 کے لگ بھگ ریڈیو پاکستان کے لیے لکھنا شروع کیا۔ محنت، لگن اور وقت و محبت کے ساتھ افسانے اور فیچر تخلیق کیے۔ ریڈیو کی دنیا میں ان کا لازوال شاہکار 'تلقین شاہ' آج بھی مقبول خاص و عام ہے۔

اشفاق احمد اہل نظر تخلیق کار ہیں۔ انھوں نے آس پاس کے ماحول کو بغور دیکھا اور اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ ان کا ریڈیائی فیچر 'ٹاہلی دے تھلے' پاکستان کے دیہاتی عوام کی زندگی اور ان کے خوشی وغم کا آئینہ ہے۔ یہ فیچر ایک ایسا مرقع ہے جس میں پاکستانی عوام کے مسائل کی نہایت واضح تصویر پیش کی گئی ہے۔ اشفاق احمد نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو اپنی اعلیٰ ادبی تخلیقات دیں۔ جن میں 'تلقین شاہ' 'ٹاہلی دے تھلے' 'اجے برج' 'لاہور دے' اور دیگر کئی ریڈیائی ڈرامے وفیچر کا شمار ریڈیو کے ادب عالیہ میں ہوگا۔ اشفاق احمد ریڈیو و ٹیلی ویژن کے لیے لکھنے سے قبل ادبی دنیا میں معروف ہوچکے تھے کیونکہ وہ انشاپرداز و تخلیق کار ہیں۔ مکمل و مضبوط ادبی اسکرپٹ کے سبب ان کی شخصیت میں جاذبیت وکشش ہے۔ تقسیم وفسادات پر لکھا گیا ان کا افسانہ 'گڈریا' ان چند افسانوں میں شمار ہوتا ہے جنھیں عالمی فکشن میں بلا تامل رکھا جا سکتا ہے۔ 'توبہ ٹیک سنگھ'، 'لاجونتی'، 'پرمیشور سنگھ'، 'پیشاور ایکسپریس' جس کی مثال ہیں۔ اشفاق احمد جزیات نگاری و منظر نگاری پر خداداد قدرت وصلاحیت کے مالک ہیں۔ وہ جب کسی واقعے کا تاثر بیان کرتے ہیں تو لفظوں کا انتخاب ایسا ہوتا ہے کہ بیان کردہ واقعے کی تفصیل نہیں بلکہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے گویا قاری یا سامع سانحہ کو ہوتے ہوئے خود دیکھ رہا ہو اور وہ خود چشم دید گواہ کی حیثیت رکھتا ہو۔ قاری کے اندر ایک خاص تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ وہ ایک ذہنی وفکری تشکیل سے گزرتا ہے۔

اشفاق احمد کے آخری دور کی تخلیقات میں تصوف کا رنگ وفلسفہ کچھ گہرا ہوتا ہوا نظر آتا ہے جو ان کی افتادِ طبع و ماضی سے وابستگی کی بنا پر ہے۔ انھوں نے بذاتِ خود اس کا اعتراف بھی کیا اور دلیل میں شیکسپیئر کے مکالموں کو پیش کیا۔ ان کا ایک اپنا اصول تھا جس کے سامنے ریڈیو و ٹیلی ویژن کے اصول وضوابط خاص اہم نہیں تھے۔ وہ اپنی پسند کے کردار اور مکالمے تخلیق کرتے، انھیں متعلقہ شعبے کے بجائے اپنی زبان عطا کرتے اپنے پسندیدہ مکالمے ادا کرواتے۔ افسانہ نگاری و ڈرامہ نگاری اشفاق احمد کا خاص میدان ہے تاہم انھوں نے 'سفر نامہ نگاری' میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور نہایت کامیاب سفرنامے تحریر کیے۔ اشفاق احمد کا سفر نامہ 'سفر در سفر' بہترین سفر ناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ سفر نامہ کتابی صورت میں موجود ہے۔ یہ افسانہ دور دراز ملکوں پر نہیں بلکہ اپنے ہی ملک پاکستان کے شمالی پہاڑی علاقوں کی سیاحت پر مبنی ہے، جس میں اشفاق احمد کے چند رفقا بھی شریک سفر تھے۔ اس سفرنامے میں بطور خاص ممتاز مفتی اور مسعود قریشی کا نام قابل ذکر ہے۔ اس سے اشفاق احمد کی ادب دوستی و ادب نوازی کا پتا چلتا ہے کہ وہ ادبا وشعرا کی صحبت کو کس قدر پسند کرتے ہیں۔ ان کے سفرنامے حسن ظرافت کی صفت سے متصف ہوتے ہیں جو ہنسی وقہقہے کے ساتھ نصیحت وعبرت کا درس بھی دیتے ہیں۔ ان کے سفرنامے سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''یہ دیکھ کر مجھے ندامت ہوئی کہ میں کھا رہا ہوں اور یہ بابا مکھیاں جل رہا ہے۔ میں نے کہا'' بابا جی آپ نماز پڑھیں'' بابا بولے'' آپ کھاؤ''۔

میں نے کہا'' مجھے شرمندگی ہو رہی ہے آپ جا کر نماز پڑھیں'' وہ مسکرا کر بولے کوئی بات نہیں آپ کھانا کھاؤ'' میں نے کہا'' قضا ہو جائے گی'' بابا ہنس کر بولے'' نماز کی قضا ہے مگر بیٹا خدمت کی کوئی قضا نہیں۔ آپ آرام سے کھاؤ''

اشفاق احمد کے سفرناموں اور ان کی سفرنامہ نگاری کی یہی خصوصیت ہے کہ وہ قاری کو اپنے سے الگ نہیں ہونے دیتے۔ یہ ان کے مکمل اور پختہ ادیب وتخلیق کار ہونے کا ثبوت ہے۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ سفرنامے میں خود کو اور قاری کو ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہیں۔

اشفاق احمد کی ایک پہچان شاعر کی حیثیت سے بھی ہے 'کھٹیا وٹیا' ان کی پنجابی نظموں کا مجموعہ ہے جسے پہلی بار 1988 میں سنگ میل لاہور نے شائع کیا تھا۔ انھیں ان کی ادبی وتخلیقی خدمات کے اعتراف میں خوب نوازا بھی گیا۔ صدر پاکستان نے حکومتی سطح پر 'ستارہ حسن کارکردگی' اور پاکستان کے سب سے بڑے اعزاز سے نوازا جو سول اعزاز ہے جسے 'نشان حیدر' کے برابر تسلیم کیا جاتا ہے۔

اشفاق احمد متعدد سرکاری وغیر سرکاری تنظیموں کے ممبر بھی رہے۔ جن کی فہرست کافی طویل ہے۔ ◘

برکھا

اشفاق احمد

جب وقت ایسا آ گیا کہ فیل پا سے دھوپ کا چٹاخ اُچک کر کونے میں ایستادہ حقے کی چلم پر ٹِک گیا تو ثریا نے آنکھیں کھول دیں۔ مسلسل کئی گھنٹوں سے وہ قالین پر بے ہوش سوتی رہی تھی اور اب جب دھوپ کے چٹاخ نے اس کے پاؤں میں تتیا مرچیں بھر دی تھیں اور وہ جاگنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ کھانا کھانے اور آم چوسنے کے بعد جب وہ قالین پر آ کر لیٹی تھی تو تیز دھوپ کا یہ دھیلے والا پتنگ ڈسک کے نیچے پڑا تھا مگر ثریا اس کی طرف دھیان دیے بغیر تکیہ دہرا کر کے فیل پا پر لیٹ گئی تھی۔ میٹھے میٹھے آموں کے گاڑھے گاڑھے بوجھل رس نے جب اس کی آنکھوں میں نیند کی جادو بھری سلائیاں پھیر دیں تو یہ پتنگ (تکل) ڈسک تلے سے پھسل کر اس کی ران سے جا چمٹی تھی۔ نیند کی حالت میں صوفے کی طرف کروٹ بدل کر ثریا نے اس ورق کو پھر قالین پر چھوڑ دیا تھا اور خود خوابوں کی وادیوں میں تیرتی چلی گئی تھی۔ برآمدے کے کلاک نے کچھ بجایا تو یہ آفتابی پتنگ بھی سرکاری لفافہ سا بن کر قالین پر ثریا کی طرف اور رینگ گیا۔ اس نے سوتے میں جھلا کر دونوں ٹانگیں اٹھا کر صوفے پر ڈال دیں تو لفافہ ڈاٹ کے نیچے پڑا رہ گیا۔ نیند میں خدا جانے کب اور کیسے اس کا پاؤں گدے سے اٹھ کر صوفے کے بازو پر چلا گیا جو کرنوں سے اس کی ریگمال کی پکڑ میں آ گیا۔ ثریا کی نیند تو کھل گئی مگر اس نے پاؤں وہاں سے اٹھایا نہیں۔ ویسے ہی لیٹے لیٹے جعفری کی طرف دیکھا اور مانو بلی کی سی ایک جمائی لی۔ بنیائن کی ڈوری کندھے سے پھسل کر عین وہاں آ ٹکی تھی جہاں درمیانی کا نشان ہوتا ہے۔ اس کا کلیجہ گویا منہ کو آ رہا تھا اور اس سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ یونہی لیٹے لیٹے ثریا نے ایک مرتبہ پھر جعفری کی طرف دیکھا۔ اس کی کھڑکی کے نچلے چوکھٹے پر انگریزی میں کا کالیا چھپا تھا۔ بڑھئی نے کھوکھے کی لکڑی بغیر رندہ کیے یہاں لگا دی تھی اور سبز روغن کے باوجود یہ لفظ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ثریا نے سوچا کہ کسی شہر کا نام ہو، کچھ بھی ہو اس نے جی ہی جی میں کہا۔ عجیب سا نام ہے جیسے کسی نے گود میں بچہ اٹھا لیا ہو— کا کالیا اور پھر وہ خود ہی اپنی اس فضول سی بات پر مسکرا پڑی۔ ٹین کی لہریا چھت پر نظریں گاڑے اس نے ایک مرتبہ پھر اٹھنے کی کوشش کی مگر میٹھے آموں کا سوم رس ریشہ ریشہ میں عجیب امرت گھول رہا تھا۔ نیند غائب تھی مگر آنکھیں مچی جا رہی تھیں۔

یوں تو ہر امتحان دے چکنے کے بعد آدمی کے سر سے ایک ایسا بوجھ سا اُتر جاتا ہے کہ سوائے کھانے اور سونے کے کوئی مقصد ہی نہیں رہتا مگر میٹرک کا آخری پرچہ ختم کر چکنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ آج سے مستقبل محفوظ ہوا اور زندگی کے آخری سانس تک کی پنشن پکی ہوگئی۔ وہ صاحبزادے جو دس پندرہ دن پہلے میلے کچیلے دسترخوان میں ٹکے ٹکے کی برف لینے بھیجے جاتے تھے، ایک دم معزز سے ہوکر منہ پر انگریزی اخبار ڈالے پنکھوں تلے دوپہریں گزارتے ہیں۔ کہنا سننا تو ایک طرف سب گھر والوں کی دُمیں ہوتیں تو ان کے گرد حلقہ باندھ کر یوں ہلاتے گویا کہہ رہے ہوں کاش ہمارے عاجزی وانکساری اور محبت وشفقت کے اظہار کا کوئی اور لطیف ذریعہ بھی ہوتا۔ لڑکیوں کا درجہ اور بھی اونچا ہے کیونکہ دسویں کے بعد لڑکی کی ایک واضح صورت پیدا ہوجاتی ہے۔ اسی لیے ایک صحیح الدماغ اور نارمل انسان میٹرک لڑکی کو ان پڑھ گریجویٹ صاحبزادی پر ترجیح دیتا ہے۔ دسویں پاس لڑکی میں کچھ ان امرودوں کی سی گدری گدری خوشبو ہوتی ہے جنھیں باغباں ڈالی سے توڑ کر پتوں کے بستر پر رکھے جاتا ہے۔ یوں تو سگندھ ہر امرود میں ہوتی ہے مگر جب چھپے والا قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتا ہے کہ جناب یہ تو ٹوکرے کی داب ہے تو رہی سہی گدراہٹ بھی معدوم ہوجاتی ہے۔ واضح شکل سے یہاں مراد کوئی شخصیت، فردیت وغیرہ نہیں۔ بس واضح سی شکل ہی ہے جس کا اقلیدس یا مسطحات سے کوئی تعلق نہیں۔ زیریں منزل پر پانی کا نل ہوتا ہے نا بس کچھ ایسے ہی سمجھیے۔ دھارا نکلتے ہی بالٹی کے تنے ہوئے جستی پیندے پر ایسا نقارہ بجتا ہے۔ گویا افطاری کی صلا ہو۔ ویسے تو پانی بالائی منزل پر بھی پہنچتا ہے مگر باریک سی تلتلی کے آگے آستین چڑھا کر بیٹھے رہنے سے تیمم بہتر! ثریا کو دسویں کا امتحان دیے کوئی ایک مہینہ گزر چکا تھا اور اب وہ نتیجہ کا انتظار کر رہی تھی۔ اس اثنا میں اسے فرمائشی پروگرام سننے، جی بھر کے سونے اور فلمی رسالے پڑھنے کے علاوہ صبح وشام باقاعدگی سے دودھ بھی پینا ہوتا تھا کیونکہ اس کی امی کے نزدیک رنگت نکھارنے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ امینہ کا گھر گو اس کے یہاں سے پانچ سات میل دور تھا، اس پر بھی ثریا کو ہر روز اپنی سہیلی سے ملنے کی کھلی اجازت مل چکی تھی۔ یہ بات الگ تھی کہ وہ اپنی سستی کی بدولت امینہ سے ہفتہ میں ایک بار بھی مل نہ پاتی۔ پہلے دن کمرۂ امتحان کو جاتے ہوئے اس نے امی سے جوان کی گھڑی لی تھی تو آج تک لوٹانے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ سہیلیوں کو خط لکھنے اور معمے بھرنے کو ابا جی نے اپنا پارکر جونیئر خود اسے بخش دیا تھا۔ پہلے کاپی بھی امی سے پوچھ کر منگوائی جاتی۔ اب مہینے میں چپ چاپ ہاکر سے دو تین فلمی پرچے بھی لے لیتی تو ابا جی اخبار کے ساتھ آپ سے آپ بل ادا کر دیتے۔ بھائی جان پہلے ہی اس پر مہربان تھے اور مانی سے جھگڑا کرنے کو اب خود اس کا جی نہ مانتا تھا۔ جو دوپہر اس نے فیل پا پر سرسوں کی کھلی گوٹی کی طرح سوسو کے گزار دی تھی، اسی دوپہر چلچلاتی دھوپ میں لطیف صاحب کے کوارٹر پر ایک تانگہ آ کے رُکا تھا اور ایک بڑا سا کالا ٹرنک اور مچھلی پکڑنے کی لمبی سی ولایتی بنسی چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ اگر وہ کوئی کہانی پڑھ رہی ہوتی یا معمہ حل کرنے میں مصروف ہوتی یا کم از کم شدید گرمی نے اس پر صرف غنودگی ہی طاری کی ہوتی تو وہ فیل پا سے اٹھ کر جعفری کے کمرے میں سے ضرور اس تانگے کو دیکھتی کیونکہ پڑوسیوں کے مہمان اپنے مہمانوں سے کہیں دلچسپ ہوتے ہیں مگر ثریا اٹھ نہ سکی۔ کنبھ کرن کا روپ دھار کر سونے والی کو پتہ بھی نہ چلا کہ کون آیا اور کون گیا۔ شام کو جب کھانے کی میز پر ابا جی نے بتایا کہ لطیف صاحب کا بھانجا امتحان دے کر چند مہینوں کے لیے ماموں کے پاس آیا ہے تو ثریا کو یاد آیا کہ واقعی امتحان دینے کے فوراً بعد لوگ اپنے رشتہ داروں کے یہاں جا کر کئی کئی مہینے گزارا کرتے تھے اور خوب مزے سے وقت بتایا کرتے ہیں۔

اس رات وہ بڑی دیر تک کروٹیں بدلتی رہی۔ یہ نیند خدا نخواستہ مہمان کی آمد پر اچاٹ نہ ہوئی تھی بلکہ کچھ جس کی وجہ سے اور کچھ دوپہر کو زیادہ سو لینے کے سبب حرام سی ہورہی تھی۔ اپنے مہمان نواز رشتہ داروں اور فیاض عزیزوں کا تصور باندھے ہوئے کوئی ساڑھے بارہ بجے کے قریب ثریا پھر میٹھی نیند سوگئی۔

بڑے کمرے میں چھت کا پنکھا پوری رفتار پر چھوڑ کر امینہ نے ثریا کو گردن سے پکڑ لیا اور جھٹکے دیتے ہوئے بولی۔ ''سچ سچ بتا کمینی ورنہ میں تجھے جان سے ماردوں گی۔''

ثریا اس کی دونوں کلائیاں پکڑ کر کچھ شرارت کچھ خجالت سے ہنسنے لگی اور اسے پرے دھکیلتے ہوئے بولی ''چھوڑ تو سہی۔ یہ تیرے بلی کے پنجے میرا خون کیے دیتے ہیں۔'' اس خفیف سی ہاتھا پائی میں دونوں مسکراتی ہوئیں بڑے صوفے میں گرگئیں۔ قریب ہی چھوٹی تپائی سے لیٹر اوپنر ثریا کا زانو لگنے سے قالین پر گرگیا۔ اسے اٹھاتے ہوئے ثریا نے پوچھا ''اچھا تو نے وہ ہوم ٹاسک ختم کرلیا؟'' تو امینہ نے شکوہ آمیز لہجہ میں جواب دیا ''میں کیا کروں۔ ڈیڈی اپنی الماری کو تالا لگا کے رکھتے ہیں اور پھر گرمی اتنی ہوتی ہے کہ کسی کام کو جی نہیں چاہتا۔''

ثریا نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا ''چلو جی ہمیں کیا تمھیں ہی گناہ ہوگا۔'' اور پھر لیٹر اوپنر تپائی پر پڑی ہوئی ایک موٹی سی کتاب میں دبا دیا۔

امینہ نے زمین پر جھک کر اپنی چپلی کے بکل کھولتے ہوئے پوچھا ''سچ سچ بتا ثریا تیرے دل میں کیا ہے۔ تجھے میری قسم جو جھوٹ بولے۔ آخر اتنے دن آئی کیوں نہیں؟''

''بس یونہی۔'' ثریا نے گریبان میں پھونک مار کر جواب دیا۔

''اتنے دن گھر پر ہی رہی؟''

''اور کہاں جاتی؟''

''پھر یہاں کیوں نہیں آئی؟''

''بس آہی نہ سکی۔ پھر تو ہمارے یہاں کون سے روز کے پھیرے ڈالتی ہے۔''

''دیکھا نا وہی بات۔'' امینہ نے آنکھیں گھما کر کہا۔ ''پہلے تین چار دن تو آہی نہ سکتی تھی۔ اس کے بعد ڈیڈی کے چیف کنٹرولر آگئے اور مجھے پانچ منٹ کے لیے بھی کار نہ مل سکی۔ اسی لیے تو میں نے مالی کو رقعہ دے کر بھیجا تھا۔''

''تو بس پہ آجاتی، وہاں کس نے تیری راہ—''

''مجھے تو ان کمبخت بسوں کے نمبروں کا ہی پتہ نہیں چلتا۔'' امینہ نے بات کاٹی۔ ''تیرے گھر آنے کو تین چار مرتبہ بدلنی پڑتی ہیں۔ کسی سے پوچھو تو کوئی کچھ بتاتا ہے کوئی کچھ۔ میں کیسے آتی ثریا؟''

ثریا اسے بڑا ہی سخت جواب دینے لگی تھی کہ امینہ کے ڈیڈی اندر آگئے۔ پنکھے کے ریگولیٹر سے نگاہیں اٹھاتے ہی انھوں نے ثریا کو دیکھا تو دور سے پکارے۔

''کہو بھئی ثریا، کچھ تمھارے رزلٹ کا پتہ چلا؟''

''جی ابھی تو نہیں۔'' ثریا نے سمٹ کر جواب دیا۔

''پھر بھی کتنے نمبر آجائیں گے؟''

''جی یہی سیکنڈ ڈویژن بن جائے گی بس۔''

''اور کیا چاہیے۔'' انھوں نے ہنسنے کی کوشش کی اور مسکرا کے رہ گئے۔

امینہ نے اپنی چوٹی کھولتے ہوئے چپلیاں پاؤں سے پرے دھکیل دیں اور پنکھے کے نیچے سرو قد ایستادہ اپنے ڈیڈی سے پوچھا۔ ''ڈیڈی آپ کے کنٹرولر کب جائیں گے؟''

''کل شام بیٹا!''

''پھر پرسوں ہم پک نِک پہ چلیں گے۔'' امینہ نے الٹی میٹم دیا۔

''اس گرمی میں؟'' ڈیڈی نے گریبان کے بٹن کھولتے ہوئے کہا۔ ''کوئی چھینٹا پڑے تو مزا آئے۔ ایسی گرمی میں تو اپنا ہی بھرتہ ہوجائے گا۔''

''نہیں ڈیڈی ہم ضرور جائیں گے۔'' امینہ ضد کرنے لگی۔

''اسے سمجھاؤ ثریا۔ بھلا یہ موسم کوئی پک نِک پہ جانے کا ہے۔'' ڈیڈی آنکھوں ہی آنکھوں میں گویا توبہ توبہ پکارنے لگے۔ ثریا مسکرانے لگی تو امینہ رونکھی ہوکر بولی۔ ''بارش تو سارا سال نہیں ہوگی، ہم کیا پک نِک پہ نہیں جائیں گے؟''

گریبان کے بٹن بند کرتے ہوئے ڈیڈی نے اطمینان سے کہا ''دعا کرو دعا۔ دعا میں بڑی برکت ہے۔'' پھر کرسی سے اپنا اوورکوٹ اٹھایا اور باہر نکل گئے۔

''ڈیڈی کے بچے۔'' امینہ نے جھوٹ موٹ غصے سے شلوار کے پائنچے اوپر کھینچتے ہوئے کہا۔ ''گرمی کی بچی۔''

کھانا کھا چکنے کے بعد جب دونوں سہیلیاں امینہ کے سونے والے کمرے میں ٹیبل فین کے سامنے آبیٹھیں تو ثریا نے کہا ''لطیف صاحب تو ایسے گورے نہیں پر وہ اتنا سفید ہے جیسے روئی کا گالا۔ لڑکے اتنے گورے اچھے نہیں لگتے۔ نہیں لگتے ناں؟'' اس نے امینہ سے تصدیق کرانی چاہی۔

امینہ نے منہ سکوڑ کر کہا۔ ''لگتے بھی ہیں اور نہیں بھی۔ ہاں ذرا کم ہی اچھے لگتے ہیں؟''

''پھر کیا؟'' ثریا نے کہا ''سارا دن برآمدے میں پنکھا لگا کے کچھ لکھتا رہتا ہے۔ کبھی سگریٹ پینے لگتا ہے۔ کبھی ٹانگیں اٹھا کے میز پر ڈال لیتا ہے۔''

''کسی کو تو لیٹر لکھتا ہوگا۔'' امینہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

''نہیں، ایسا نہیں۔'' ثریا جلدی سے بولی۔ پھر خفیف ہوکر کہنے لگی۔ ''ٹھیک ہے، یونہی ہوگا۔ ایسا ہی ہے امینہ۔ تو لیٹر ہی لکھتا ہے۔''

''کالے منہ والا۔'' امینہ نے چڑ کر کہا۔ ''بارہ روز سے میری سہیلی چھین رکھی ہے۔'' اور اس نے سہیلی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''بڑا آیا چھیننے والا۔'' ثریا نے بانہوں کے حلقے سے نکلتے ہوئے کہا ''اسے تو پتہ بھی نہیں کہ سولہ نمبر میں میں رہتی ہوں۔''

''سب پتہ ہے ثریا۔'' امینہ نے وثوق سے کہا۔ ''یہ لڑکے بڑے ہشیار ہوتے ہیں۔''

''پر وہ تو الوسا ہے۔ اُلو کی دم فاختہ۔'' ثریا کا خیال تھا کہ امینہ بھی اس کی ہنسی میں شریک ہوجائے گی مگر وہ خاموشی کے ساتھ اپنی چوٹی سے کھیلتی رہی۔

''یہ میٹھا برس بڑا خطرناک ہوتا ہے گوئیاں۔'' امینہ نے بڑی بوڑھیوں کا سا انداز اختیار کرکے کہا۔ ''ایک تیری سانولی سلونی کشش دوسرے اس سفید چوہے کی بے نیازیوں کے پھندے دونوں ایسی پھٹکی میں پھنسو گے کہ مجھ ایسی سہیلیاں بارہ بارہ برس شکل دیکھنے کو ترس جائیں گی۔''

''دور دفان۔'' ثریا نے بڑی ہمت سے کہا۔ ''ایسی کون سی قیامت آئی جاتی ہے۔''

''اچھا بی بی۔'' امینہ نے ہاتھ پھیر کر کہا۔ ''ٹھیک ہوگا۔''

اب کے گرمی نے کوئی آفت ڈھائی تھی کہ لوگوں نے آسمان کی طرف دیکھنا بھی ترک کردیا تھا۔ دن بھر کڑاکے کی دھوپ پڑتی۔ سہ پہر کو لو چلنے لگتی اور شام سے حبس کی بانا تیں تن جاتیں۔ یوں لگتا تھا گویا سالہا سال سے اس زمین نے بارش کی بوند تک نہ دیکھی ہو۔ دفتروں کے اوقات میں آئے دن تبدیلیاں ہورہی تھیں۔ کاروبار ماند پڑتا جارہا تھا۔ جنس کے بھاؤ چڑھ رہے تھے اور لوگوں کے منہ اترتے جارہے تھے۔ سورج کے آتشیں تیروں نے ضروری سے ضروری کام کو گھائل کردیا تھا اور خس خانوں میں بیٹھنے والے آج کے کام کو آنے والے اچھے دنوں پہ چھوڑ دیتے تھے۔ ثریا کے ابا جی جب دفتر سے لوٹتے تو برآمدے کی سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہی ہر روز یہی کہتے۔ ''اب کی بار جو گرمی پڑ رہی ہے، اس سے پہلے اپنی ساری

عمر میں نہ دیکھی، نہ سنی۔ غضب خدا کا 118-117 ڈگری بھلا اس ملک میں کون جیے گا۔'' پھر وہ ہیٹ کھونٹی پر لٹکاتے ہوئے کہتے۔ ''کہیں بارش کے آثار بھی تو دکھائی نہیں دیتے جو آدمی زندہ رہنے کی اُمید باندھ لے۔''

امی کہتیں۔ ''اور پنکھے کے نیچے بیٹھ کر اور جسم جلتا ہے۔ کہیں سے دو بوندیں پڑیں تو کپڑے ہی سی لوں۔ دو مہینوں سے قطع کیا ہوا گھر پڑا ہے۔''

مانی اسکول سے آتے ہی دیوار کے ساتھ کمر کھجانے لگتا تو بھائی جان اپنے ننگے پیٹ پر دھپ دھپ ہاتھ مارتے ہوئے کہتے۔ ''بیٹا یہ گرمی کے دانے ہیں، دیواروں سے رگڑے لگا کر نہیں مٹتے۔ بادلوں کی پھوار مانگتے ہیں۔ جس دن اپنے کوارٹر سے دس میل پرے بارش ہوگئی تیرا پنڈا مخمل سا نکل آئے گا۔'' لیکن مانی یہاں تک کھجاتا کہ خون نکل آتا۔ گرمی ثریا کو بھی لگتی تھی اور دوہرے کپڑے پہننے سے جان اور بھی عذاب میں تھی، مگر اس کی دوپہر نیند کے غلبے میں کافی آسانی سے گزر جاتی۔

جب لطیف صاحب کے بھانجے کو گرمی بہت زیادہ ستانے لگتی تو وہ اپنے سفید پائجامے کے پائینچے گھٹنوں تک چڑھا لیتا۔ تھوڑی دیر بعد قمیص بھی اتار دیتا اور پھر ڈور بندھی پنگ پانگ کی گیند میز سے اٹھا کر فرش پر بجاتا۔ برآمدے کے کونے سے چتکبرا بلونگڑا بجلی کی طرح تڑپ کر گیند سے لپٹ جاتا اور سیمنٹ کے فرش پر کمر کے بل پھرکی سی گھومنے لگتا۔ اسی پھرتی میں جب بلونگڑا ڈوری کے بھلاوے اپنی دُم پکڑ لیتا تو لڑکے کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اس کے چہرے پر شنگرفی سی ہو کر پھیل جاتی اور جعفری کے پیچھے ثریا ہولے ہولے ہنسنے لگتی۔

کل شام جب یہی لڑکا ململ کا کلیوں والا کرتہ، کھلے پائینچوں کا اجلا اجلا پائجامہ اور ربڑ کے باتھ روم سلیپر پہنے سگریٹوں کی ڈبیا لے کر لوٹ رہا تھا تو اُس نے جعفری کی پوری کھلی ہوئی کھڑکی میں ثریا کو کھڑے دیکھا تھا جس کے سیاہ گھنگھریالے بال ماتھے اور کنپٹیوں پر پسینے سے چپکے ہوئے تھے۔ ثریا نے اسے ادھر دیکھتے ہوئے پا کر انتہائی مسرت سے کھڑکی فوراً بند کر لی تھی۔ جب وہ جھروکے کے عین محاذ میں آیا تو ثریا کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس کے برآمدے میں اِدھر اُدھر چوروں کی طرح دیکھ کر ڈرتے ڈرتے کہا کہ اگر گیارہ گنتے گنتے وہ اس کھڑکی کے پاس آ کر السلام علیکم کہہ دے تو چاہے کچھ بھی ہو میں مصافحہ کے لیے ہاتھ باہر نکال دوں گی۔ جب ثریا سات پر پہنچی تو وہ کھڑکی سے دو تین قدم آگے نکل چکا تھا۔ آٹھ — نو — دس اور پھر گیارہ میں اس نے کوئی آدھ آدھ منٹ کے وقفے دیے۔ کچھ ایسے گِنا جیسے کوئی کسی کو پکار رہا ہو مگر بدقسمت لڑکا برآمدہ عبور کر کے اندر کوارٹر میں داخل ہو چکا تھا۔ ثریا نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر کیا کہ اس نے صرف گیارہ ہی فرض کیے تھے۔ اگر خدانخواستہ گیارہ سو یا گیارہ ہزار ہوتے تو اس کا خاندان جیتے جی مر جاتا!

ان دو تین دنوں میں سورج سوا نیزے سے ڈھلک کر ایک نیزے پر آ گیا تھا اور بدستور ادھر ہی ڈھلک رہا تھا۔ امی صبح صبح ریڑھی والے سے سبزی خریدتے ہوئے تقریباً ہر روز پوچھتیں۔ ''فضلو آم کیوں نہیں لاتا؟''

وہ ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہتا۔ ''بیگم صاحبہ اس گرمی نے تو آدمیوں کو پکا کر ویسے ہی پھوڑا پھنسی کر دیا ہے۔ میں آم لاؤں بھی تو کون لے گا؟ یہ تو برسات کا میوہ ہے۔ ادھر کھایا ادھر ہضم۔ برکھا ہو تو دو چار ٹوکرے صاحب لوگوں کے لیے لاؤں۔ ایسے میں ایک آدھ ٹوکرا بھی سڑ گل گیا تو میں کس کے گھر سے رقم دوں گا۔ بیگم صاحبہ دعا کیجیے، برکھا ہو، پھر آم بہت۔''

امی پوچھتیں ''کتنے پیسے ہوئے؟''

اور فضلو گھیا اور ٹینڈوں کی قیمت لے کر آگے چل دیتا۔

نواب شاہ والے حیدر چچا کسی ضروری کام سے آج ہی یہاں آئے تھے اور کانوں کو ہاتھ لگا لگا کر دیہات کی گرمی کا تذکرہ کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنی جیکٹ، ترکی ٹوپی سر سے اُتار کر بالوں پر ہاتھ پھیرا اور پسینے سے لتھڑا ہوا پنجہ دیوار پر مار کر بولے۔ ''بھابی قسم خدا کی زمین پہلے دن کی کھیس ایسی پھٹی پڑی ہے۔ کپاس کے پودے دن بہ دن مرجھائے جا رہے ہیں۔ اگر ہفتہ دس دن اور بارش نہ ہوئی تو کاشتکار برباد ہو جائیں گے۔ نہریں بند ہیں اور پودے چھ سات دنوں سے زیادہ نہیں نکال سکتے۔ اگر اب کے روئی کی فصل ماری گئی تو سارے ملک میں کال پڑ جائے گا۔ میں نے اپنا رقبہ —''

اور ثریا نے رسالہ سے سر اٹھا کر ان کی بات کاٹ دی۔ ''اور اگر بارش ہو جائے تب چچا؟''

''پھر؟'' چچا کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ ''پھر تو گھر گھر سونے کے ڈھیر لگ جائیں ثریا بیٹی۔ اس وقت بارش کی ایک ایک بوند سونے کی مہر ہے۔ اصلی روپے کا سونا ہے۔ خدا کی قسم زندگی بن جائے۔ پیغمبروں نبیوں نے ایسے ہی بارش کو بارانِ رحمت تو نہیں کہہ دیا۔ ایک ایک قطرہ خدا کے دربار سے خوشیوں اور مرادوں کے پروانے لے کر اترتا ہے۔ بگڑے ہوئے کام بنتے ہیں۔ رُکے ہوئے چل پڑتے ہیں۔ ثریا بیٹی ہر کام پہلے خدا اور پھر بارش کی مہربانی سے ہوتا ہے۔''

اس کے بعد چچا امی سے اپنے سسرال کی باتیں کرنے لگے جن کی بڑائی کا پول روز بروز کھل رہا تھا۔

ثریا پھر رسالہ پڑھنے لگی۔

بھائی کے اسکول کا ٹائپسٹ جسے انھوں نے بڑی مشکل سے اسکول میں نوکر کروایا تھا، پہلے ہفتہ میں دو تین بار ان کے گھر آتا تھا اور کچھ ادھر اُدھر کے کام کر دیتا تھا مگر اب دس دس دن تک اس کی شکل ہی دکھائی نہ دیتی تھی۔ اسکول میں تو بھائی جان اس سے کہتے ہی رہتے ہوں گے مگر جب گھر بھی آتا تو بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑتے۔ ''یار ضیا میرا تھیسس کب ٹائپ کرو گے؟ جلد کرو گے تو تمھارا ہی بھلا ہوگا۔ کالج میں لگتے ہی تمھیں بھی وہیں بلوا لوں گا۔''

ضیا کھسیانا ہو کر کہتا۔ ''ماس صاب گرمی بہت ہے، کام پہ بیٹھا نہیں جاتا۔ جس دن بارش ہوئی آپ کا تھیسس آپ سے آپ ٹائپ ہو جائے گا۔''

''وہ کیسے؟'' ثریا پوچھتی تو ضیا ہتھیلی پر انگلیاں رگڑتے ہوئے کہتا۔

''سردیوں میں انگلیاں ٹھٹھر جاتی ہیں۔ گرمیوں میں پسینے کے فوارے چھوٹنے لگتے ہیں مگر برسات میں بس ٹائپ سامنے رکھ کر بیٹھ جایئے۔ بوندیاں آپ سے آپ ٹپاٹپ کرتی جائیں گی۔'' ثریا سے بات کرتے ہوئے ٹائپسٹ بھی شاعری کرنے لگتا تھا۔

فیل پاپا کمر دھرے اور ٹانگیں صوفے پر ڈالے ثریا سونے کی کوشش میں مصروف تھی اور مانی دیوار کے ساتھ پیٹھ رگڑ رہا تھا۔ اس کی پلکوں پر آنسو دیکھ کر ثریا نے نیم باز آنکھیں ذرا کھول کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے مانی؟''

''کھجلی باجی!'' اس نے منمنا کر جواب دیا۔

اور باجی نے کھنکار کر کہا۔ ''کوئی بات نہیں۔''

باجی کو ایسے ملتفت پا کر مانی نے پوچھا۔ ''بارش کب آئے گی باجی؟''

''جب ہم نہ ہوں گے تب۔'' آنکھیں میچ کر باجی نے انھیں بازو سے ڈھانپ لیا۔

شام کو بس سگریٹ خریدنے اور ایک ذرا سی چہل قدمی کرنے کے علاوہ وہ لڑکا لمحہ بھر کو برآمدے سے باہر نہ نکلتا۔ ثریا کو اس کے گھریلو پن پر سخت اعتراض تھا مگر جس دن مولوی صاحب کوارٹروں کے تمام باشندوں کو نمازِ استسقا پڑھانے باہر کھیتوں میں لے گئے اور وہ لڑکا یہ فرض ادا کر کے تولیہ سر پر ڈالے واپس لوٹا تو اس کا چہرہ چقندر کی طرح سرخ ہو رہا تھا اور اس کے پاؤں ٹھیک سے زمین نہیں پکڑتے تھے تو ثریا کو مولوی صاحب پر غصہ آیا کہ ایک کے نہ جانے سے کیا ہو جاتا بھلا۔ اس نے سوچا ایسا نرمل اور شائستہ لڑکا اس کڑکتی دھوپ میں لائن میں آخر کیسے نکل سکتا ہے۔ اچھا ہی کرتا ہے جو چھت تلے رہتا ہے۔ جعفری کے پیچھے سے ثریا آسمان کو دیکھنا چاہا کہ شاید بادلوں کا کوئی ٹکڑا مگر اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

اس ونگ میں رہنے والے سب بچے شام کو ثریا جی والی لین میں سرکنڈے کی وکٹیں گاڑ کر کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ ایک تو یہ لین کافی چوڑی تھی، دوسرے ٹیم کے کیپٹن کا یہ خیال تھا کہ یہاں کی پچ بہت اچھی تھی۔ اکثر وہ لڑکا بھی اس کے ساتھ شامل ہو جاتا مگر دوانگ کے بعد اسے ایک باری ملتی تھی اور باؤلنگ کی اجازت نہ تھی۔ ثریا ہر روز جعفری سے لگ کر ٹیسٹ میچ دیکھا کرتی مگر اس لڑکے کی حرکات سے کبھی یہ ظاہر نہ ہوا کہ اسے جعفری کے پیچھے کسی کی موجودگی کا پورا پورا احساس ہے۔

ایک ایسی ہی امسی ہوئی شام کو جب پدا ایمپائر اچھے اچھے باؤلروں کی پھینکوں پر نو بال دے رہا تھا تو تمام کھلاڑیوں نے ہوا میں انگلیاں اٹھا کر ''ہاؤزیٹ! ہاؤزیٹ۔'' کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ پدا کہہ رہا تھا کہ میں کیا کروں پچ خراب ہے اور گڑھوں سے بال اچھلتا ہے تو میں نو بال دینے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ ٹیم نے اس کی ایک نہ مانی اور بھائی جان کو ایمپائر بناؤ کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ ثریا ہنسنے لگی اور اس لڑکے نے ہوا میں خلیل جبران کی سی انگلی اٹھا کر کہا۔ ''دیکھو آج ایمپائر نہیں بدل سکتا بلکہ اس وقت تک نہیں بدل سکتا جب تک کہ پچ ٹھیک نہ ہو جائے، ٹوپیاں لگے، نیکریں کسے اور شلواریں اڑسے بچے پھر نعرے لگانے لگے۔ ''پچ ٹھیک کرو، پچ ٹھیک کرو۔'' ثریا کو ہنسی کا دورہ سا پڑ گیا۔ اس نے پھر ہوا میں ہاتھ بلند کیا اور کہا۔ ''ان دنوں پچ ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ جب بارش ہو گی تو ہم سب کھرپیوں اور کدالوں سے زمین ہموار کریں گے۔ سیلی مٹی کوٹ کوٹ کے بٹھائیں گے اور میٹنگ بچھا کے کھیلا کریں گے۔''

پدے نے کہا ''پھر ہم اعلیٰ وکٹیں بھی لے آئیں گے۔''

اس نے ایمپائر کا سر تھپتھپا کر کہا۔ ''ضرور!''

مانی نے جھجکتے ہوئے پوچھا ''آپ چلے تو نہیں جائیں گے؟''

''ہرگز نہیں۔'' اس نے مانی کو اٹھا کر کندھے پر بٹھا

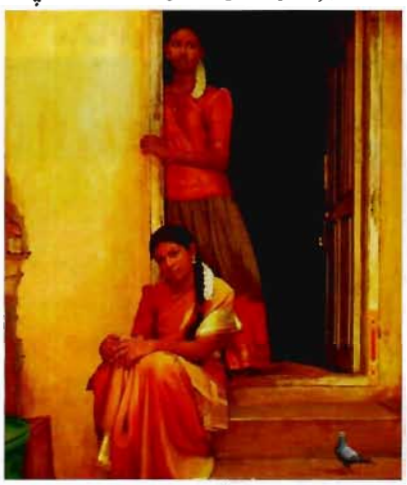

لیا۔ ''میں جانے کے لیے تھوڑی آیا ہوں۔''

ثریا نے شرما کر دوپٹے کا پلو انگلی پر لپیٹنا شروع کر دیا۔ اسے یوں لگا جیسے توازن قائم نہ رکھ سکنے کی وجہ سے اس نے غیر ارادی طور پر کسی کے سر کے بال دونوں چنگلوں میں جکڑ لیے ہوں۔

کھیل پھر شروع ہوگیا۔ اب وہ آف بریک پر کیچ پکڑنے کے لیے جعفری کی کھڑکی کے عین پاس کھڑا تھا۔ ثریا نے پیچھے سے دیکھا، اس کی ایک قلم دوسری سے قدرے بڑی تھی اور گردن پر دائیں جانب ایک چھوٹا سا سیاہ تل تھا، ململ کا کرتہ اس کی ساری کمر پر پسینہ سے چپکا ہوا تھا اور جسم کی مسلسل حرکات سے اس پر بے شمار چوکور خانے ابھر آئے تھے۔ جب وہ گیند پکڑنے کو آگے بڑھتا تو ململ کے اس ریکٹ کے بہت سے خانے مٹ جاتے اور کئی نئے ابھر آتے۔ جانے کس نے ہٹ لگائی اور وہ آگے جھک کر گیند دبوچنے لگا اور محور پر تیزی سے گھومتا ہوا گینداس کی ٹھوڑی کو ریتی چٹا کر آگے نکل گیا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار ٹھوڑی سہلانے لگا تو جھروکے سے ایک قہقہہ بلند ہوا۔ اس نے پیچھے گھوم کر دیکھا اور پیشتر اس کے کہ ثریا کھڑکی بند کرتی، اس نے سر ہلا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا۔ ''خدا کی قسم تم ہنس رہی ہو۔ میری جلد کو چیونٹیاں نوچنے لگی ہیں۔'' ثریا مسکرائی تو وہ آگے سرک آیا۔ کھڑکی بند ہو گئی اور لڑکی دور ہو گئی۔

باوجود اس کے کہ دوپہر کو ثریا ایک منٹ کے لیے بھی نہ سو سکی تھی، اس پر بھی اسے ساری رات نیند نہ آئی۔ خدانخواستہ اس واقعے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس خیال سے کہ کب صبح ہو اور کب وہ امینہ کو جا کر سارا واقعہ سنائے۔

اگلے دن امینہ کے چھوٹے سے کمرے میں ابھی وہ ٹیبل فین چلا کر بیٹھی ہی تھی اور ابھی اس کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ کھٹاک سے کمرے کا پَٹ بھڑا۔ ٹھنڈی ہوا کا وہ جھونکا جس میں تازہ تازہ بھوسے کی خوشبو کے علاوہ سچ مچ تنکے بھی ہوتے ہیں، اندر گھس آیا۔ دونوں پر ایک کپکپی سی طاری ہو گئی۔ باہر سے مالی چلایا۔ ''بادل۔'' برآمدے سے ڈیڈی کی آواز آئی۔ ''بارش'' پھر روشندانوں کے چھجوں پر ٹپاٹپ بوندیں گرنے لگیں۔ امینہ نے اسے لاکھ روکا، منتیں کیں، کار میں چھوڑ آنے کا وعدہ کیا مگر وہ برقعہ لپیٹتی بس اسٹینڈ کی طرف بھاگ گئی۔

موسلادھار مینہ برس رہا تھا اور ڈرائیور کافی تیز بس چلا رہا تھا۔ اس پر بھی اس کے ہونٹ آپ سے آپ کہہ رہے تھے۔ تیز چلاؤ اور تیز چلاؤ۔ ہر اسٹینڈ پر جہاں بس ایک آدھ منٹ کے لیے رکتی، وہ جلدی جلدی کہتے ہوئے دونوں ہاتھ ہلانے لگتی جیسے عمر بھر کی محنت کا ثمرہ اس کی آبی تصویروں کا مجموعہ کوٹھے پر کھلا رہ گیا ہو۔

جب وہ گھر کے بس اسٹینڈ پر اتری تو اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اپنی لین میں داخل ہونے سے پیشتر اس نے نقاب کے دونوں کنارے مضبوطی سے مٹھیوں میں بھینچ لیے۔ تند و تیز جھپاکوں میں جب نقاب کی بھیگی ہوئی جالی سے اس نے آگے دیکھا تو لطیف صاحب کے کوارٹر پر ایک تانگہ کھڑا تھا۔ تانگہ والا سیاہ ٹرنک آگے پھنسا رہا تھا اور سواری ہاتھ میں ایک لمبی سی ولایتی بنسی تھامے کھڑی تھی۔ جب اس نے اپنے برآمدے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو چھن چھن بھیگے ہوئے گھنگھرو بجاتا گھوڑا آگے کو چل دیا۔ ثریا نے پیچھے مڑ کر دیکھا ہی نہیں بلکہ اپنے نقاب کے کنارے بھی چھوڑ دیے۔

■

ماخذ: کتابیات. بلاگ اسپاٹ. کام

اعتبار الملک دل شاہجہانپوری

خالد حسین خاں

میر کی روایت، غالب کی امانت اور امیر کی وراثت کے امین دل شاہجہاں پوری کی شخصیت اور ان کی شاعری کسی تعارف، تنقید، تشریح، تصریح، توضیح اور محاکے و موازنے کی قطعاً محتاج نہیں ہے کیونکہ صرف پندرہ برس کی نوخیز عمر سے شعری سفر کا آغاز کرنے والے سیاح، دل شاہجہاں پوری نے غزل اور معاملات و متعلقاتِ غزل میں اپنی قادرالکلامی اور ہفت خوانی کے کم و بیش چوہتر (74) برس تک اس قدر کارہائے نمایاں انجام دیے کہ ان کا مکمل و مفصل احاطہ کرنا، راقم سطور کے لیے امرِ محال ہے۔

دل شاہجہاں پوری کی شخصیت اور شاعری پر اظہارِ خیال کرنے سے پہلے، مختصراً ان کی سوانح حیات کا آموختہ دہرانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ دل شاہجہاں پوری نے اپنی شاعری، مذاق و مزاج اور اپنے تعارف میں یہ شعر کہا تھا:

دل ہوں یہی فطرت ہے اے اہلِ نظر میری
میں سینۂ عالم میں ہر وقت دھڑکتا ہوں

شاہجہاں پور کو جن اردو شاعروں نے شہرت و شہامت کے بام عروج پر فائز کیا ہے، ان میں اعتبار الملک حکیم ضمیر حسن خاں، دل شاہجہاں پوری کا نام سرفہرست ہے۔ دل شاہجہاں پوری کی شعرگوئی کی عمر خاصی طویل ہے ان کی ولادت 1875 میں ہوئی، شاعری کے میدان میں انھوں نے 1889 میں قدم رکھا اور یہ سلسلہ تادمِ آخر 1959 تک قائم رہا۔ اعتبار الملک حکیم ضمیر حسن خاں دل شاہجہاں پوری بن احمد حسن خاں، شاہجہاں پور کے ایک معروف و معزز اور متوسط زمیندار خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ دل چاہجہاں پوری کے والد مکرم کا انتقال، ان کے عہدِ طفلی میں ہوگیا تھا۔ اس لیے ان کی والدہ، اپنے حقیقی بھائی کے مکان بمقام ہاتھی تھان شاہجہاں پور، منتقل ہوگئیں۔ دل شاہجہاں پوری کے دو بڑے بھائی بشیر حسن خاں اور نذیر حسن خاں تھے، ان کی شادی ان کی حقیقی ماموں زاد ہمشیرہ سے ہوئی تھی۔ دل شاہجہاں پوری کے دو بیٹے شبیر حسن خاں اور شفیق حسن خاں تھے۔ یہ دونوں بھی اس جہان فانی سے عالم جاودانی میں سدا کے لیے جا چکے ہیں!

دل شاہجہاں پوری نے شاعری کے رموز و نکات اپنے دور کے مسلم الثبوت استاد شاعر، امیر مینائی سے بذریعہ مراسلت سیکھے اور یہ سلسلۂ تلمذ دل شاہجہاں پوری کے فکر و فن کو نکھارنے، سنوارنے اور شناخت و شہرت دلانے میں بے حد معاون رہا۔ امیر مینائی جیسے استادِ کامل کی سپرستی اور تربیت کا یہ فیضان ہی تھا کہ دل شاہجہاں پوری کی شاعری وطنِ عزیز شاہجہاں پور کی شعری فضاؤں سے گزر کر ہند و پاک کے علاوہ، کائنات اردو کے تمام علاقوں تک جا پہنچی۔ دل شاہجہاں پوری ہمہ صفت فنکار اور شریف الطبع نیز باوضع شخص و شاعر تھے یعنی وہ بیک وقت متوسط زمیندار تھے، طبیب تھے، حبیب تھے، شکاری تھے، سخی تھے، ماہر عروض تھے، رباعی گو تھے، رقیق القلب تھے، استاد الشعرا تھے، سرکاری ٹھیکیدار بھی تھے، کرکٹر تھے، صوفی تھے، مترجم تھے اور ناول نگار بھی تھے۔

دل شاہجہاں پوری کی ہمہ پہلوئی، ہمالیائی شخصیت کے ذیل میں سید دل محمد فضا جالندھری رہنمائے تعلیم دل شمر میں یوں رقم طراز ہیں:

جناب دل دراز قد، سبک اندام، سنجیدہ و امین، شکل و شمائل کے لحاظ سے حسین و جمیل۔ آواز نہایت شیریں و صاف، طبیعت شگفتہ و شاداب ہے۔ جس طرح آپ طباع شاعر ہیں، اسی طرح متبحر عالم بھی ہیں۔ آج تک آپ کی زبان سے کسی کی برائی نہیں سنی گئی۔ ہندوستان میں بلحاظِ بلندیِ اخلاق آپ ہی کے ہستی حسن انتخاب میں آسکتی ہے زمانہ جانتا ہے کہ مرزا یگانہ چنگیزی اور مرزا عزیز لکھنوی کے درمیان کس قدر اختلاف رہے۔ اسی طرح اکثر معاصرین میں نوک جھونک اور چشمک رہتی ہے مگر جناب دل کے معاصرین کے ساتھ اس قدر خوشگوار تعلقات ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ آپ کثیر الاحباب ہیں اور تلامذہ کی غیر معمولی تعداد کے استاد ہیں۔'' (رہنمائے دل نمبر (لاہور)، ص 22,23، 1936)

دل شاہجہاں پوری کی شخصیت، سیرت اور ان کی خصوصیات پر سید دل محمد فضا جالندھری نے دل شاہجہاں پوری کی دل کھول کر تحسین کی ہے۔ اسی طرح دل شاہجہاں پوری کے ایک شاگرد رشید، جو شاہجہاں پور سے ہجرت کر کے پاکستان جا بسے تھے، دل شاہجہاں پوری کے ذکر، فکر، فن اور دیگر خوبیوں پر یوں رطب اللسان ہیں:

''وہ کون سی خوبی ہے جو دل صاحب میں نہیں ہے۔ وہ بھولے بھالے انسان ہیں، دوستوں پر مٹنے والے دوست ہیں، گھر پھونک تماشا دیکھنے والے میزبان ہیں، زمیندار ہیں لیکن کاشتکار انھیں اپنا لینن اور استالن سمجھتے ہیں، طبیب ہیں لیکن دوائیں بفت بانٹتے ہیں۔ شاعر ہیں مگر کبھی دعویٰ نہیں کیا، کوئی تعریف کرتا ہے تو شرما جاتے ہیں، تنقید کرتا ہے تو مسکرا دیتے ہیں، استاد ہیں مگر شاگردوں کو شاگرد نہیں کہتے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک ان پر اعتبار کرتا ہے اور لوگ انھیں اعتبار املک کہتے ہیں۔''
(شبنم رومانی شاہجہاں پوری، ثم کراچی پاکستان، شخصیات نمبر، نقوش، لاہور 1956، ص 1447)

دل شاہجہاں پوری کی شاعری، ان کے دل کے ایسے دلکش و دلنشیں اور دل آسا تاثرات، محسوسات اور اظہارات ہیں جنھیں دل کی زبان میں بیان کیا گیا ہے، اسی سبب ان کے اشعار اپنے آہنگ اور ترنم سے سننے اور پڑھنے والوں کے دلوں کو نہ صرف مسحور و محصور کر لیتے ہیں بلکہ سر دُھننے پر بھی مجبور کر دیتے ہیں۔ دراصل عالم وجود کے جمالیات، وجدانیات، محسوسات اور جذبات کی آویزش کے عمل دخل نے دل شاہجہاں پوری کے سحر کلام اور بقائے دوام میں اہم رول ادا کیا ہے۔ دل کی شاعری میں حسن کی پرکاری، عشق کی بے قراری، محبت کی فراوانی، دل کی بے تابی کے علاوہ ترنگ، امنگ آس و یاس، ہجر و فراق سب ایک ساتھ جلوہ گر ہیں! ان کے یہاں حسن زندگی، روح زندگی اور اصل زندگی کی تثلیث نے بھی سونے پہ سہاگے جیسا کام کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دل شاہجہاں پوری کے یہاں شعر کی زبان 'دل' کی زبان ہے اور جس میں آہنگ و ترنم کی بہتات ہے۔ حسن و عشق بھی دل شاہجہاں پوری کے کلام کا نمایاں اور بے حد موثر موضوع ہے۔

دل شاہجہاں پوری کی غزلوں میں حسن کی جیتی جاگتی تصویریں اور عشق کی حرارتیں صاف بتا رہی ہیں کہ

حساس فنکار کی ساری زندگی محبت کرنے میں گزری ہے۔ بہرنوع دل، وارداتِ دل، احوالِ دل اور حسن وعشق سے مملو یہ شعر دیکھیے:

مرے خاموش ہوجانے کا عالم دیکھتے جاؤ
دلِ ناکام کی یہ آخری فریاد باقی ہے
یہ ہے جذبۂ محبت، وہ کرشمۂ محبت
جسے پی گئے وہ آنسو جو ٹپک پڑا وہ تارا
چارہ گر زندگیِ دل کبھی ایسی تو نہ تھی
عشق مشکل ہے یہ مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
پھر اعتبارِ عشق کے قابل نہیں رہا
جو دل تری نظر سے گرا دل نہیں رہا
پہنچا وہی جو خاک ہوا راہِ عشق میں
دل مطمئن ہے منزلِ دشوار دیکھ کر
محبت رائیگاں کیوں ہو محبت بے اثر کیوں ہو
جو تیرے دل میں گھر کرلے وہ رسوائے نظر کیوں ہو
اک زمانہ تمھیں دیوانہ کہے گا اے دل
ختم اگر سلسلۂ چاک گریباں نہ ہوا
یاد ہے اے ہمنشیں وہ بھی زمانہ یاد ہے
دل کا آنا یاد ہے پہلو سے جانا یاد ہے
تا قیامت بھول سکتے ہی نہیں وہ سرگزشت
اپنے ہاتھوں خاک میں دل کو ملانا یاد ہے
اُف وہ چشم فتنہ ساز، اُف وہ نگاہ سحر کار
اُف دلِ عاشق پہ وہ بجلی گرانا یاد ہے
داستانِ دل نہ بھولی ہے، نہ بھولے گی ضمیر
ابتدائے عشق کا اب تک زمانہ یاد ہے
ہیں ایسے واقعاتِ محبت کے واقعات
تا حشر ختم ہوں جو بہت مختصر کریں
سن لیجیے حالِ دلِ مضطر دمِ آخر
ہوجائے گا ختم آج ہی افسانہ کسی کی

مذکورہ اشعار سے مترشح ہے کہ دل شاہ جہاں پوری اپنے عہد کے ایسے زندہ دل شاعر تھے، جن کی شاعری میں نہ صرف ان کے دل کی دھڑکنیں تھیں بلکہ کائنات عالم کی دھڑکنیں اور ارتعاشات بھی موجزن ہیں۔ نیاز فتح پوری بھی یوں معترف ہیں، ''جناب دل کی شاعری میں اس شوخی کا عنصر کہاں جو عہدِ امیر میں داغ اسکول کے لیے مشہور تھی'' (مقدمہ ترانۂ دل مطبوعہ سرفراز پریس لکھنؤ195، ص25)

اقبال بھی دل شاہجہاں پوری کی شاعری کے دلدادہ اور مدح خواں تھے، وہ یوں کہتے ہیں:

''میں کلام دل کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ یوپی میں اصغر گونڈوی و دل شاہجہاں پوری کا دم غنیمت ہے۔'' (مقدمہ ترانۂ دل195، ص28)

دل شاہجہاں پوری کی شاعری کے بنظر غائر مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں خارجی ماحول سے زیادہ داخلی کیفیات اور واردات کی مرقع کشی ہے۔ غالب دوراں کی شاعری کی مانند، دل شاہجہاں پوری کی شاعری کو ہم نہ 'گنجینۂ معنی' کا طلسم کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی اس کو 'بازیچۂ اطفال' سے منسوب کرسکتے ہیں بلکہ ان کے کلام دل نشیں میں رفعتِ تخئیل، دوربینی اور دروں بینی کے امتزاج کی خوشگوار خوبیاں، باوقار محبوبیاں اور دلنواز طرح داریاں ان کو لکھنوی اور دہلوی دبستانوں کا خوبصورت سنگم قرار دیا جاسکتا ہے۔

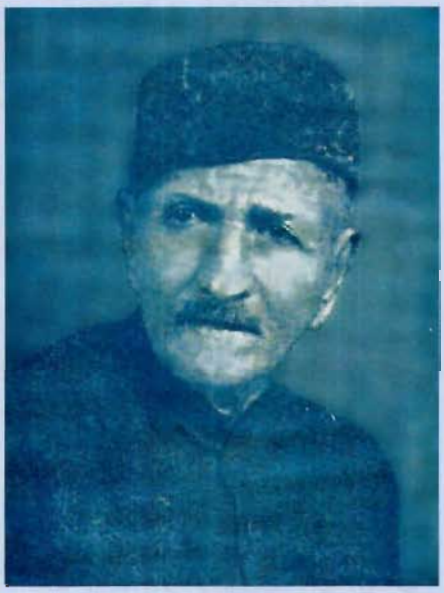

گرچہ دل شاہجہاں پوری کے یہاں امیر مینائی اسکول کا رنگ و روغن اکثر ہمیں اپنی جانب مائل ومتوجہ کرلیتا ہے تاہم دل شاہجہاں پوری کا اختصاص یہ ہے کہ

انھوں نے اپنے استاد امیر مینائی کے لکھنؤ اسلوب واظہار کی مکمل پیروی نہیں کی بلکہ انھوں نے لکھنوی دبستاں کے برخلاف دہلوی دبستاں کو ترجیح دی ہے اس ضمن میں دل شاہجہاں پوری بذاتِ خود یوں روشنی ڈالتے ہیں ''میں نے غالب مرحوم کی بھی پیروی کی ہے مگر ایک حد تک پیچیدہ ترکیبوں، بعید الفہم استعاروں سے احتراز کیا ہے۔ مومن کے طنزیات اور خودداری عشق سے بھی استفادہ کیا ہے۔ میر دہلوی کی سادگی بھی میرے اشعار میں اکثر نظر آئے گی حضرت استاد امیر لکھنوی کے پرشکوہ انداز اور متین اندازِ بیان کا بھی مقلد ہوں۔'' (ترانۂ دل، دل شاہجہاں پوری، ص59، مطبوعہ سرفراز پریس لکھنؤ، 195)

ان کے مطمحِ نظر کی عکاسی درج ذیل اشعار سے بخوبی واضح ہوتی ہے:

افسانۂ دل طولانی ہے آغازِ محبت سے اب تک
کچھ بھول گئے کچھ یاد رہا، جو یاد رہا وہ کہنا ہے
کریں گے عشق کی رسوائیوں پر غور اے ناصح
کبھی فرصت اگر ہوجائے گی چاکِ گریباں سے
کسی کی یاد تھی آنکھوں سے اشک ڈھلتے تھے
اسی خیال میں ہم کروٹیں بدلتے تھے
ہم کو بے چین کیے جاتے ہیں
ہائے کیا شے وہ لیے جاتے ہیں
نہ وہ آرام جاں آیا نہ موت آئی شب وعدہ
اسی دھن میں ہم اٹھ اٹھ کر ہزار بار بیٹھے ہیں

دل شاہجہاں پوری کے کلام کے مطالعے سے یہ حقیقت بھی واشگاف ہوتی ہے کہ ان کا کلام مختلف رنگوں اور اسالیب سے مملو ہے ان کے یہاں خوش رنگ پھولوں کی ایک ایسی فرحت بخش اور دلکش مالا ہے کہ جس میں رنگارنگ اور صد رنگ پھول اپنی بہار اور مہکار سے ہمیں اپنی طرف راغب کرلیتے ہیں۔

دل شاہجہاں پوری کے یہاں اکثر تصوف کی کارفرمائی بھی دیدنی ہے۔ اس ذیل میں دل شاہجہاں پوری یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں: ''میری فطرت ہی جذبات نگاری، اثرپذیری، واقعہ نویسی کی حامل تھی۔ تصوف اور فلسفیانہ اندازِ بیان بھی میں جزوِ تغزل سمجھتا ہوں۔'' (غزل کا معیار اور مذاق سلیم کی تعریف، رہنمائے تعلیم دل نمبر لاہور1936)

رنگِ تصوف سے لبریز یہ اشعار دیکھیے:

پیراہنِ ہستی کو خود نذرِ جنوں کردوں
تم کاش کبھی کہہ دو اپنا مجھے دیوانہ
اک خواب کا عالم تھا آغاز سے آخر تک
یا وہم کی نقاشی جو کچھ بھی نظر آیا
تلاشِ یار میں خود کھوگئے مگر اے دل
یہ حوصلہ ہے ابھی اور جستجو کرتے
خمخانۂ ہستی میں ہر نشہ کی اک حد ہے
ساقی ترا متوالا ہشیار نہیں ہوتا

غرضیکہ دل شاہجہاں پوری کی شاعری میں، امیر مینائی کی شائستگی، سرشاری اور شگفتگی زبان کے عناصر ثلاثہ کی خوبیاں موجود ہیں تاہم دل شاہجہاں پوری کے یہاں، عامیانہ پن، عریانی، ابتذال، سطحیت، رکاکت اور سوقیانہ پن کے عناصر ولوازم بالکل نہیں ہیں۔

■

Dr. Khalid Husain Khan, Head, Dept of Urdu, Meerut College, Meerut - 250002 (UP)

ابوسفیان

"میں کس قدر مغموم اور رنجیدہ ہوا ہوں۔ قطب الدین خان میرے لیے ایک عزیز لڑکے، مہربان بھائی اور شفیق دوست کی طرح تھے۔ خدا کی مرضی کے سامنے میں کیا کرسکتا ہوں۔ تقدیر کے فیصلے کے سامنے میں نے سپردگی کا راستہ اختیار کیا۔" (جہانگیر)

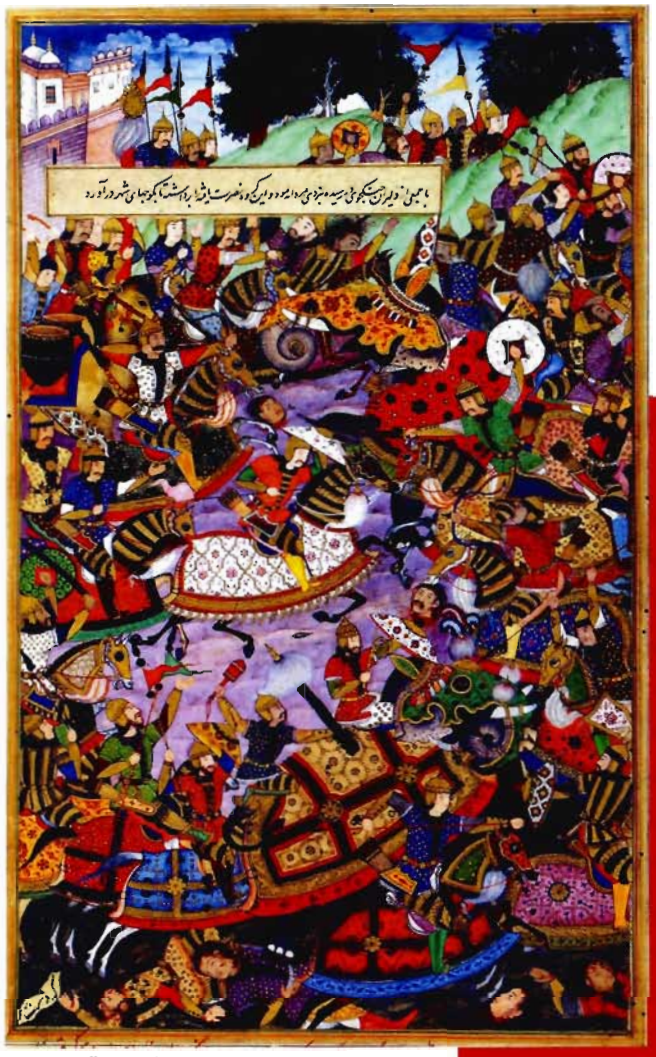

شیر افگن کا قتل اور جہانگیر کا نور جہاں سے عشق

شیر افگن کی موت کے متعلق مورخین کے درمیان اختلاف رائے ہے اور اس کی موت کے اسباب کے سلسلے میں مورخین نے جداگانہ رائے قلم بند کی ہیں۔

شاہنواز خان، خافی خان، سجن رائے وغیرہ بادشاہ جہانگیر کو شیر افگن کے قتل کا ذمے دار تصور کرتے ہیں۔ جب کہ ابوالفضل، معتمد خاں۔ کامگار حسینی، شیخ فرید بھگاری وغیرہ جہانگیر کے ملوث ہونے کے معاملے میں خاموش ہیں۔ ہم عصر یوروپی سیاح بھی اس میں جہانگیر کے ملوث ہونے کے طرف اشارہ نہیں کرتے۔

اس لیے اس معاملے میں غیر جانب دارانہ طور پر حقائق کے تجزیے کی ضرورت ہے۔ اس واقعے کے اہم کردار علی قلی بیگ استجلو یعنی شیر افگن کے حالات زندگی کا مطالعہ کرنے سے یہ علم ہوتا ہے کہ 1599 میں اکبر نے اسے میواڑ کی مہم میں شہزادہ سلیم کے زمرہ میں شامل کردیا۔ اس کی بہادری اور شجاعت سے شہزادہ سلیم بہت متاثر ہوا اور اسے شیر افگن کے خطاب سے نوازا۔

لیکن جب شہزادہ سلیم نے اپنے باپ کے خلاف 1605 میں بغاوت کا علم بلند کیا تو شیر افگن نے شاہی افواج کا ساتھ دیا۔ فطری طور پر شہزادہ سے اس کے تعلقات میں کڑواہٹ آئی، لیکن تخت نشینی کے بعد جہانگیر نے عام معافی کے اعلان کے تحت اپنے سبھی مخالفین کو معاف کردیا اور شیر افگن کو بھی ایک معقول عہدہ اور بنگال کے بردوان میں جاگیر عطا کی۔ گرچہ جہانگیر نے اسے معاف کردیا لیکن بنگال میں اس کی تعیناتی سے بادشاہ کی ناراضگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس زمانے میں بنگال اپنی مسموم آب و ہوا اور سیاسی افراتفری کے سبب مناسب مقام تصور نہیں کیا جاتا تھا جیسا کہ مخزن الغرائب میں منقول ہے۔ ''ان دنوں انھیں لوگوں کو بنگال میں تعینات کیا جاتا تھا جس سے بادشاہ کی ناراضگی ہوتی تھی۔''

ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے بھی اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ان دنوں بنگال باغی افغانوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور باغی افغان اپنی کھوئی ہوئی طاقت اور حکومت و اقتدار کی واپسی کی امید میں پورے ملک سے آکر یہاں جمع ہورہے تھے اور حکومت کے خلاف سازش و ریشہ دوانیوں میں مشغول تھے۔

شیر افگن کی وفاداری بھی شک و شبہات کے گھیرے میں آگئی اور اس کی نافرمانیوں اور نازیبا حرکتوں کی اطلاع دربار میں پہنچنے لگی۔ جہانگیر نے اس کی حرکتوں کی تحقیق کے لیے بنگال کے صوبے دار قطب الدین خان کو ہدایت دی اور فرمایا کہ اگر شیر افگن کی بے گناہی اور وفاداری سے مطمئن ہے تو اس کو اس کے عہدے پر رہنے دیا جائے۔ ورنہ اسے دربار میں بھیج دیا جائے۔ اگر وہ دربار آنے سے انکار کرتا ہے تو اس کو سزا دی جائے۔ قطب الدین خان نے اپنے تئیں پوری شائستگی اور خوش اخلاقی سے کوشش کی کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آجائے

اور اس کو روبرو بات کرنے کی دعوت دی۔ لیکن شیر افگن نے یکے بعد دیگرے عذر کے ذریعے اس کی خواہش کو ٹال دیا تو قطب الدین خان کو اس کے خلاف کارروائی کرنے پر مجبور ہونا پڑا اور اس نے شہنشاہ کو اس کی نازیبا حرکتوں سے واقف کرادیا۔ شہنشاہ نے قطب الدین کو ایک شاہی فرمان کے ذریعے شیر افگن کو دربار میں بھیجنے کا حکم صادر کیا۔ ساتھ ہی ساتھ صوبے دار کو مزید ہدایت دی کہ اگر وہ نافرمانی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو اسے سزا دی جائے۔

شاہی فرمان کی تعمیل کرتے ہوئے قطب الدین خان شیر افگن کے معاملے کو طے کرنے کی غرض سے بردوان پہنچا۔ اس درمیان حیدر ملک کے مطابق یوسف خان کا تبادلہ بردوان کردیا گیا اور شیر افگن کی جاگیر عطا کردی گئی۔ جب یوسف خان مشکل کوٹ پہنچا تو قطب الدین خان بھی وہاں پہنچ چکا تھا اور شیر افگن کو ملاقات کے لیے طلب کیا۔ دوسرے دن صبح میں شیر افگن اس سے ملنے آیا اور اس کو برا بھلا کہا اور اس پر قتل کرنے کی سازش کا الزام لگایا۔ شیر افگن اپنے ہاتھ میں تلوار لے کر قطب الدین خاں کی طرف بڑھا۔ حیدر ملک نے مداخلت کی اور اس کا راستہ روک دیا۔ لیکن شیر افگن کے ہاتھوں قطب الدین خاں بری طرح سے زخمی ہوگیا اور چوبیس گھنٹے کے اندر مرگیا۔ حیدر ملک کے چہرے اور سینے پر گہرا زخم لگا۔ شیر افگن نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن ایک ہاتھی کے ذریعے اس کا راستہ روک دیا گیا۔ خشم آلودگی میں اس نے ہاتھی کو بھی زخمی کردیا لیکن اس کارروائی میں خود شیر افگن کا گھوڑا مارا گیا۔ اسی بیچ انبا خان کشمیری نمودار ہوا اور شیر افگن کو برا بھلا کہنے لگا۔ شیر افگن واپس ہوا اور انبا خان کو بھی بری طرح سے زخمی کردیا اور بھاگنے کی کوشش کی لیکن یوسف خان نے شیر افگن پر حملہ کرکے اس کا کام تمام کردیا۔ اس طرح انبا خان کی موت کا بدلہ لے لیا۔

حیدر ملک کے بیانات کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ سب سے پہلے یوسف خان کا شیر افگن کی جاگیر پر تبادل جہانگیر کے ذریعے نور جہاں کو حاصل کرنے کی کوئی سازش نہیں تھی بلکہ یوسف خان کے خلاف جہانگیر کی ناراضگی تھی اس کے برعکس شیر افگن نے شاہی حکم کی تعمیل نہیں کی اور تقریباً بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔

ان شواہد سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شیر افگن اپنی بدبختی کے لیے خود ذمے دار تھا۔ اس کے قتل میں جہانگیر کے ملوث ہونے کی بات حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں خافی خان اور شاہنواز خان کے بیان کو بعد کے مورخین نے اپنی تفصیلات میں دہرایا ہے لیکن اس کی تصدیق ہم عصر فارسی اسناد میں نہیں ملتی یہاں تک کہ معتمد خان، کامگار حسینی اور عبدالحمید لاہوری جو نور جہاں سے اپنی عداوت کے لیے مشہور ہیں، اس واقعے میں جہانگیر کے ملوث ہونے کی طرف ہلکا سا بھی اشارہ نہیں کیا ہے۔

یہ دلیل دی جاسکتی ہے کہ کوئی درباری مورخ اس طرح کے اسکینڈل کی طرف اشارہ کرنے کی جرأت نہیں کرے گا جس سے پورے خاندان کی عزت و ناموس پر حرف آئے لیکن اس طرح کا خوف ہم عصر یوروپی سیاحوں کو تو نہیں تھا اور وہ اس طرح کے واقعے کا ذکر اگر ہوتا تو ضرور کرتے۔

جہانگیر کے دور میں کئی یوروپی سیاح ہندوستان آئے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہل کاروں نے سیکڑوں خطوط اپنے ملک کے اعلیٰ عہدیداروں کو بھیجے۔ انھوں نے اپنے خطوط میں جہانگیر کے عہد کے اہم واقعات جیسے خسرو کو اندھا کرنا، خسرو کے قتل میں شاہ جہاں کا ہاتھ۔ شاہ جہاں کی بغاوت، مہابت خاں کی یوروش وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ لیکن انھوں نے اپنی کسی بھی تفصیلات میں مہرالنسا کو حاصل کرنے کے لیے جہانگیر کے ذریعے اس کے شوہر کو قتل کرانے کی سازش کا ذکر نہیں کیا ہے یہاں تک کہ قصہ کہانی یا افواہ کی شکل میں بھی شیر افگن کے قتل میں جہانگیر کے ملوث ہونے کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ اگر اس سلسلے میں ذرا سی بھی بات ہوتی تو وہ ضرور اس کی طرف اشارہ کرتے۔ اس طرح یہ بات قابل یقین نہیں ہے کہ سبھی غیر ملکی سیاح اس واقعہ میں جہانگیر کے قصور کو ریکارڈ کرنے میں چوک جاتے اگر صحیح معنوں میں جہانگیر قصوروار ہوتا۔

اس کے علاوہ اس الزام کے منفی بیانات اپنے آپ میں تضاد کے گھیرے میں ہیں اور یہ متضاد بیانات اس واقعے میں جہانگیر کی بے گناہی کو ثابت کرتے ہیں۔

حال کے کچھ مورخین کا خیال ہے کہ راجہ مان سنگھ کی جگہ قطب الدین خان کو بنگال کا صوبے دار بنانے کا خاص مقصد اپنے آقا کے لیے مہرالنسا کی بازیابی تھی۔

حقائق کے تجزیے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تخت نشینی کے معاملے میں راجہ مان سنگھ کے ذریعے خسرو کی طرف داری کے سبب جہانگیر کے راجہ مان سنگھ سے تعلقات پہلے سے ہی کشیدہ تھے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ آر پی ترپاٹھی رقم طراز ہیں کہ راجہ مان سنگھ اور ان کے معاون بنگال میں بے اثر ثابت ہورہے تھے اور جہانگیر انھیں شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ جہانگیر کے لیے نہایت ضروری تھا کہ بنگال کے واقعات پر نگرانی رکھنے اور ریشہ دوانیوں کے خاتمہ کے لیے قطب الدین خان جیسے وفادار اور قابل اعتماد آفیسر اور دوست کو وہاں کا صوبہ دار بنائے۔

اس طرح عصر حاضر کے تاریخ دانوں کا یہ الزام کہ صرف مہرالنسا کی بازیابی کے لیے قطب الدین خان کو بنگال کا صوبے دار بنایا گیا تنقید و حقائق کی روشنی میں کھرا نہیں اترتا اور پھر ہم عصر اسناد سے بھی اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔

عام طور پر ایسا کہا جاتا ہے کہ اگر شیر افگن کے دل و دماغ میں کوئی باغیانہ ارادہ ہوتا تو وہ صوبے دار سے صرف دو جلوداروں کے ساتھ ملنے نہیں جاتا۔ وہ پوری فوجی تیاری کے ساتھ جاتا۔ لیکن اس معاملے میں ڈاکٹر آر پی ترپاٹھی کا بیان قابل اظہار ہے کہ بغیر محافظ کے صوبے دار سے ملنے جانے کے پیچھے شیر افگن کا مقصد خود اس کی نافرمانی کی وجہ سے صوبے دار کو جو ناراضگی تھی اس کو دور کرنا تھا۔ شیر افگن کا یہ رویہ ٹھیک اسی طرح تھا جیسا بیرم خان نے قندھار میں ہمایوں کے سامنے اپنی نافرمانیوں کو پوشیدہ رکھنے کے لیے کیا تھا۔ لیکن قطب الدین خان نے اپنی ذہانت کا استعمال کیا اور شیر افگن کے مغالطے میں نہیں آیا۔ اس کے برخلاف شیر افگن کی غیر رسمی اور بے تکلفی کے رویے سے بہت زیادہ ناراض ہوا اور اس کی اس حرکت کو نہ صرف اپنی بے عزتی سمجھی بلکہ اسے شیر افگن کی سوچی سمجھی ترکیب جانی۔

خافی خان اور شاہنواز خاں کا قول ہے کہ جب جہانگیر نے قطب الدین خان کو بنگال کے لیے روانہ کیا تو اس نے شیر افگن کے متعلق کچھ خفیہ ہدایتیں دیں۔ شر افگن کو اس کا علم دربار میں موجود اس کے ایجنٹ کے ذریعے ہوگیا۔ اس دن سے اس نے شاہی پوشاک 'یرق' اتار دیا اور اعلان کردیا کہ وہ اب شاہی ملازم نہیں ہے۔

اس کا تجزیہ کرنے پر بڑی آسانی سے یہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ قطب الدین خاں کے بنگال جانے کے قبل ہی شیر افگن نے اعلانیہ طور پر نافرمانی کا مظاہرہ کردیا تھا۔ اس سے بھی اس معاملے میں جہانگیر کی ایمانداری صاف دکھائی پڑتی ہے۔

کچھ مورخین کا یہ بیان کہ شیر افگن کی موت کے بعد اس کی بیوہ مہرالنسا کو جہانگیر کے حکم سے دربار میں لانے کا خاص مقصد جہانگیر کے لیے اس کی بازیابی تھی جو غیر منصفانہ اور بغض عناد سے لبریز معلوم ہوتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب گل چہار بیگم کا شوہر تختہ بیگ سلطان ہمایوں کے عہد میں اودھ میں انتقال کرگیا تو ملازموں نے گل چہار بیگم کو شاہی فرمان کے ملنے کے بعد ہی اسے آگرہ بھیجا۔

اس لیے شیر افگن کی موت کے بعد اس کی بیوہ مہرالنسا کو دربار میں لانے کا مقصد جہانگیر کا شادی کرنا حقیقت پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے مقتول قطب الدین خان کے آدمیوں کے انتقام سے محفوظ رکھنا تھا۔ درحقیقت شیر افگن کے واقعے کو بہت زیادہ توڑ مروڑ کر پیش کرنے کا مقصد جہانگیر کو اس میں ملوث کرنا معلوم پڑتا ہے۔ لیکن جب بنگال کے پریشان کن سیاسی حالات، شاہ اسمٰعیل صفوی کی موت کے بعد ایران سے شیر افگن کا پراسرار طریقے سے ہندوستان آنا، اس کا باغیانہ رویہ اور ضرورت سے زیادہ امنگ اور حوصلہ مندی وغیرہ کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ شیر افگن کی موت میں جہانگیر ملوث نہیں تھا۔ خود جہانگیر نے اپنی یادداشت میں شاہ اسمٰعیل کی موت کے بعد ایران سے شیر افگن کے بھاگنے اور اس کی فطری بدخصلتی کا ذکر کیا ہے۔

اس طرح ان حقائق کی روشنی میں میں اس فیصلے پر پہنچتا ہوں کہ جہانگیر کو شیر افگن کے قتل کے الزام سے بری کر دیا جائے۔

"وہ اس کی محبت میں گرفتار تھا جب وہ ایک دوشیزہ تھی لیکن اس کی شادی ترک شیر افگن سے کردی گئی لیکن اس نے اس کے لیے اپنی محبت کبھی ختم نہیں کی۔" — (ڈی لیٹ)

شہزادہ سلیم کے مہرالنسا کے ساتھ ابتدائی معاشقہ کے سوال پر مورخین میں اختلاف رائے ہے اور حقیقت پر قصہ کہانی، افسانہ اور تخیلات کے بادل گھرے ہوئے ہیں۔

ہم عصر تواریخ، جیسے عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ، حیدر ملک کی تاریخ کشمیر، محمد امین کی انفارالاخبار، محمد قاسم فرشتہ کی تاریخ فرشتہ، محمد عبدالباقی کی مآثر رحیمی، ابوالفضل کی آئین اکبری وغیرہ نے اس مسئلے پر براہِ راست نشان دہی نہیں کی ہے لیکن دو ہمعصر ریکارڈ میں سلیم اور مہرالنسا کے ابتدائی معاشقے کی طرف اشارہ ہے۔ ایک ہے۔ ہم عصر پھالودی کھیات۔ جس کی عبارت ہے "جب بادشاہ جہانگیر شہزادہ سلیم تھا تو اعتماد الدولہ کی لڑکی اور آصف خان کی بہن نورمحل کے ساتھ اس کا عشق تھا۔" دوسرا ہے۔ ڈچ مصنف ڈی لیٹ جو رقم طراز ہے "اس کا اپنے باپ کے زمانے میں جب وہ دوشیزہ تھی، سلیم سے تعلقات تھے، لیکن اس کی شادی ترک شیر افگن سے کردی گئی، اس طرح اس کے باپ نے شادی کی اجازت نہیں دی لیکن وہ اپنی محبت کبھی نہیں بھول پایا۔"

جہاں تک ہم عصر فارسی مآخذ کی بات ہے تو اس سلسلے میں کئی مورخین کی تفصیلات میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

شاہ جہاں کے عہد کا مورخ شاہنواز خان لکھتا ہے کہ مرزا غیاث بیگ کی بیوی کی جہانگیر کے دربار میں رسائی تھی اور اس کے ساتھ اکثر و بیشتر اس کی لڑکی بھی جایا کرتی تھی۔ شہزادہ سلیم کی اس سے محبت ہوگئی اور جب اس کی محبت کی خبر حرم میں عام ہوگئی اور بادشاہ اکبر کو بھی خفیہ طور پر اس کی جانکاری ملی تو اس نے بلا تاخیر اس کی شادی علی قلی بیگ استجلو سے کردی۔

خافی خان جس نے اپنی کتاب 'منتخب اللباب' کی تکمیل عالمگیر کے عہد میں کی، رقم طراز ہے "جب مہرالنسا سن بلوغ کو پہنچی تو سلیم اس کا عاشق ہوگیا اور اس نے فرط محبت کا اظہار کرنے کے لیے اسے اپنے سینے سے لگا لیا،

اس نے اپنے آپ کو اس سے آزاد کیا، اور اس کی شکایت شاہی خواتین سے کی، بادشاہ نے سختی کے ساتھ اسے (شہزادہ) کو پھٹکارا اور مہرالنسا کی شادی علی قلی بیگ استجلو سے کردی۔"

خافی خان اور شاہنواز خان کے علاوہ دوسرے مآخذ جیسے خلاصۃ التواریخ، ریاض السلاطین، مفتاح التواریخ، نسخۂ جہانگیری اور منوچی وغیرہ نے بھی مہرالنسا کے ساتھ جہانگیر کے سن بلوغت کی محبت کا ذکر کیا ہے۔

عصر جدید کے ملکی اور غیر ملکی مورخین نے اسی نقش قدم پر چل کر ان کے بیان پر بھروسہ کرکے بار بار اس افسانے کو دہرایا ہے۔

حقیقت اور صحیح جانکاری کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ اس مسئلے کا منصفانہ اور محققانہ تجزیہ کیا جائے۔

ہم عصر فارسی مآخذ شہزادہ سلیم اور مہرالنسا کی محبت کے متعلق بالکل خاموش ہیں۔ مہرالنسا کی ابتدائی زندگی، شیر افگن کے ساتھ شادی، اور پھر شیر افگن کے قتل کا تذکرہ بے شک کیا گیا ہے لیکن سلیم کا مہرالنسا کے ساتھ عشق کا ذکر بالکل نہیں ہے۔

'راجپوت بارڈس' کا تجزیہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ مختلف نمایاں غلطیوں سے پُر ہے جیسے اس میں پرویز کی جلاوطنی کا ذکر ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب بعد میں لکھی گئی۔ لیکن تاریخ ابتدا کی ڈال دی گئی۔ دوسرے، مصنف نے افواہ اور قصہ کہانی پر بھروسہ کیا ہے، اس طرح پھالودی کھیات کو اس معاملے میں باوثوق ذریعہ نہیں مانا جاسکتا۔

ٹھیک اسی طرح ڈی لیٹ کے بیان کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد ہم مندرجہ ذیل نتیجے پر پہنچتے ہیں۔

اوّل تو یہ کہ ڈی لیٹ کو مغربی سیاحوں میں شمار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس نے کبھی ہندوستان کا سفر نہیں کیا۔ اس کی تحریر سورت میں سترہویں صدی کی تیسری دہائی میں تعینات بستی کے مالک پیٹروان ڈن بروک کے ذریعے مہیا کرائے گئے تفصیلات پر مبنی ہے۔ اس نے صرف اس کو یکجا کرکے تحریری شکل دی ہے۔ اس لیے اس کے بیان کو ذاتی تجربے کی کمی کے باعث درست نہیں مانا جاسکتا۔ اس کے علاوہ یہ تفصیلات پوری طرح سے افواہ اور افسانے پر مبنی ہے۔

اس کے علاوہ 1580 سے 1627 کے درمیان نہ صرف مختلف یوروپی سیاح ہندوستان آئے بلکہ ان میں سے کچھ جیسے سرٹامس رو، ہاکنس، پیلزرٹ وغیرہ، ایک لمبے عرصے تک دربار میں مقیم رہے۔ ان سبھی نے مہرالنسا کی ابتدائی زندگی، جہانگیر کے ساتھ اس کی شادی اور بادشاہ حکومت پر اس کے بڑھتے ہوئے اثرات کا ذکر کیا ہے۔ لیکن کسی نے بھی مہرالنسا کے ساتھ شہزادہ سلیم کے عشق و محبت کا ذکر نہیں کیا ہے۔

اس طرح ڈی لیٹ کے بیان کو ہم عصر یورپی سیاحوں کی تفصیلات سے تائید حاصل نہیں ہے۔ اس لیے اس کے بیان کو اس معاملے میں درست نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

جہانگیر اور مہرالنسا کی عشقیہ داستان کے سلسلے میں ڈی لیٹ کے بیان کی تائید ڈاکٹر آشیروادی لال شری واستو نے پٹنہ کے پروفیسر حسن عسکری کے ذریعے دریافت ایک قلمی نسخہ کے حوالے سے کیا ہے۔ ڈاکٹر اے، ایل شری واستو کے مطابق "سلیم نے مہرالنسا کو جسمانی طور پر زد و کوب کیا جب اس نے اکبر سے انصاف کی

درخواست کی۔''

میں نے ذاتی طور پر پٹنہ یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ نسخے کا مطالعہ کیا۔ اس نسخے میں بے شک سلیم کی مہرالنسا کے ساتھ محبت کا ذکر ہے لیکن ڈاکٹر اے ایل شری واستو نے جس زدوکوب کا ذکر کیا ہے اس کی سند نہیں ملتی۔ شاید قابل پروفیسر نے پروفیسر عسکری کے بیان کی رونق افزائی کی ہے۔

شاہنواز خان اور خافی خان کے بیانات کا منصفانہ طور پر تجزیہ کرنے کے بعد ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ان دونوں نے اپنی اپنی تصنیف شاہ جہاں اور عالمگیر کے عہد میں مکمل کی اور بعد کے مورخین نے دونوں کے نقش قدم کو اپنایا۔ چونکہ دونوں نور جہاں سے عداوت رکھتے تھے اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نور جہاں کے بعد کے روشن کردار کو مشکوک و داغ دار کرنے کے واسطے یہ افسانہ ایجاد کیا گیا۔ یہاں تک کہ کامگار حسینی جنھوں نے اپنی تصنیف جہانگیر کی موت کے بعد مکمل کی اور نور جہاں سے عداوت بھی رکھتا تھا لیکن اس طرح کے کسی افسانے کا ذکر نہیں کیا کہ شہزادہ سلیم مہرالنسا کی محبت میں گرفتار تھا۔

جہاں تک معتمد خان کی بات ہے تو وہ نور جہاں کے حالات زندگی کی تفصیلات کا ذکر کرنے کے دوران جہانگیر سے مہرالنسا کی شادی کے متعلق رقم طراز ہیں:

''در ہائی بستہ را کلید آمد دلہائی خستہ را دواشد''

''مقفل دروازوں کی کنجی مل گئی اور مریض دلوں کو دوا مل گئی۔

عتمد خان کے بیان کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

اوّل تو یہ کہ معتمد خان نے جہانگیر کے انتقال کے بعد اپنی تصنیف کو پورا کیا۔ اس لیے اس کو شہزادہ سلیم اور مہرالنسا کے عشق کی داستان کو بیان کرنے کے معاملے میں کسی طرح کا خوف نہیں تھا۔ جب شاہنواز خان اس کا ذکر کرسکتا ہے تو وہ کیوں نہیں۔ اس کے متعلق اپنی تحریر میں اس کا ذکر کرسکتا تھا۔

دوسرے یہ کہ صرف اس بیان سے کہ ''مریض دل کو دوا مل گئی۔'' یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ دونوں میں ابتدائی معاشقہ تھا۔

اس طرح مندرجہ بالا ذرائع کا محققانہ اور منصفانہ تجزیہ کرنے کے بعد آسانی سے مندرجہ ذیل نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔

اول تو یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اگر شہزادہ اور مہرالنسا کے درمیان معاشقہ تھا تو اکبر نے دونوں کو شادی کی اجازت آسانی سے دی ہوتی۔ کیونکہ مہرالنسا ایران کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔

دوسرے یہ کہ اگر مہرالنسا کی شیرافگن کے ساتھ شادی نے شہزادہ سلیم کو مایوس کردیا تو اکبر جیسا دوراندیش حکمراں علی قلی استجلو کو 1599 میں میواڑ کے رانا کے خلاف شہزادہ سلیم کی کمان میں شامل نہیں کرتا اور پھر سلیم

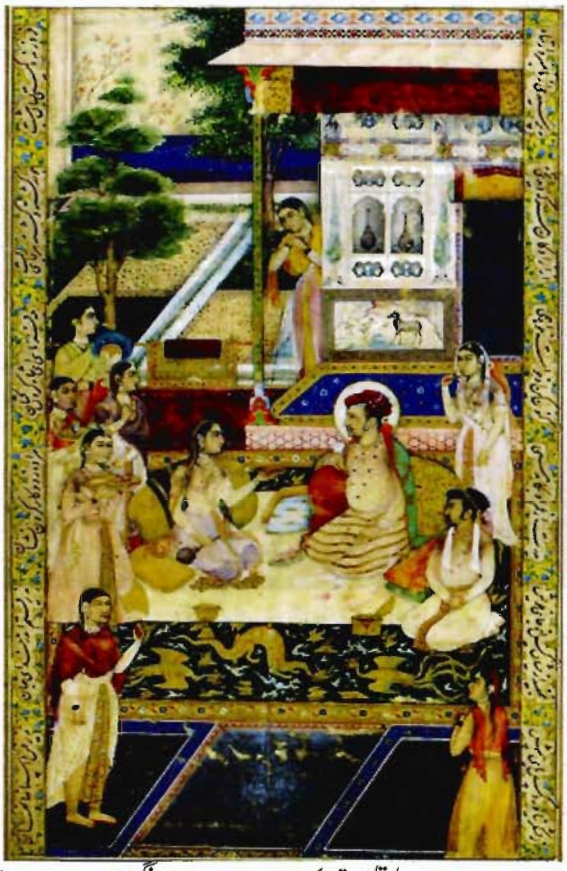

کے ذریعے علی قلی استجلو کی بہادری پھر اسے شیرافگن کے خطاب سے نہیں نوازا جاتا۔ اس طرح کی کوئی نشاندہی نہیں ملتی کہ دونوں کے درمیان کسی طرح کی دوری یا نااتفاقی تھی اور جہانگیر کے دل و دماغ میں کسی طرح کا بغض وعناد تھا۔

تیسرے: اگر سلیم کے دل میں پرانی محبت پل رہی ہوتی اور وہ اپنے پرانے رقیب سے چھٹکارا پانا چاہتا تو وہ شیرافگن کو اپنی بغاوت کے دوران جب شیرافگن نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اُسے اپنے راستے سے ہٹا دیتا۔ اگر سلیم ابوالفضل کا قتل کراسکتا تھا جو کہ اکبر کی حکومت کا ایک اہم ستون تھا تو وہ بڑی آسانی سے شیرافگن کو اپنے راستے سے ہٹا سکتا تھا۔ اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ سلیم نے اپنی تخت نشینی کے بعد اس کی پرانی غلطیوں کو معاف کردیا اور بنگال کے بردوان میں عہدہ اور جاگیر عطا کی۔ علاوہ ازیں اگر اس کو مہرالنسا کو حاصل کرنے کی بے پناہ چاہت ہوتی تو وہ اس طرح کے ہتھکنڈے کو نہیں اپناتا جیسا کہ الزام لگایا جاتا ہے۔

چوتھے: اکبر اور جہانگیر دونوں نے تورۂ چنگیزی جو تیمور کا بنایا ہوا قانون تھا، اپنایا۔ اس کے تحت اگر بادشاہ کسی سے شادی کرنے کی خواہش رکھتا ہے خواہ وہ دوشیزہ ہو یا شادی شدہ خاتون، تو وہ اپنے خیالات کو متعلقہ لوگوں کو پہنچوا دیتا تھا اور بادشاہ کی خاطر متعلقہ شوہر کو اپنی بیوی کو طلاق دینا پڑتا تھا تاکہ بادشاہ اس سے شادی کرسکے۔ جب یہ قانون عمل میں تھا تو جہانگیر بہت آسانی سے اس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ جہانگیر نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ جواب صاف ہے کہ جہانگیر کی ایسی کوئی پرانی خواہش نہیں تھی۔

علاوہ ازیں جہانگیر اپنی سوانح عمری میں چھوٹی سی چھوٹی باتوں کا ذکر کرتا ہے۔ وہ پہلی بیوی مان بائی کی موت اور شیرافگن کے ہاتھوں قطب الدین خان کے قتل سے جو اسے صدمہ پہنچا ان سب کا ذکر کرتا ہے پھر وہ کیوں مہرالنسا کے ساتھ اپنی محبت کا ذکر نہیں کرتا؟

اس طرح مختلف ذرائع کا گہرائی سے محققانہ اور منصفانہ تجزیہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شاہنواز خان، خافی خان، سجن رائے، منوچی اور دوسرے یورپی اور بعد کے ہندوستانی تاریخ دانوں نے مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ حقیقت میں شہزادہ سلیم کا مہرالنسا کے ساتھ کوئی معاشقہ نہیں تھا۔ میں ڈاکٹر بنی پرشاد اور ڈاکٹر آر پی ترپاٹھی کے بیانات سے متفق ہوں کہ سلیم کا مہرالنسا کے ساتھ عشق ومحبت کا کوئی ابتدائی رشتہ نہیں تھا۔

حقیقت میں کچھ مصنفوں کے ذریعے شروع کیا گیا یہ افسانہ ایک تاریخی افسانہ بن گیا ہے جس میں حقیقت کو افسانوی اور رومانی شکل دے دی گئی۔

■

ماخذ: نور جہاں بیگم: شخصیت اور کارنامے، مصنف: ابوسفیان، پہلی اشاعت 2013، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مفتی عمران

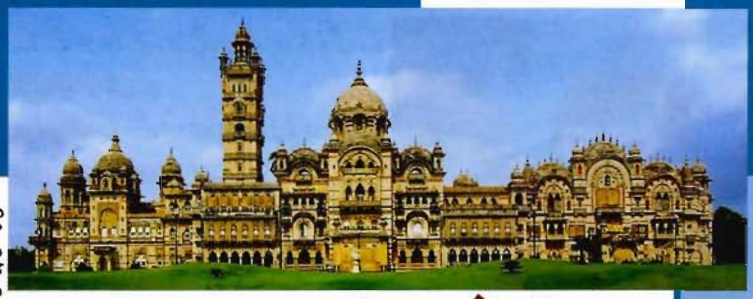
لکشمی ولاس پیلس

کیرتی مندر

تاریخی شہر بڑودہ

بڑودہ شہر کی تاریخی اہمیت: حقیقت میں بڑودہ شہر گجرات کے درمیان میں ہے۔ اس کی آبادی میں بادشاہ محمود بیگڑہ، بابی بادشاہ اور مہاراجہ سیاجی راؤ گائکواڑ نے چار چاند لگا دیے۔ محمود بیگڑہ کو درخت لگانے کا بڑا شوق تھا۔ احمد آباد سے بڑودہ تک راستے میں درخت لگوائے۔ اسی طرح بڑودہ میں وڈ (بڑ) کے درخت بہت زیادہ لگائے گئے جس کی وجہ سے بڑودہ کا نام وڈودراہ رکھا گیا یا پھر شہر کے لوگ بڑے نرم مزاج تھے اس لیے برودت سے بڑودہ رکھا گیا۔ بہرحال دہلی کے بادشاہوں کی نگاہیں اس شہر کی طرف مرکوز رہیں اور اپنی حکومت قائم کرتے رہے۔ بعد میں مسلم بادشاہوں کے بعد مہاراجہ سیاجی راؤ گائکواڑ نے بڑودہ شہر کو اس طرح تعمیر کیا کہ آج تک گجرات کے شہروں میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ بڑودہ شہر میں درپیچ لائن کا جو انتظام کیا گیا ہے شاید ہندوستان کے کسی شہر میں نہیں ہے۔ آج بھی شہر بڑودہ اپنے علم وفن اور صنعت وحرفت میں خوب مشہور ہے اور قریب ہی زمانہ میں شاید بنگلور کے بعد بڑودہ شہر کمپیوٹر لائن میں بہت آگے نکل جائے گا۔

محل وقوع: شہر بڑودہ کا محل وقوع گجرات کا درمیانی علاقہ ہے یعنی شمال میں احمد آباد، جنوب میں بھروچ مغرب میں جمبوسر مشرق میں ڈھبوئی واقع ہے۔ حدود اربعہ، شمال میں باجوا جنوب میں مکرپورا مغرب میں پادرا مشرق میں ڈھبوئی تک ہے۔

صنعت و حرفت: شہر بڑودہ عام طور پر صنعت و حرفت میں مشہور و معروف نہیں ہے پھر بھی ماضی میں نقاشی، رنگریزی، آہنگری وغیرہ میں مشہور تھا۔

فی زمانہ شہر بڑودہ میں دوا کمپنیاں کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ زیادہ سے زیادہ دوائیں اس شہر میں دستیاب رہتی ہیں۔ اسی طرح پلاسٹک بیگ کا کام اس شہر میں خصوصی صنعت وحرفت کا درجہ رکھتا ہے اور یہاں کا نمکین بہت زیادہ مشہور ہے، بقیہ صنعت وحرفت میں بڑے پیمانے پر چھوٹے موٹے کام کاج چلتے رہتے ہیں۔

تعلیمی سماجی سیاسی صورت حال: شہر بڑودہ پہلے ہی سے تعلیم یافتہ شہر رہا ہے۔ مہاراجہ سیاجی راؤ گائکواڑ نے یہاں کے لوگوں کا تعلیمی جذبہ دیکھ کر ایم ایس یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی جس میں ہزاروں طلبہ و طالبات بڑی بڑی ڈگریوں سے سرفراز ہوتے رہتے ہیں۔ فی الحال شہر بڑودہ احمد آباد کو چھوڑ کر میڈیکل میں کافی ترقی پا چکا ہے۔ شہر بڑودہ کا ایک محلّہ جو بہت بڑا ہے دانڈیاں بازار۔ وہ محلّہ گویا کہ ڈاکٹر بازار ہے۔ گجرات بھر سے لوگ اپنے علاج ومعالجے کے لیے اس شہر کا رخ کرتے ہیں اور اپنا علاج کرواتے ہیں۔ طلبہ و طالبات دیگر شعبوں میں بھی خوب ترقی کر رہے ہیں۔

سماج: بڑودہ شہر کو گجرات والے سنسکاری نگری سے یاد کرتے ہیں۔ اس شہر کے لوگوں کے اخلاق وعادات رہن سہن صاف صفائی نظافت اب تک اپنی اسی حالت پر باقی ہے جس کی وجہ سے اہل گجرات اس شہر کو اخلاق والا شہر کہتے ہیں۔ اس دور میں بھی بڑودہ شہر کے لوگ بھولے بھالے ہیں۔ ہر کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں اور بھروسہ بھی کر لیتے ہیں۔ شاید بڑودہ کو اس لیے بڑودہ کہتے ہیں کہ اس کی مٹی میں برودت، ہے، ٹھنڈک ہے۔ اس لیے یہاں کے لوگوں کے اخلاق بھی بہت ٹھنڈے اور اچھے ہیں۔

سیاسی صورت حال میں چناؤ کے وقت ہی گرمی آتی ہے ورنہ عام طور پر اس شہر میں سیاست کا زور نہیں ہے۔ شاید اس شہر کے لوگ اس زمانے میں جب انگریز ہندوستان میں آیا تب بھی بڑودہ کے راجا نے انھیں اس شہر میں داخل ہونے نہیں دیا۔ عوام کو کسی بھی طرح کی مزاحمت اور سیاست کے مواقع میسر ہوتے ہی نہیں اسی وجہ سے یہ شہر عام طور پر سیاسی گہما گہمی سے دور ہی رہا ہے۔

اردو بولنے والے بہت ہی کم ہیں۔ بڑودہ شہر گجرات میں واقع ہے اور گجراتی کی وجہ سے گجرات کے بڑودہ میں اردو کا رواج بہت کم ہے پھر بھی 15-10 فیصد لوگ اردو بولتے ہیں۔

اردو کی موجودہ صورت حال: فی الحال صرف چھوٹے چھوٹے مکتبوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے وہ بھی صرف ابتدائی کتابیں۔ یونیورسٹی میں بھی معمولی مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ فی الحال شہر بڑودہ میں یہی صورت حال دوسرے اداروں کی ہے سوائے چند بڑے مدارس کے۔

الحمدللہ NCPUL کے سینٹر آنے کے بعد عوام میں یہاں تک کہ بچوں میں بھی اردو کی بیداری آئی ہے عوام میں ہندو مسلم ہر طرح کے لوگ دل چسپی اور بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔

عجیب بات تو یہ ہے دوبارہ ہمارے اس سینٹر کی حاضری کے بعد سے شہر بڑودہ کے لوگ اردو کی طرف مائل ہو رہے۔ امید ہے کہ آئندہ ترقی ہوگی۔ جس کا سہرا NCPUL کو ضرور جائے گا۔

بڑودہ کی مشہور و معروف تاریخی عمارتیں

لکشمی ولاس پیلیس: یہ عجیب وغریب محل مہاراجہ سیاجی راؤ 3 کے ذریعے 1878 سے 1890 کے درمیان میں بنایا گیا۔ اس محل کی ڈیزائن انگریز میجر چارلس مانٹ نے تیار کی تھی۔ جو ہندوستانی اور سارا سپائی کی بناوٹ کا بہترین نمونہ تھی۔ اس کی اندرونی سجاوٹ پرانے اسلحے، نقاشی کا کام، قیمتی سامان اور اٹالین تصویر 'فیصلی' کی خوبصورت مصوری کے ذریعے کی گئی تھی۔ مشرق کے بادشاہوں کے خاندان کے لوگ ابھی بھی یہاں رہتے ہیں۔ لیکن دربار ہول اور مہاراجہ سیاجی راؤ میوزیم سیاحوں

کے لیے کھلا ہے۔ مہاراجہ فتح مان سنگھ میوزیم جو محل کے بڑے میدان میں ہے۔

کرتی مندر: کرتی مندریا 'پرسیدی نومندر' مہاراجہ سیاجی راؤ3 نے 1936 کو اپنے 75ویں سال گرہ پر اپنے اجداد کی یاد میں بنوایا تھا۔ یہ بے مثال E شیپ کا ہندو بناوٹ کا بنا ہوا مندر 33 مٹر اونچا تکون شیپ کا مینار تانبے کا آفتاب، چاند، پرتھوی اور ہندوستان کا پرانہ نقشہ ہے۔ اس کی دیواریں (سجاوٹ) مہابھارت اور سنت میرابائی کی زندگی کے واقعات سے مزین ہیں۔ جو بنگال کے مشہور کلاکار شری نندلال بوس کی کلا ہے۔

اس کے علاوہ یہاں بڑودہ کے بادشاہوں اوران کے خاندانوں کی نشانیاں، لباس وغیرہ کی قیمتی تصویریں' پکچر گیلری' میں موجود ہیں۔ گیلری صبح 9 سے 12، اور دوپہر 2:30 سے 5:30 تک کھلی رہتی ہے، اتوار کو بندھ رہتی ہے۔

مہاراجہ سیاجی راؤیا MS یونیورسٹی: یہ مشہور یونیورسٹی مہاراجہ سیاجی راؤ نے 1840 میں بنوائی تھی اور شمالی ہندوستان میں ہائی ایجوکیشن کے لیے بہترین ادارہ ہے یہ ہریالی والی جگہ میں خوبصورت عمارتوں سے سجی ہوئی ہے۔ فیکلٹی آف آرٹ (پرانی بڑودہ کالج) کا عجیب وغریب مینار مشہور گول مینار کے ساتھ ملتا ہے اور بڑودہ کی ایک نشانی ہے۔ یہاں سے درس لینے والوں میں بیسویں صدی کے مشہور لوگوں کی تصویر شامل ہے۔

لہری پورہ دروازہ: بہترین کمان والا یہ دروازہ 1558 میں مشرق طرف سے کوٹ میں آنے کا دروازہ ہے۔ ابھی بھاتیگر گجراتی اور راجستھانی اشیا کی تجارت کا بازار ہے۔ نیائے مندر کا مکان قریب ہی ہے۔

پرتاپ ولاس پیلیس: ہندوستانی سیرونیک کی کلا سے ازسرنوتعمیر شدہ یہ محل راجہ خاندان کا رہائشی مکان ہے۔ یہ محل شری اسٹیونس نے بنایا ہے اوراس میں پرانے اسلحے اور نقشی کام کے نمونے ہیں۔ یہ عمارت ہندوستانی ریلوے اسٹاف کے لیے استعمال ہوتی ہے اور یہاں سیاحی ممنوع ہے۔ یہاں کا خاص دیکھنے کے لائق ریلوے ماڈل روم ہے۔ جس میں ریلوے کے طرح طرح کے کام کرنے کے طریقے اورٹریفک سگنل کی ہدایت دی جاتی ہے۔

گھڑیال یا راؤپورہ ٹاور: یہ ٹاور مہاراجہ سیاجی راؤ3 نے اسکول جانے کی غرض سے طلبہ وطالبات کے لیے بنوایا تھا۔

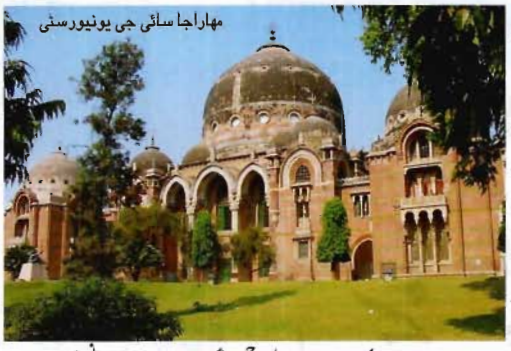

سورساگر تالاب: شہر کے قلب جیسا یہ سورساگر (تالاب) پہلے چندن تالاب کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اٹھارویں صدی میں اس تالاب کو دوبارہ بنایا گیا اور ابھی

سیاحوں اور رئیسوں کے لیے اچھی جگہ ہے۔ بڑودہ میونسپل کارپوریشن نے تالاب کے درمیان بھگوان شیومہادیو کی 120 فٹ کی مورتی رکھی ہے۔ سنیچر اوراتوار کے روزرات کو اس تالاب کے چاروں طرف روشنی کی جاتی ہے۔

سیاجی باغ: 45ہیکٹر میں پھیلا یہ باغ ریلوے اسٹیشن کے سامنے ہے اور وہ 1879 میں مہاراجہ سیاجی راؤ گائکواڑ3 نے اپنے نام پر بنوایا تھا۔ بڑودہ شہر کی دھڑکن جیسا یہ کماٹی باغ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ دو خوبصورت میوزیم، پکچر گیلری، صحت خانہ میوزیم، چڑیا گھر، سردار پٹیل پلینٹ اریم اور پھلوں کی گھڑیال جس کا گھراؤ 20 میٹر ہے۔ چھوٹی کھلونا ریل گاڑی راجہ خاندان کی طرف سے بچوں کو دیا ہوا قیمتی ہدیہ ہے اور بچوں کو لبھانے کا سامان ہے۔ خوبصورت سجائے ہوئے اس باغ میں فوارہ کاریگری اور پورے باغ کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہے۔

نیائے مندریا: 'نیائے نومندر' سورساگر کے قریب ہے۔ یہ بے مثال عمارت 1896 میں بنائی گئی اوراس میں مہاراجہ سیاجی راؤ3 کی رانی/مہارانی چیمن بائی کی مورتی ہے۔

کھانڈیے راؤ مارکیٹ: 07-1906 میں حضرت مہاراجہ سیاجی راؤ گائکواڑ3 نے یہ عالیشان عمارت بڑودہ میونسپلٹی کو اپنے 25برس پورے کرنے پر ہدیہ دی تھی۔

مکرپورہ پیلس: اٹالین آرٹ سے مزین یہ محل 1870 میں مہاراجہ کھنڈیراؤ کے ذریعے بنایا گیا تھا۔ پھر بعد میں مہاراجہ سیاجی راؤ گائکواڑ3 نے اس محل میں توسیع کی اور سجایا۔ اب Indian Air Force کی تعلیمی درسگاہ ہے۔ اس میں سیاحی اورفوٹوگرافی ممنوع ہے۔ گرمی کے وقت رہنے کا مکان اور ہرن پارک قریب میں ہے۔

کوٹھی کچہری: لال اینٹوں سے بنی ہوئی یہ عمارت گائکواڑ کی طرف سے ہدیہ ہے۔ یہاں معلومات کچہری اور ضلع کلیکٹر آفس بھی ہے۔

سردار پٹیل پلینٹیریم: سیاجی راؤ کے دروازے کے پاس یہ نئی ٹیکنالوجی والا پلینٹ اریم گلیکسی میں فلم کے ذریعے گجراتی، ہندی اور انگریزی میں سیاروں کی چال، سٹیلائٹ، تارے، دھوم کیتو وغیرہ کی معلومات دی جاتی ہے۔ نیا ڈیجیٹل دوربین بھی یہاں پر ہے۔ یہ پلینٹ اریم جمعرات کو بند رہتا ہے۔ اس کے قریب کھگول پارک ہے جس میں قدیم علم فلکیات کے آلات رکھے ہوئے ہیں۔

اجوا اور نمیٹا (22 اور 15 کلومیٹر): یہ جوائنٹ باغ میسور کے ورنداون باغ جیسا بنا ہوا ہے اور مشہور تفریحی جگہ ہے۔ اجواباغ اجواسرور (سیاجی سرور) کے کنارے بنا ہے اوراس میں سنیچر، اتوار اور پیر کی شام روشنی والے فوارے کے رقص کا نظارہ دیکھنے کوملتا ہے۔ نزدیک میں مسرت بخش باغ ہے۔

دھبوئی: گجراتی بناوٹ کا یہ قدرتی مقام کہا جاتا ہے۔ 13ویں صدی میں یہ قلعہ سولنکی ونش کے ذریعے بنایا گیا تھا۔ یہ ہندو لشکری بناوٹ کی نایاب عمارت ہے۔ چار دروازے کی بناوٹ بے مثال ہے۔ اس میں بھی ہرا دروازہ سب سے بہتر ہے۔ یہ قلعہ مسلمانوں، مراٹھوں اور برطانویوں نے باری باری فتح کیا تھا۔

بڑودہ میوزیم اور نقش گیلری: سیاجی راؤ میں آیا ہوا یہ میوزیم لندن کے وکٹوریا اور البرٹ میوزیم جیسا مہاراجہ سیاجی راؤ نے 1894 میں بنوایا تھا اور آج ایشیا کے بہترین میوزیم میں سے ہے۔ یہ میوزیم برطانوی نقاش روبرٹ چیشولم اور میجر آر این ریٹ کے ذریعے بنوائے ہوئے مکان میں ہے۔ یہاں کلا، قدرتی تاریخ، جیوگرفی اور نقاشی کا خوبصورت خزانہ ہے۔ اس محل کے الگ الگ روم، ہول اور گیلری ہیں جہاں کے مختلف وقت اور مذہب کی چیزیں رکھی ہوئی ہے۔ اس کے خاص کمروں میں گریک/ رومن روم، یوروپین روم، مہان ہندوستانی روم، جاپانی گیلری، اجپیت بیبولنین گیلری، تبتین گیلری، سیلون گیلری وغیرہ ہے۔ اس میوزیم میں خاص دیکھنے کے لائق 1972 میں مہاندی کے کنارے سے ملی ہوئی 22 میٹر لمبی بلوویل مچھلی کا ڈھانچہ اور اجپتین ممی ہے۔ اس میوزیم کی لائبریری میں 23ہزار کتابیں اورمیگزین ہیں۔

مہاراجہ فتح سنگھ میوزیم: عجب لکشمی ولاس پیلیس کے اندر آیا ہوا یہ میوزیم 1961 میں بنا۔ یہاں یوروپین مشہور نقاش رافیل ٹیٹین، موریلو اور ہندوستانی نقاش راجہ روی ورما کے نایاب نقش موجود ہیں۔ یہاں راجہ خاندان کی تصویریں، تانبہ اور آرس کی دستکاری اور دوسرے کاریگروں کی بے مثال کاریگری موجود ہے۔

Mufti Imran, Elahi Education Trust, Madrasa Farooque- Azam, Panigate, Vadodara (Gujrat)

سجان سنگھ

پنجابی کہانی

رضائی

چھٹی کے وقت جب اسکول ماسٹر، اسکول سے باہر نکلتا تو وہ لڑکوں کے ایک سیلاب میں ہوتا۔ اکثر اسے محسوس ہوتا کہ وہ لڑکوں کے سیلاب میں ایک رکاوٹ ہے۔ آج اس نے سوچا کہ اگر لڑکوں کا بہاؤ ہمیشہ اسی طرح نہ چلتا رہے تو اس کی زندگی بھی سوکھی ندی کے ریتیلے ساحلوں پر بیکار پڑی کشتی کی مانند بے سود ہو کر رہ جائے۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ کشتی ہی تو ہے۔ ہر سال طلبا کے گروہ امتحان نامی کناروں سے پار اترتے ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ طلبا پانی کا بہاؤ اور مسافر دونوں کیسے بن سکتے ہیں۔ آخر بہاؤ میں حرکت ہی تو تھی جس کے سہارے اس کی ٹوٹی پھوٹی کشتی زندگی تیر کر ایک کام کیے جا رہی تھی۔ ریاضی کا مشکل سے مشکل سوال منٹوں میں حل کر لینے والی اس کی ذہانت اس ان دیکھے پہاڑ کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

ماسٹر نے حسب معمول مختلف شناساؤں کے سلاموں کا جواب ہاتھ جوڑ کر دیا، بہتوں کی نمستے، ست سری اکال، جے رام جی کو جھک جھک کر مع سود کے واپس کیا۔ لیکن اندر ہی اندر کوئی تشویش اسے کھائے جا رہی تھی۔ وہ بازار میں تو مشینی انداز میں چلا جا رہا تھا، اچانک ایک بھاگتی ہوئی گائے اسے خارجی دنیا میں لے آئی۔ وہ حیران تھا کہ وہ کسی سے کیوں نہیں ٹکرایا یا وہ ایک طرف بنے گہرے نالے میں کیوں نہ جا گرا۔

موڑ پر گھومتے وقت اس نے کباڑی کی دوکان پر ایک رضائی لٹکتی دیکھی۔ دل میں کانپ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا، کہیں کسی نے اسے پرانی رضائی کی جانب للچائی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے نہ دیکھ لیا ہو... وہ تیزی سے موڑ پر مڑ گیا۔

ماسٹر پانچ بچوں کا باپ ہے۔ آج کل وہ انھیں پانچ غلطیاں کہتا ہے۔ پرانے جرمنی اور آج کل کے روس میں شاید اس کی بیوی کو زیادہ بچے پیدا کرنے کے لیے میڈل اور انعام ملتا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیسے حالات نامناسب کو مناسب اور مناسب کو نامناسب بنا دیتے ہیں۔ کاش کہ حالات ہر ایک کے بس میں ہوتے... اور حالات کی کنجی صرف دولت مندوں کے ہاتھ میں نہ ہوتی۔

تین مہاجر رشتے دار بھی اس کے پاس رہتے تھے۔ انھوں نے کبھی مشکل دنوں میں اس کی مدد بھی کی تھی۔ جب وہ خوشحال تھے۔ ماسٹر کی تنخواہ اب کل ملا کر ایک سو ساڑھے ستائیس روپے بنتی تھی۔ بڑی تنخواہ ہے... صرف وہ آٹا جو رعایتی قیمت پر دو روپے تیرہ آنے من تھا اب تیس روپے من بکتا ہے.. لیکن ماسٹر کی تنخواہ تو مناسب ہے۔ ایک سو ساڑھے ستائیس روپے پراویڈنٹ فنڈ کاٹ کر... لہٰذا وہ دشوار وقت میں انھیں مدد کیسے نہ دیتا... مقروض نہ کہلانے کی بھی تو اپنی قسمت ہوتی ہے نا...

راشن ڈپو پر کئی لوگ جمع تھے لیکن ماسٹر کو راشن ڈپو سے کچھ بھی نصیب نہ ہوتا تھا۔ ماسٹر صاحب کی مقررہ رقم سے ایک روپے زائد لینے والا بھی ڈپو سے سستا راشن لینے کا حقدار نہیں ہے اور ماسٹر صاحب تو پورے ڈھائی روپے زیادہ لے رہے تھے۔ اس کے ساتھ کرائے داروں میں ایک بینک کلرک بھی تھا۔ اسے ایک سو پندرہ روپے تنخواہ ملتی تھی۔ اس کی بیوی اور وہ... بس یہی اس کا خاندان تھا۔ اسے راشن ملتا تھا لیکن ماسٹر جی کا خاندان بھی تو تنخواہ کی طرح بڑا تھا۔ لہٰذا وہ کسی رعایت کے مستحق نہیں تھے۔

ماسٹر جی نے دیکھا کہ ان سے کئی گنا زیادہ حیثیت والے لوگ ڈپو سے راشن لے رہے ہیں لیکن وہ تو دوکاندار تھے، ملازمت پیشہ نہیں۔ بے چاری سرکار کے پاس بھی تو ان کے خود تحریر کردہ کھاتوں کے علاوہ ناپ تول کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا لیکن ماسٹر جھوٹ نہیں بول سکتا۔ ہر ایک اسے معزز کہتا ہے کئی لوگ طنزاً بھی... جیسے بداخلاق یا بے ایمان ہونا کوئی خوبی ہے۔ ماسٹر قانون کا

مکمل احترام کرنے والا تھا۔ تعلیم یافتہ انسان کو قانون شکنی کی سزا کیسے مل سکتی ہے۔ ماسٹر تو وطن پرست بھی ہے۔ اپنے یا اپنے آدمیوں کی وجہ سے وہ ملک وقوم کا نقصان برداشت نہیں کرسکتا۔

سب کچھ دیکھتا ہوا ماسٹر نکل گیا۔ اسے راستے میں ایک بار پھر رضائی کا خیال آیا۔ نئی رضائی کے لیے کم ازکم بیس روپے کی ضرورت ہے۔ حساب لگایا... ڈھائی من آٹا.. تیس دونی ساٹھ اور پندرہ پچہتر روپے، بناسپتی گھی پندرہ روپے، ایندھن پندرہ روپے اور بڑی رقم اسے بعد میں یاد آئی... کرایہ تیس روپے، چائے دودھ کے لیے تیرہ روپے اور مزید اسی طرح کل جوڑ کر ایک سو چھیاسی روپے، بجٹ میں لگ بھگ ساٹھ روپے کا گھاٹا۔ اسے بجٹ کو چیلنج کرنا چاہیے لیکن اس کے علم امور خانہ داری کے مطابق نئی کتابوں اور رسائل پر خرچ کی جارہی سات روپے کی رقم کے علاوہ کچھ بھی غیرضروری نہ ملا۔ وہ دل ہی دل میں اس خرچ پر لکیر کھینچنے لگا تھا کہ وہ خرچ اس کی خوراک پر ہونے والے خرچ سے بھی زیادہ ضروری ہے... آخرکار اس نے سوچا کہ ہیڈ ماسٹر کی اجازت سے ایک ٹیوشن کروں گا۔ آمدنی میں تیس روپے کا اضافہ ہوجائے گا۔ تیس کا خرچ جیسے تیسے کم کروں گا لیکن رضائی کے لیے بیس روپے کہاں سے آئیں گے؟ رضائی موسم سرما کے لیے بہت ضروری ہے۔ مہمانوں کو الگ الگ چارپائی اور ایک بستر دینا بھی ضروری تھا۔ تین لڑکیاں ایک ساتھ سوتی تھیں۔ ایک ہی چارپائی اور ایک ہی رضائی میں سونے سے قامت کم رہ جائے گی۔ لڑکیوں کے کوتاہ قامت ہونے سے... انھیں آج کی دنیا میں کوئی پہلے ہی نہیں پوچھتا۔ کل اس نے اپنی اہلیہ سے ان میں بڑی کو الگ سلانے کے لیے کہا تھا۔

''تھوڑی چارپائیاں ہیں کیلاش؟ پھر تم ان سے الگ الگ لیٹنے کے لیے کیوں نہیں کہتیں؟''

کیلاش نے نرمی سے جواب دیا تھا ''چارپائی تو ایک اور ہے لیکن رضائی نہیں ہے۔ ابھی بلو بھی میرے ساتھ سوتا ہے۔''

بیس روپے کی رضائی، بجٹ میں پہلے ہی گھاٹا ہے، تیس کا ٹیوشن، تیس خرچ میں کم کرنے ہی پڑیں گے۔ لیکن رضائی کے لیے مزید بیس اور کہاں سے آئیں گے؟ اسے یاد آیا کہ اس نے پرسوں ہی اپنی کتابیں ردی میں بیچ کر سات روپے بارہ آنے حاصل کیے تھے۔ لیکن رضائی کے لیے بیس روپے... اوہ! کباڑی سے پرانی رضائی! ہاں ٹھیک ہے کل دریافت کریں گے۔

ماسٹر پانچ بچوں کا باپ ہے۔ آج کل وہ انہیں پانچ غلطیاں کھتا ہے۔ پرانے جرمنی اور آج کل کے روس میں شاید اس کی بیوی کو زیادہ بچے پیدا کرنے کے لیے میڈل اور انعام ملتا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیسے حالات نامناسب کو مناسب اور مناسب کو نامناسب بنا دیتے ہیں۔ کاش کہ حالات ہر ایک کے بس میں ہوتے... اور حالات کی کنجی صرف دولت مندوں کے ہاتھ میں نہ ہوتی۔

کئی دن وہ صبح صبح موقعے کی تلاش میں رہا۔ دن میں وہ کباڑی سے دوبارہ پوچھنے کی ہمت نہیں کرسکا۔ ایک دن رات کے وقت بازار بند تھا۔ بے چارہ معمار قوم یا قوم کا استاد مایوس لوٹ آیا... بنانے والا خود بنائے جانے والوں کے ہاتھوں کیا بن رہا تھا؟

اس نے دوبارہ سوچا کہ آخر صبح کے وقت ہی داؤں لگانے سے کام بنے گا۔ نگوڑی رضائی بھی ایسی تھی کہ کوئی اسے خریدتا ہی نہیں تھا۔ کسی کے سامنے خرید کر بے عزت ہونا تھا۔ اگر اس کا نہیں تو اساتذہ کرام کا تو ایک مقام ہے۔ لیکن قوم کا بے چارہ استاد کیا کررہا تھا؟ وہ کسی سے کیا چھپا رہا تھا؟ اس نے دوبارہ غور کیا... وہ عزت پر ایک حرف نہ آنے دے گا۔

اتوار تھا... چھٹی کا دن۔ وہ اپنے بڑے لڑکے کو لے کر دوکان پر گیا۔ رضائی حسب معمول وہیں ٹنگی تھی۔ وہ ایک ہی چھلانگ میں دوکان کے اندر داخل ہوگیا۔ سات روپے میں سودا پٹ گیا۔ وہ روپے دے کر فوراً لوٹ آیا۔ دس قدم ہی چلا ہوگا کہ کسی نے آواز دی... ''مردوں کی رضائی خرید لی ہے!''

استاد گھوم کر دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ کہنے والا ایک درزی تھا۔ قریب ہی استاد کا ایک شاگرد تھا، جسے آج سے اس کے گھر پڑھنے آنا تھا۔ اس نے بھی ماسٹر کے پاس آکر کہا ''ماسٹر صاحب، یہ تو مردوں کی رضائیاں بیچتا ہے۔''

ماسٹر سچ، جھوٹ کی طرح بولا ''ہاں بیٹا، لیکن کسی ضرورت مند کی ضرورت تو پوری ہوجائے گی!''

کہنے کا انداز کچھ ایسا تھا جس سے گمان ہوسکتا تھا کہ اس نے رضائی کسی دوسرے کے لیے خریدی ہے۔ اگر یہ جھوٹ بھی تھا تو دھرم راج یدھشٹر کے بولے ہوئے جھوٹ سے برا نہ تھا۔

دن بھر رضائی دھوپ میں پڑی رہی۔ شام کے وقت رضائی کمرے میں لائی گئی۔ چراغ جلنے کے بعد وہی لڑکا پڑھنے آگیا۔ اس نے رضائی پڑی ہوئی دیکھ کر آداب عرض کرنے کے بعد پوچھا ''ماسٹر صاحب یہ وہی رضائی ہے نا؟''

ماسٹر صاحب میں دوبارہ جھوٹ بولنے کی ہمت نہیں تھی۔ انھوں نے کہا ''وہی ہے بیٹا، لیکن آج میں تمھیں پڑھا نہ سکوں گا۔ میری طبیعت خراب ہے، تم کل آجانا۔'' واقعی اس کی طبیعت خراب تھی۔ لڑکا واپس چلا گیا۔ ماسٹر نے باورچی خانے میں مصروف اہلیہ سے کہا ''کیلاش نئی رضائی مجھے دے دو۔ میری پہلے والی رضائی لڑکیوں کو دے دینا، ہاں گومتی کو الگ سلانا۔''

''کیا آپ کھانا نہ کھائیں گے؟'' کیلاش نے رضائی پیروں پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''نہیں'' ماسٹر نے کہا اور مردوں سے اتاری ہوئی رضائی اپنے اوپر کھینچ لی۔ کتنی دیر وہ سوچتا رہا کہ کون مردوں سے رضائی اتار لیتا ہے اور کون زندوں سے؟ وہ بے چین تھا۔

■

ماخذ: ماہنامہ ادب لطیف، بحوالہ تراجم کہانیاں 1998، لاہور

شمس الاسلام فاروقی

اپنے جگر کی قدر کیجیے

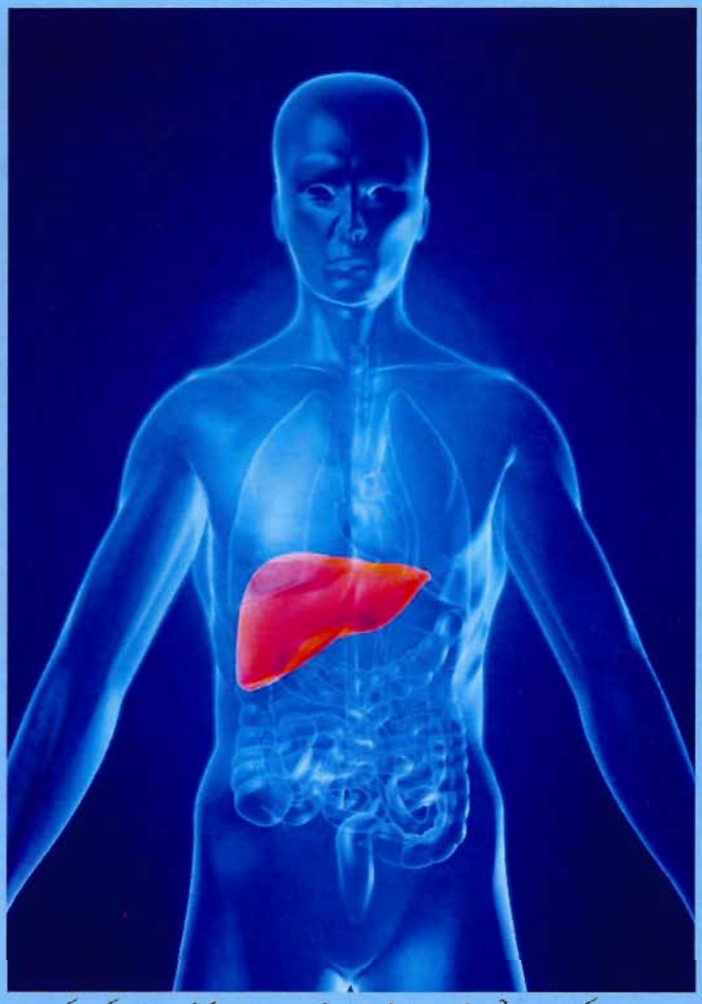

ہمارے کئی اعضا جو جسم کے اندر پوشیدہ ہیں اُن میں جگر ایک اہم ترین عضو ہے۔ دیگر اعضا جیسے دل، پھیپھڑوں اور گردوں کی نسبت جگر زیادہ بڑا اور وزنی عضو ہے جس کا مجموعی وزن تقریباً 1.36 کلوگرام ہوتا ہے۔ تکونی شکل کا یہ عضو شکمی جھلی کے عین نیچے واقع ہے۔ جگر کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک میگانیٹ اسے دائیں بڑے گوشے اور بائیں چھوٹے گوشے میں منقسم کرتا ہے۔ ہمارے جسم میں صرف جگر ہی ایک ایسا عضو ہے جس کی تخلیق ناممکن ہے۔ اگر کسی حادثے یا سرجری وغیرہ کے دوران جگر کا دو تہائی حصہ کاٹنا بھی پڑے تو باقی ایک تہائی محض چار ہفتوں میں خود کو بڑھا کر اصل جگر کے برابر کر لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

دیگر اہم اعضا میں جہاں ہمارا قلب دوران خون کے لیے، پھیپھڑے خون میں آکسیجن کو شامل کرنے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کو نکالنے اور گردے فاضل مادّوں کو چھان کر پیشاب کے ذریعے جسم کے باہر نکالنے کے لیے ذمے دار ہیں وہیں جگر کم و بیش پانچ سو کاموں کو سرانجام دیتا ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ انسانی زندگی اس کے جگر پر منحصر ہے۔ اگر جگر کا فعل درست ہے تو جسم بھی تندرست و توانا ہے اور اگر نہیں تو پھر وہ کسی نہ کسی بیماری کا شکار ضرور ہے۔

ہمارے جسم کے خون کا دس سے پندرہ فیصدی ہمیشہ ہی ہمارے جگر میں ذخیرہ رہتا ہے۔ اگر کسی حادثے کے دوران جسم سے زیادہ خون بہہ جائے یا آپ کسی مریض کو خون کا عطیہ دیں تو جگر کا ذخیرہ شدہ خون فوراً ہی نکل کر آپ کی شریانوں میں دوڑنے لگتا ہے اور ہمیں ضائع ہونے والے خون کی کمی کا احساس نہیں ہو پاتا۔

دیکھا جائے تو ہم جو کچھ بھی کھاتے ہیں یا جو کچھ ہماری سانس یا جلد کے ذریعے ہمارے جسم میں پہنچتا ہے ہمارا جگر اس پر کڑی نظر رکھتا ہے اور اس میں جو کچھ مضر اشیا شامل ہوتی ہیں انھیں چھان کر الگ کر دیتا ہے تاکہ جسم ان کے مضر اثرات سے محفوظ رہے۔ اسی طرح ہمارے جگر میں کئی اہم اشیا کی نہ صرف تیاری عمل میں آتی ہے بلکہ وہ اس میں ذخیرہ بھی کی جاتی ہیں اور جب کبھی جسم کو ان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جگر فوراً ہی انھیں خون میں شامل کر دیتا ہے۔ اس لیے جگر کے مختلف النوع کاموں کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہمارا جگر جہاں ایک طرف خون کو چھان کر صاف کرنے والا پلانٹ ہے وہیں دوسری طرف مختلف کیمیائی اشیا تیار کرنے والی فیکٹری اور ان کے لیے ایک ذخیرہ بھی۔

جگر میں خون پہنچانے کے دو ذرائع ہیں دل اور ہضمی نظام۔ خون کا بیس سے پچیس فیصدی حصہ براہ راست دل سے جگر میں آتا ہے جو آکسیجن سے بھرپور ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ جگر کے سیلس کو خاطر خواہ توانائی اور قوت دیتا ہے تاکہ وہ صحیح طریقے سے اپنے کاموں کو انجام دے سکیں۔ زیادہ تر یعنی 75 فیصدی خون ہضمی نظام سے آتا ہے جس میں متعدد تغذیات شامل ہوتے ہیں۔ خون انھیں معدے، آنتوں، تلی، گال بلیڈر اور پینکری آز سے حاصل کرتا ہے۔ اس خون کا چھان کر صاف کرنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ اس میں بیکٹر یا اور مردہ خون کے سیلس شامل ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ جگر اس خون میں ضروری مقدار میں گلوکوز، پروٹینس اور چربیلے اجزا بھی شامل کر دیتا ہے۔ یہ قوت بخش خون پہلے دل اور پھر تمام جسم میں پہنچتا ہے

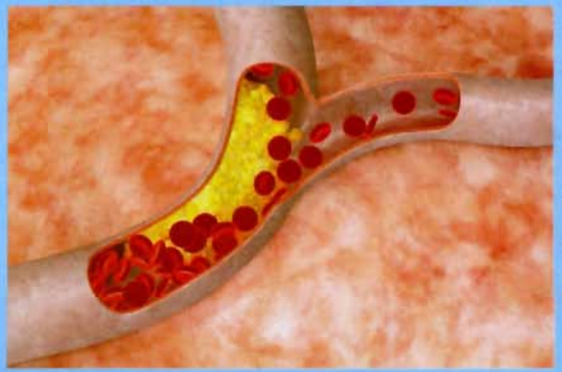

تاکہ اسے ضروری توانائی فراہم کر سکے۔ جگر میں آنے والا خون اس کے سیلس کے درمیان نالیوں سے گزرتا ہے اور ان میں موجود کھفوں میں بھر جاتا ہے جنھیں ٹیکنیکی زبان میں سائنوسائیڈس (sinusoids) کہتے ہیں۔ یہاں مخصوص قسم کے شکار خود سیلس انھیں روک کر ان کا صفایا کر ڈالتے ہیں بہت سے بیکٹیریا اور دوسری فاضل اشیا جن کی جسم کو ضرورت نہیں ہوتی پت نامی ہضمی رس کے ذریعے دوبارہ آنتوں میں پہنچادی جاتی ہیں جہاں سے ان کا اخراج عمل میں آجاتا ہے۔ اسی طرح جگر دوسری فاضل رقیق اشیا کو خون کے ساتھ گردوں میں بھیج دیتا ہے اور پھر وہ وہاں سے پیشاب کے ذریعے جسم سے باہر نکل جاتی ہیں۔

پت یا بائل (Bile) زرد ہرے رنگ کا ایک گاڑھا ہضمی رس ہے جس کی تیاری جگر کے ذریعے عمل میں آتی ہے۔ جگر اسے براہِ راست یا پھر گال بلیڈر کے ذریعے آنتوں میں بھیجتا ہے۔ یہ رس بالخصوص چربیلی اشیا کو ہضم کرنے کے لیے ذمے دار ہے۔ یہ گال بلیڈر میں ذخیرہ کیا جاتا ہے اور صرف اسی وقت خارج ہوتا ہے جب اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ جگر خون کے پروٹینس، کولسٹرول اور انجماد خون کے ذمہ دار عناصر کی تیاری کے لیے بھی ذمے دار ہے۔ پروٹینس کی شمولیت خون کو صحت مند بناتی ہے۔ خون کو جمانے والے عناصر بے حد اہم ہیں جو اگر نہ ہوں تو حادثات یا سرجری وغیرہ کے دوران جسم سے بہنے والے خون کا رکنا ہی ممکن نہ ہو۔ کولسٹرول کی زیادتی گو نقصان دہ ہوتی ہے تاہم ہمارے جسم کے لیے اس کی کچھ نہ کچھ مقدار ضروری بھی ہے۔

ہمارا جگر ہمارے جسم کی بہت سی ضروری اشیا کے لیے ایک ذخیرہ گاہ کا کام بھی انجام دیتا ہے۔ ہضمی نظام سے آنے والے خون کے ہمراہ جو بھی زائد شکر جگر میں پہنچتی ہے وہ اُسے پہلے گلوکوز اور پھر گلائیکوجن میں تبدیل کر کے اپنے اندر ذخیرہ کر لیتا ہے۔ جب کبھی ہمارے خون میں شکر کی کمی ہوتی ہے تو جگر فوراً ہی اپنے اندر موجود گلائیکوجن کو گلوکوز میں تبدیل کر کے اُسے خون میں شامل کر دیتا ہے۔ انسانی دماغ کے لیے بھی گلوکوز انتہائی ضروری شے ہے جس کے بغیر اس کے سیلس کا زندہ رہنا ممکن نہیں۔ ہمارا جگر ہی اُسے یہ تغذیہ لگاتار فراہم کرنے کے لیے ذمے دار ہے۔ جگر میں پروٹینس بھی بہ شکل امینو

ایسڈس ذخیرہ ہوتے ہیں تاکہ ضرورت کے لحاظ سے خون میں شامل کیے جاتے رہیں۔ اس کے علاوہ وٹامنس اور منرلس مثلاً وٹامن اے بی ڈی ای بی-12 اور آئرن کے

جگر میں خون پہنچانے کے دو ذرائع ہیں دل اور ہضمی نظام۔ خون کا بیس سے پچیس فیصدی حصہ براہ راست دل سے جگر میں آتا ہے جو آکسیجن سے بھرپور ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ جگر کے سیلس کو خاطر خواہ توانائی اور قوت دیتا ہے تاکہ وہ صحیح طریقے سے اپنے کاموں کو انجام دے سکیں۔ زیادہ تر یعنی 75 فیصدی خون ہضمی نظام سے آتا ہے جس میں متعدد تغذیات شامل ہوتے ہیں۔ خون انہیں معدے، آنتوں، تلی، گال بلیڈر اور پینکری آز سے حاصل کرتا ہے۔ اس خون کا چھان کر صاف کرنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ اس میں بیکٹیریا اور مردہ خون کے سیلس شامل ہوتے ہیں۔

لیے بھی جگر ایک ذخیرہ گاہ ہے۔ وٹامنس بالخصوص بی گروپ کا تو اتنا ذخیرہ جگر میں محفوظ رہتا ہے کہ اگر آپ کو چار سال تک یہ وٹامنس فراہم نہ ہوں تب بھی آپ کی ضرورت پوری ہوتی رہے۔

اپنے جسم کے اس قدر اہم اور قیمتی عضو کی جتنی بھی قدر اور حفاظت آپ کر سکیں کم ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر کوشش کریں کہ:

1. کھانا ہمیشہ پابندی اوقات کے ساتھ کھائیں۔
2. ہمیشہ ایسا کھانا کھائیں جو زود ہضم ہو۔
3. پابندی کے ساتھ زیادہ پانی پئیں۔
4. ہری سبزیوں کا استعمال زیادہ کریں اور ساتھ ہی پھلوں کا بھی روزانہ استعمال کرتے رہیں۔ ایک صحت مند جگر کے لیے اپنی غذا میں چقندر، گاجر، شلجم، گوبھی، پالک، میتھی، لہسن، پیاز، سنترے، لیمو، سیب، اخروٹ اور ہلدی کو ضرور شامل کریں۔
5. گنے کے موسم میں اس کے رس کا استعمال ضرور کریں۔ اگر ناریل کا پانی استعمال کر سکیں تو وہ جگر کے لیے بہت مفید ہے۔
6. پابندی کے ساتھ ورزش ضرور کریں۔

جگر کے فعل کو درست رکھنے کے لیے حسب ذیل باتوں کی احتیاط بھی ضروری ہے:

1. تیز مسالوں اور تیل سے پرہیز کریں۔
2. نشیلی اشیا جیسے شراب، سگرٹ اور تمباکو سے اجتناب کریں۔
3. ایک وقت میں اپنے پیٹ کو بہت زیادہ نہ بھریں۔
4. بے وقت یا ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتے رہنے کی عادت کو ترک کریں۔
5. جنک فوڈ بالکل نہ کھائیں۔
6. پیسٹی سائیڈس، زہریلی ہوا، دیگر کیمیا، پینٹس کی بو، اور آلودہ ہوا میں سانس لینے سے بچیں۔

ایک بات ہمیشہ ذہن میں رکھیں کہ جگر آپ کا ایک ایسا عضو ہے جو انتہائی کارآمد ہونے کے ساتھ ہی بے حد خاموش طبع واقع ہوا ہے۔ وہ تکلیف میں ہونے کے باوجود آپ پر اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کرتا مگر جب کرتا ہے تو بات آپ کے ہاتھوں سے نکل چکی ہوتی ہے اور دوا سے بھی زیادہ دعا کا وقت آجاتا ہے۔ اس لیے خیال رکھیے کہ ایسا وقت آنے سے پہلے ہی آپ اس کی صحت اور تندرستی کی طرف پوری توجہ دیں۔

S I Farooqui, 90-B Ahata Talib, Noor Nagar, Jamia Nagar, New Delhi - 110025

ہندوستانی سنیما اور امراض

واثق الخیر

سنیما دنیا کا واحد ذریعہ ہے جو دلوں کو جوڑنے، محبت واخوت اور اتحاد وقومی یکجہتی ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی یکجہتی یعنی دنیا کا صحیح تصور پیش کرتا ہے۔ خصوصاً ہندوستان جہاں مختلف کلچر اور رنگا رنگ تمدن ہے وہاں سنیما کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ دور حاضر میں سنیما خصوصی طور پر نوجوانوں کی تفریح کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

فلم صرف تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک دنیا ہے جو زندگی کے ہر ایک شعبے کو چھوتا ہی نہیں بلکہ متاثر بھی کرتا ہے۔ اس کی پیش کش چاہے فرضی ہو لیکن مسائل اپنے وقت کے ہی پیش کرتا ہے۔ سنیما نے ہمیشہ سماج کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔

ہندوستان میں فلم دکھانے اور بنانے کا رواج انیسویں صدی سے شروع ہوگیا تھا۔ ہیرالال سین نے 1898 میں اسٹیج ڈراموں کو فلمانا شروع کردیا تھا۔ لیکن باقاعدہ فلم بنانے کا کام اس وقت شروع ہوا جب دادا صاحب پھالکے نے 1913 میں 'راجہ ہریش چندر' نامی پہلی خاموش فلم پردۂ سیمیں پر پیش کی اور خان بہادر آدیشر ایرانی نے 'عالم آرا' سے فلموں کو قوت گویائی عطا کی۔

شروع سے اب تک ہندوستانی فلموں کے موضوع اور تکنیک میں بہت زیادہ تبدیلی آئی ہے اور آج ہندوستانی فلمیں تکنیکی لحاظ سے ہالی ووڈ میں بننے والی فلموں کے مدمقابل کھڑی نظر آرہی ہیں۔ جہاں تک فلم کے ذریعے معاشرتی ضرورتوں کو پردے پر لانے کی بات ہے تو ہر دور میں کسی نہ کسی طور پر معاشرتی ضرورتوں کو مثبت انداز میں عوام کے سامنے پیش کیا جاتا رہا ہے اور فلموں میں معاشرے کو بدلنے کی مہم بھی دکھائی دیتی ہے۔ اپنے ابتدائی دور میں ہندوستانی سنیما پر مذہب اور تاریخ کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے لیکن کچھ وقت کے بعد ہی ان میں ہندوستانی معاشرے کے مسائل ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

ہندوستانی سنیما میں مرض کو اکثر ثانوی طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ شروع سے لے کر اب تک بہت سی فلمیں بنی ہیں جن میں مرض کو صرف کہانی میں ٹریجڈی ڈالنے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے اس سے سنیما کی کہانیوں کو جذباتی موڑ مل جاتے ہیں۔ مرض کو موضوع بنا کر اور لوگوں کو اس کے بارے میں بیدار کرنے کے ارادے سے کم ہی فلمیں بنتی ہیں، لیکن اس کے باوجود ہندوستانی سنیما ان موضوعات کو پردے سے باہر لاکر ان کے بارے میں عام لوگوں کی معلومات میں اضافہ کررہا ہے جو اکثر سماج میں پوشیدہ ہوتی ہیں اور سماج میں ایسے مرض میں مبتلا لوگوں اور اس کے گھر والوں کو عزت وآبرو کے ساتھ جینے میں مدد فراہم کررہی ہے۔ مرض کے موضوع پر مبنی فلموں کے بارے میں سوچیں تو ذہن میں 'آہ'، 'دل ایک مندر' اور 'آنند' سے لے کر 'برفی' تک بہت ساری نہ بھولنے والی فلمیں نظر کے سامنے آجاتی ہیں۔

امراض پر مبنی ان تمام فلموں کی بنیاد 'آنند' کو کہا جاسکتا ہے۔ اس کا کریڈٹ رشی کیش مکھرجی کو جاتا ہے۔ جس وقت 'آنند' ریلیز ہوئی اس وقت معاشرے میں کینسر ایک خوفناک اور موت کی طرف اشارہ دینے والی بیماری کے طور پر مشہور تھا۔ سماج میں اس سے متعلق خوف برپا تھا۔ ایسے ماحول میں زندگی کے بارے میں اپنا ایک الگ نظریہ لے کر آئے 'آنند' کو ناظرین کے سامنے لانے کے لیے داد دینی پڑے گی۔ اس فلم کا ایک مکالمہ انسان کو خوف اور جہالت سے نکال کر زندگی کے ایک ایک لمحے کو اچھی طرح جینے کی ترغیب دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو: ''بابو موشائے زندگی اور موت اوپر والے کے ہاتھ میں ہے جسے نہ آپ تبدیل کرسکتے ہیں نہ میں، ہم سب تو تھیٹر کی کٹھ پتلی ہیں، جس کی ڈور اس اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔ کب، کون، کہاں اٹھے گا یہ کوئی نہیں جانتا۔''

بات شروع کرتے ہیں 1953 میں بنی فلم 'آہ' سے اس وقت ٹی بی ایک لاعلاج مرض تھا۔ فلم کا ہیرو راج کپور ٹی بی کا شکار ہوتا ہے ہیروئن نرگس تمام سماجی رکاوٹوں کے باوجود ہیرو کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اسی طرح

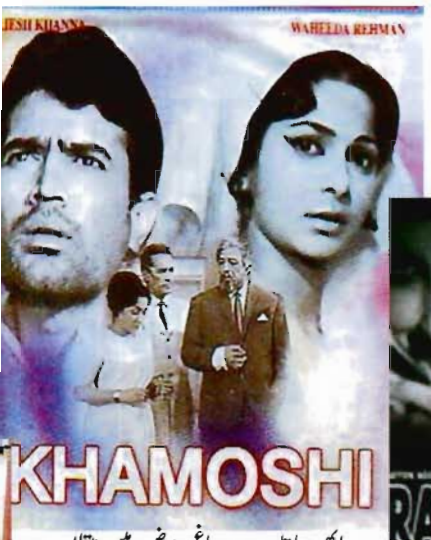

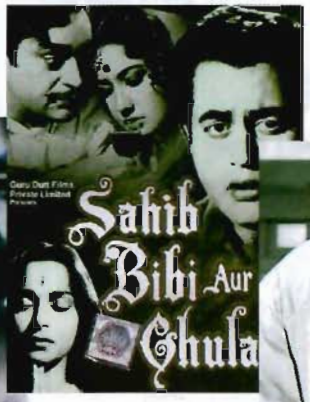

بمل رائے نے 1963 کی فلم 'بندنی' میں تپ دق کے مرض کی عکاسی کی ہے۔تپ دق کے مریض کی دیکھ بھال کے لیے کوئی بھی آگے نہیں ہوتا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب اس طرح کے مرض کو سماج میں چھوت سے پھیلنے والی بیماری سمجھا جاتا تھا۔ اسیت سین نے 1970 کی فلم 'سفر' میں کینسر جیسے مہلک مرض کو پردۂ سیمیں پر دکھایا۔رشی کیش مکھرجی نے 1975 کی اپنی فلم 'ملی' میں فلم کی ہیروئن کو ہیموفیلیا (Hemophilia) نام کے مرض میں مبتلا دکھایا ہے۔ابتدائی دنوں کی فلموں میں کینسر اور ٹی بی جیسے مہلک امراض کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔

ہندوستانی سنیما نے دماغی امراض کو لے کر بہت ساری فلمیں بنائی ہیں۔ ہیرو یا ہیروئن کا ناکام محبت سے دماغی توازن بگڑ جانا اور دوسری طرف دماغی ہاسپٹل میں رہنے والے لوگوں کو اور وہاں کام کرنے والے کارکن کو ہنسی مذاق اور طربیہ کرداروں میں دکھایا گیا ہے۔ اس نظریے پر بنی فلموں کی ایک مثال 1969 میں اسیت سین کی ہدایت میں بنی فلم 'خاموشی' ہے۔جس میں ایک طرف راجیش کھنہ اور دھرمیندر کے کردار تھے جو محبت میں ناکام ہونے سے دماغی مرض میں مبتلا دکھائے گئے ہیں۔ دوسری طرف دماغی ہاسپٹل میں کام کرنے والی نرس رادھا کے کردار میں وحیدہ رحمٰن جوان کا علاج کرنے کے لیے ان سے محبت کا ناٹک کرتی ہے۔اس فلم میں جہاں ہیروئن کے دماغی مرض کو جذباتی طور پر دکھایا گیا ہے وہیں دماغی امراض کے ہاسپٹل میں زیرعلاج دوسرے مریضوں کو کامیڈی کردار میں دکھایا گیا ہے۔

ناکام محبت سے ہونے والے دماغی مرض کا علاج کرنے کے لیے کسی کی محبت درکار ہوتی ہے۔ 1970 میں آئی فلم 'کھلونا' میں ناکام محبت سے دماغی توازن کھوبیٹھے سنجیو کمار کو ٹھیک کرنے کے لیے ناچنے گانے والی کا استعمال کیا جاتا ہے اور 2005 میں پریہ درشن کی فلم 'کیوں کہ' میں محبوبہ کی موت کی وجہ سے سلمان خان کا دماغی توازن بگڑ جاتا ہے۔ جسے بہتر کرنے میں کرینہ کپور دل و جان سے کوشش کرتی ہیں۔ عظیم کامیڈین محمود کی فلم 'کنوارا باپ' اگرچہ چارلی چپلن کی فلم 'دی کِڈ' کی نقل تھی لیکن اس میں محمود نے پولیو کے مرض کو اصلی کہانی سے جوڑ کر جو ہندوستانی روپ دیا وہ نہ صرف قابل ستائش تھا بلکہ بے حد متاثر کن تھا اور پولیو کے مرض پر شاید یہ پہلی ہندوستانی فلم تھی۔

فلم صرف تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک دنیا ہے جو زندگی کے ہر ایک شعبے کو چھوتا ہی نہیں بلکہ متاثر بھی کرتا ہے۔ اس کی پیش کش چاہے فرضی ہو لیکن مسائل اپنے وقت کے ہی پیش کرتا ہے۔ سنیما نے ہمیشہ سماج کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔

محبت میں ناکام ہونے کے علاوہ کئی فلموں میں گہرے صدمے یا چوٹ پہنچنے سے بھی دماغی توازن بگڑ جاتا ہے۔ جیسے 1978 کی فلم 'گھر' ایک ایسی نئی نویلی دلہن کی کہانی ہے جو آبروریزی کی وجہ سے ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہے اور وہ اپنے شوہر سے بھی ڈرتی ہے۔ اس فلم میں دکھایا گیا تھا کہ اگر ہمدردی اور سہارا ملے تو دماغی مرض سے باہر نکلنا ممکن ہے۔ اپرنا سین کی نیشنل ایوارڈ یافتہ فلم '15 پارک اوینیو' میں ذہنی مرض سے لڑرہی ایک لڑکی کی کہانی پیش کی گئی۔ اس فلم میں ہیروئن کونکنا سین شیزوفرینیا (Schizophrenia) میں مبتلا ہے جو آبروریزی کی وجہ سے ابھر جاتا ہے۔ دماغی مرض میں مبتلا مریض کے تعلق سے سماج میں غلط تصور کو بہت متاثر کن طریقے سے دکھایا گیا ہے۔ شیزوفرینیا (Schizophrenia) کے مریض کو کئی بار ایک جسم میں دو الگ الگ کرداروں کی شکل میں بھی دکھایا گیا ہے۔ جیسے 1967 کی فلم 'رات اور دن' بچپن میں گھر کی گھٹن اور اپنے من میں چھپی خواہشوں کو نہ ظاہر کر پانے کے نتیجے کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ 2004 کی فلم 'مدہوش' میں ہیروئن کو شیزوفرینیا (Schizophrenia) سے متاثر دکھایا گیا ہے اور رام گوپال ورما نے اپنی فلم 'کون' میں بھی ہیروئن کو شیزوفرینیا کی زد میں دکھایا ہے۔ شیزوفرینیا جیسے مرض پر وہ لمحے، کارپوریٹ اپارٹمنٹ جیسی فلمیں بھی بنی ہیں۔

بار بار ایک ہی بات کو سوچنا یا کسی ایک خیال کو نہ بھول پانے کو obsession کہتے ہیں۔ اس دماغی مرض کو مختلف فلموں میں پیش کیا گیا ہے۔ 1962 میں آئی گرودت کی فلم 'صاحب بیوی اور غلام' میں حویلی کی بڑی بہو کو دن بھر بار بار ہاتھ دھوتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اسی طرح کا مرض 1993 کی فلم 'ڈر' میں شاہ رخ خان کو تھا جو ایک لڑکی سے obsessed ہو جاتے ہیں۔

دماغی توازن کھو کر خونی بن جانا جس میں ملٹی پرسنالٹی اور obsensession کی بیماریاں دونوں ہی ہوتی ہیں کئی فلموں میں دکھایا گیا ہے۔ جیسے 2011 کی فلم ''مرڈر 2'' جس میں ایک آدمی عورت کے کپڑے پہن کر جسم فروش لڑکیوں کا قتل کرتا ہے۔ کچھ سال قبل آئی ستیش کوشک کی فلم 'تیرے نام' کا ہیرو بھی دماغی مریض تھا۔ اس کے ساتھ ہونے والے غیر انسانی سلوک کی بہترین تصویرکشی کی گئی ہے۔

ہندوستانی سنیما نے ذہنی نشو ونما کی کمی کو بھی موضوع بنایا ہے۔ راکیش روشن کی فلم 'کوئی مل گیا' کے روہت کو دماغی مریض دکھایا گیا تھا۔ اس طرح کے مرض کو آٹزم (Autism) کہتے ہیں۔ دماغ سے کمزور روہت کو استاد

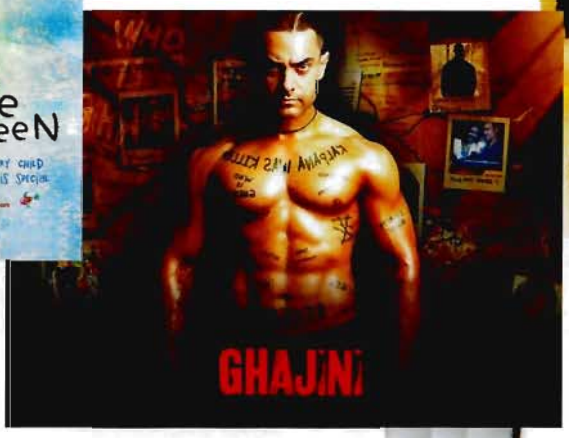

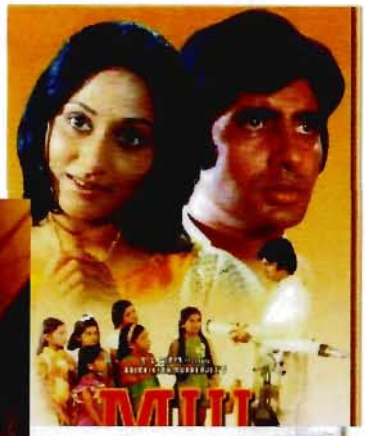

مریض اپنی داخلی دنیا میں رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ انوراگ بسو کی 2012 کی فلم 'برفی' میں پرینکا چوپڑہ کو بھی آٹزم (Autism) کے مریض کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

فلم 'پا' (2009) میں امیتابھ بچن نے پروجیریا (Projeria) مرض سے لڑ رہے بچے کا کردار ادا کیا ہے۔ پروجیریا میں بچپن سے ہی جسم میں بڑھاپے کی علامت نظر آنے لگتی ہیں۔ جسم کی عمر عام آدمی کے مقابلے بہت زیادہ تیزی سے بڑھتی ہے۔

دور حاضر میں ایڈس سماج میں ایک وبا کی طرح پھیلتا جارہا ہے۔ اس طرح کے مریض کے خلاف نفرت بڑھتی جارہی ہے اور اس سے میل جول بھی رکھنا پسند نہیں کیا جارہا ہے، ایسے وقت میں ایڈس (Aids) پر مبنی فلم 'پھر ملیں گے' اور 'مائی برادر نکھل' نے جس طرح ایڈس کے بارے میں ناظرین میں بیدا کی ہے وہ قابل ستائش ہے۔

ماضی کے مقابلے آج میڈیکل بلیٹن مختلف انداز میں آنے لگے ہیں۔ یعنی ہندوستانی سنیما میں امراض سے متعلق بڑی تبدیلی آئی ہے۔ گزشتہ کچھ عرصے میں ایسے امراض کو دھیان میں رکھ کر کئی فلمیں بنی ہیں جن کا زیادہ تر ناظرین نے نام بھی نہیں سنا تھا۔ ان امراض کے بارے میں فلموں کے ذریعے مزید معلومات دیے جانے پر فلموں کے تئیں لوگوں میں اعتماد بڑھا ہے۔ ہندوستانی سنیما ان امراض کے تئیں لوگوں کو بیدار کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ ایمنیسیا، اسپرجرس، ڈسلیکسیا، پروجیریا، ڈمینسیا، پیراپلیجیا اور شیزوفرینیا وغیرہ امراض کے شکار نسبتاً کافی کم لوگ ہوتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہندوستانی سنیما ان امراض کو مثبت انداز میں پیش کرے جو ہمارے ملک میں عام ہیں۔

Wasiqul Khair, Research Scholar, JNU, New Delhi-110067

بعد دس سال پیچھے پہنچ جاتے ہیں۔

2007 کی فلم 'تارے زمین پر' میں ایک الگ طرح کے دماغی مرض ڈسلیکسیا (Dyslexia) سے متاثرین کی زندگی اور مسائل کو پردے پر زندہ کیا ہے۔ ڈسلیکسیا کے شکار انسانوں کو پڑھنے اور چیزوں کو سمجھنے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ اس فلم میں یہ بھی دکھایا گیا تھا کہ دماغی مرض صرف بچے یا انسان میں نہیں بلکہ خاندان اور سماج میں بھی ہوتا ہے کیوں کہ وہ سہارا دینے کے بجائے رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں۔ جبکہ صحیح موقع ملے تو ڈسلیکسیا والے بچے زندگی میں ایک نارمل انسان کی طرح کامیاب ہوسکتے ہیں۔

سنجے لیلا بھنسالی نے 'گزارش' ایتھینیسیا یعنی خواہشی موت یا تکالیف سے نجات دینے کے لیے جان سے مار دینے جیسے نازک اور جذباتی موضوع کو لے کر بنائی ہے۔ فلم کے ہیرو رتک روشن چودہ سال سے ایک سنگین بیماری ٹیٹراپلیجیا (Tetzaplegia) سے متاثر ہیں۔ چہرے کے علاوہ جسم کے کسی بھی حصے پر ان کا کنٹرول نہیں ہوتا ہے۔ ٹیٹراپلیجیا سے ملتے جلتے مرض پیراپلیجیا کو 1965 کی فلم 'خاندان' اور 2007 کی فلم 'اپنے' میں بھی دکھایا گیا ہے۔

کرن جوہر کی 2010 میں آئی فلم 'مائی نیم از خان' میں شاہ رخ خان کو ایسپر جر سنڈروم (Asperger Syndrome) سے متاثر دکھایا گیا تھا۔ یہ ایسا دماغی مرض ہے جس میں انسان دوسرے لوگوں سے نزدیکی نہیں چاہتا۔ اور ایک ہی چیز کو بار بار کرنا یا کہنا ان کے رویے کا حصہ بن جاتا ہے۔ اس طرح کے دماغی مرض کو آٹزم (Autism) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس طرح کے اپنی کلاس میں لینا نہیں چاہتے ہیں، دیگر بچے اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ دماغی کمزوری والے بچوں کے مسائل کا حل اس فلم میں جادوئی تھا کیوں کہ روہت کی دماغی کمزوری دوسری دنیا سے آئے ایلین کی وجہ سے ختم ہوجاتی ہے۔ فلم 'اپنا آسمان' اور 'یوراج' میں بھی آٹزم (Atism) کو فلمایا ہے۔

سنجے لیلا بھنسالی کی 2005 کی فلم 'بلیک' اندھی اور بہری لڑکی اور اسے پڑھانے والے استاد کی ہے جنھیں بڑھاپے کے ساتھ الزائمر (Alzheimer) کے مرض کی وجہ سے یادداشت کھو بیٹھنے کی دماغی بیماری ہوجاتی ہے۔ اسی سے ملتی جلتی 2008 میں اجے دیوگن کی 'یومی اور ہم' آئی جس میں یہی بھولنے والی بیماری فلم کی ہیروئن کو ہوجاتی ہے۔ اسی طرح 2005 کی فلم 'میں نے گاندھی کو نہیں مارا' کے پروفیسر انوپم کھیر کو جو اپنی یادداشت ڈمینسیا (Demantia) کے مرض کی وجہ سے کھو بیٹھتے ہیں۔

فلموں میں یادداشت کھو بیٹھنے کی بیماری کو زیادہ تر ڈرامائی انداز میں دکھایا جاتا ہے۔ 2008 میں عامر خان کی 'گجنی' سنجے سنگھانیا کی کہانی بیان کرتی ہے۔ سنجے سنگھانیہ کو اینٹروگریڈ ایمنیسیا (Anterograde Amnesia) نام کی بیماری تھی جو اُسے لوہے کی راڈ سے چوٹ لگنے کے بعد ہوجاتی ہے۔ اسے پندرہ منٹ سے پہلے کی کوئی چیز یاد نہیں رہتی۔ حال ہی میں آئی 'جب تک ہے جان' میں شاہ رخ خان کو Reterograde Amnesia سے متاثر دکھایا گیا ہے۔ جس میں وہ ایک سڑک حادثے کے

کہکشاں کے رموز

عظیم اقبال

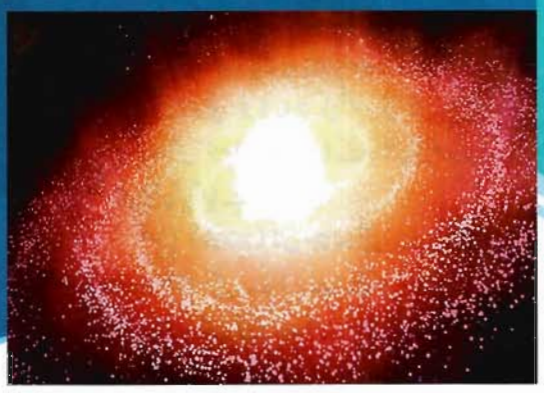

ماہرین فلکیات نے اتفاقاً ہماری کہکشاں جیسی اب تک دیکھی جانے والی سب سے بڑی چکردار کہکشاں کی دریافت کی ہے۔ یہ کہکشاں گیلیکسی ایوولیوشن، ایکسپلورر (گیلیکس) نامی خلائی دوربین سے حاصل ہونے والے امورِ مملونہ کے تجزیے کے دوران دریافت ہوئی۔

ماہرین کے مطابق 30 ارب سال پہلے ہونے والے اجرام فلکی کے ایک تصادم کے نتیجے میں یہ کہکشاں وجود میں آئی تھی۔ اس تصادم کے نتیجے میں نہ صرف ستارے دور دور تک پھیل گئے تھے بلکہ ان ستاروں کا ایک نیا جھرمٹ بھی تشکیل پایا تھا۔

اس دریافت کا اعلان امریکہ میں جاری ماہرین فلکیات کے سالانہ اجلاس (وسط جنوری 2013) میں کیا گیا۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس کائنات میں کہکشاؤں کا ارتقا کیسے ہوا۔

مفروض کا تجزیہ کرنے والے ماہرین کے مطابق یہ کہکشاں اتنی بڑی ہے کہ اس میں ہماری کہکشاں جیسی چار، پانچ کہکشائیں آسکتی ہیں۔ نو دریافت شدہ کہکشاں زمین سے 212 ملین نوری سال دور واقع این جی سی 6872 نامی کہکشاں اور آئی، سی 4970 کا شمار بھی بڑی چکردار کہکشاؤں میں ہوتا ہے۔ گیلیکسی دوربین سے حاصل ہونے والے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ایک خلائی ٹکراؤ کے نتیجے میں این جی سی 6872 نامی کہکشاں کے حجم میں اضافہ ہوا ہے۔ اسے دریافت کرنے والی ٹیم کے رُکن اور امریکی محقق رافیل افراسیو کا کہنا ہے کہ ''میں سب سے بڑی چکردار کہکشاں کا متلاشی نہیں تھا۔ یہ تو ایک تحفے کی مانند ملی ہے۔'' موصوف مزید کہتے ہیں ''این جی سی 6872 گزشتہ دو دہائیوں سے سب سے بڑی کہکشاؤں میں سے ایک کبھی جاتی رہی ہے، لیکن یہ ہمارے اندازوں سے کہیں بڑی نکلی ہے۔''

موصوف نے مزید کہا ''این جی سی 6872 سے تصادم کے نتیجے میں اس سے ٹکرانے والی کہکشاں کے ستارے 5 لاکھ نوری سال کے فاصلے تک پھیل گئے تھے۔''

اس ڈیٹا کے تجزیے سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ اس نو دریافت شدہ کہکشاں کے باہری ستاروں کی عمر کم ہے اور جیسے جیسے کہکشاں کے اندر جائیں، ستاروں کی عمر بڑھتی جاتی ہے۔

کہکشاں، وہ ہلکی روشن پٹی ہے جو آسمان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی نظر آتی ہے۔ اس کے وسط میں نظر ڈالنے سے اس میں بے شمار دھندلے ستاروں کی موجودگی کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ ایک طرح سے کہکشاں میں ہماری زمین اور ہمارے نظام شمسی کی شمولیت بھی ہے۔

کہکشاں، دراصل 'کاہکشاں' کا مخفف ہے۔ یہ وہ طولانی سفیدی ہے جو اندھیری رات میں سڑک کی مانند آسمان پر دور تک پھیلی نظر آتی ہے۔

کہکشاں، اس وجہ سے نام رکھا گیا کہ جس طرح کوئی شخص گھاس رسی میں باندھ کر کھینچتا ہوا دور تک لے جاتا ہے، اور اس سے زمین پر نشان پڑ جاتے ہیں۔ یہی صورت اُس کی ہے۔ اسے 'آکاش گنگا' بھی کہتے ہیں۔ اسے 'اندر کے ہاتھی کی راہ' بھی کہا گیا ہے۔ اِسے 'آکاش جنیو' اور 'معراج کی راہ' سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ 'شاعر' مانگ سے بھی اس کی تشبیہ دیا کرتے ہیں۔ امانت کا شعر دیکھیں:

چھڑک کے مانگ پہ افشاں وہ مہ روش بولا
ستارے دن کو دکھاتی ہے کہکشاں میری

اگر کہا جائے کہ ہماری دنیا میں آسمان میں رواں ایک بڑے دریا کی ننھی ننھی بوندیں ہیں، تو شاید آپ کو یقین نہ آئے۔ تاہم حقیقت یہی ہے۔ اوّل اوّل ایک سے زیادہ دنیا کا تصور پیش کرنے کا سہرا قرآن کریم کو جاتا ہے۔ قرآن کریم کی پہلی سورہ کی پہلی آیت تمام دنیاؤں کے رب کی حمد گوئی کرتی ہے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ ہم اس دریا کو زمین سے آسمان میں رواں دواں دیکھ سکتے ہیں۔ یہ دریا، یہی کہکشاں ہے۔

دنیا کے الگ الگ حصوں سے دیکھنے پر اس کی چمک الگ الگ طور سے دکھائی دیتی ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ ہماری زمین بھی اس کہکشاں کا ایک مختصر حصہ ہے۔

دریافت کے مطابق ہماری کہکشاں میں کائناتی غبار، اور گیس کے ہمراہ لاتعداد سیاروں کا اجتماع بھی ہے۔ اندازہ ہے کہ ان ستاروں کی تعداد سو (100) ارب سے زیادہ ہوگی۔ انھیں اربوں ستاروں میں شامل ہے ہمارا آفتاب، جس کے نظام شمسی میں ہماری زمین موجود ہے۔ درحقیقت زمین، اس کہکشاں یا گیلیکسی کا اتنا مختصر حصہ ہے

کہ اس کے متعلق آگہی سے حیرت ہوتی ہے۔

اولاً تو ہمیں کہکشاں کی وسعت کا اندازہ لگانا ہوگا۔ کہکشاں کی وسعت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ روشنی کی ایک شعاع کو اس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانے میں تقریباً ایک لاکھ برس لگ جاتے ہیں۔ لہٰذا، کہکشاں کی صورت ایک لاکھ برس تسلیم کی جاتی ہے۔ قابل ذکر ہے کہ نوری سال کائناتی فاصلے کی پیمائش کی اکائی، مانی گئی ہے۔

اس سے مراد ہے، روشنی کے ذریعے ایک برس میں طے کیا گیا فاصلہ، ہم یاد دلاتے چلیں کہ روشنی محض ایک سیکنڈ میں 3 لاکھ کیلومیٹر کا فاصلہ طے کرلیتی ہے پھر ہماری کائنات میں ہماری کہکشاں تنہا نہیں ہے۔ ایسا قیاس کیا جاتا ہے کہ کائنات میں، اربوں کہکشائیں موجود ہیں۔

کہکشاں کا اسرار طاقت ور دوربینوں کے وجود میں آجانے کے بعد کھلا۔ دورِ جدید میں لاسلکی دوربینوں نے بھی کہکشاں کے اسرار افشا کیے ہیں۔

صدہا سال تک قدما کہکشاں کو ستاروں کی ایک سپاٹ پٹی کے بطور جانتے تھے۔ اب یہ پتہ چلا ہے کہ ہماری کہکشاں اسپائرل یا کنڈلی کی صورت کی ہے۔ اس کا مرکز سوجا ہوا ہے اور یہ چرخی کے مانند ہے۔ اس سوجے ہوئے حصے کا حجم تقریباً 15 ہزار نوری سال پیمائش کیا گیا ہے۔ اس مرکز میں اربوں کی تعداد میں عمر رسیدہ ستارے موجود ہیں۔ مرکز سے چکر نما دو شاخیں نکلتی ہیں۔ جن میں جواں سال ستارے اور کائناتی دھول اور گیس موجود ہیں۔

کہکشاں کی ساخت کا موازنہ آتش بازی والی چرخی سے کیا جاتا ہے۔ اس کے درخشاں بازو برسرگردش نظر آتے ہیں۔ اس کے بازو متواتر مرکز کا طواف کرتے رہتے ہیں اس لیے پوری کہکشاں گردش میں مصروف نظر آتی ہے۔ بازوؤں کے ہمراہ اس میں موجود ستارے بھی طواف کرتے رہتے ہیں۔ لہٰذا ہمارا آفتاب، کہکشاں کے مرکز کا طواف کرتا ہے اتنا ضرور ہے کہ اسے ایک بار طواف کرنے میں 25 کروڑ سال لگ جاتے ہیں۔

ہمارا آفتاب کہکشاں کے مرکز سے تقریباً 30 ہزار نوری سال کے فاصلے پر واقع ہے۔ آفتاب کے سب سے قریب واقع ستارے 'سیریس' کی دوری 9 نوری سال پیمائش ہوئی ہے۔

جس طرح آفتاب کے گرد و نواح میں اَن گنت ستارے ہیں، اسی طرح کہکشاں کے نواح میں کئی کہکشائیں ہیں۔ ایسی 30 کہکشاؤں کے مجموعے کو

سائنس دانوں نے 'لوکل گروپ' کا نام دیا ہے۔ ایجنسی 6229 'پالومر' اور ایجنسی 7006 ہماری کہکشاں کے قریب ترین ہمسائے ہیں۔ یہ سارے آپس میں ایک دوسرے کی قوتِ کشش سے مربوط ہوکر کائنات میں سرگرداں ہیں۔

تحقیقات سے یہ بھی انکشاف ہوا ہے کہ ساری کہکشائیں، سارے اطراف میں ایک دوسرے سے دور ہوتی جارہی ہیں۔ مطلب یہ کہ کائنات کی متواتر توسیع ہورہی ہے۔

> **کہکشاں، وہ ہلکی روشن پٹی ہے جو آسمان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی نظر آتی ہے۔ اس کے وسط میں نظر ڈالنے سے اس میں بے شمار دھندلے ستاروں کی موجودگی کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ ایک طرح سے کہکشاں میں ہماری زمین اور ہمارے نظام شمسی کی شمولیت بھی ہے۔**
> **کہکشاں، دراصل 'کاہکشاں' کا مخفف ہے۔ یہ وہ طولانی سفیدی ہے جو اندھیری رات میں سڑک کی مانند آسمان پر دور تک پھیلی نظر آتی ہے۔**

کائنات کو انگریزی میں universe یا COS705 کہتے ہیں۔ اس سے مراد وہ سارا علاقہ ہے۔ جہاں کسی شے کا وجود ہے، یا جہاں کچھ وقوع پذیر ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کل نظام کائنات میں بے ترتیب یا بدنظمی کے بجائے حد درجہ ترتیب و تنظیم پائی جاتی ہے۔

کیا کائنات کی اس توسیع سے ساری کائنات کا ایک خاتمہ ہوجائے گا؟ اس بارے میں سائنس دنوں میں اختلاف ہے۔

ہماری کہکشاں کا سب سے پراسرار حصہ اس کا مرکز ہے۔ مرکز کے چاروں اطراف کافی فاصلے تک ایک غیر معمولی چمک نظر آتی ہے، جسے ہالہ کہتے ہیں۔ مرکز کے قریب اس کا رنگ زرد ہوتا ہے، جب کہ باہری کنارہ نیلگوں ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پیرانہ سال ستارے زرد رنگت کا اخراج کرتے ہیں، جب کہ جواں سال ستارے نیلگو ہوتے ہیں۔ اس ہالے کے عرض کی پیمائش 4 لاکھ نوری سال ہوئی ہے۔

سالہا سال تک سائنس داں کہکشاں کے مرکز کی توانائی کے منبع کے متعلق آگہی حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ حالیہ دنوں میں انفرا ریڈ اور لاسلکی دوربینوں کی مدد سے پتہ چلا ہے کہ کہکشاں کے مرکز سے گیس کی اونچی جیٹ کرنٹ پھوٹتی ہے۔ یہ خلا میں 12 ہزار نوری سال کی اونچائی تک پہنچتی ہے۔

سائنس دانوں کے خیال میں جیٹ کرنٹ کو حرکت اور توانائی کی ترسیل ایک وسیع بلیک ہول سے ہورہی ہے۔ اس کی توانائی کا جسم سو ارب ستاروں کے مساوی ہے۔ جب کہ بلیک ہول کا حجم ہمارے آفتاب سے 50 لاکھ گنا زیادہ ہے۔

یہ خلا میں ایسا علاقہ ہے، جو کسی ستارے کی قوتِ کشش سے اس قدر پسپا ہوجاتی ہے کہ یہ اپنی کوشش کے علاقے سے مادہ، روشنی یا برقی مقناطیسی تابکاری پیدا کرتی ہے۔ لہٰذا، کہکشاں کے مرکز میں شدید گرمی اور تیز روشنی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہماری کہکشاں کے گردش کرتے بازو کچھ کم پراسرار نہیں ہیں۔ سائنس دانوں کو تاحال، ان کی ابتدا کا ٹھیک ٹھیک سبب نہیں معلوم ہوا ہے۔ وہ محوِ حیرت ہیں کہ متواتر گردش سے ان کی صورت مسخ کیوں نہیں ہوتی۔

نئی تحقیقات بتاتی ہیں کہ اربوں سال قبل کہکشاں کی ابتدا کے وقت کائنات غبار میں کچھ لہریں پیدا ہوئی تھیں، جو تاحال محورفتار ہیں، اور اِسی رفتار کے سبب کہکشاں کی کنڈلی بھی گردش کررہی ہے۔ یہ لہریں کچھ ویسی ہی ہیں، جو تالاب میں کنکر پھینکنے پر پیدا ہوتی ہیں۔

ان رموز و اسرار کی آگہی کے باوجود آج بھی کہکشاں سائنس دانوں کے لیے آسمان میں منڈلاتی ہوئی پہیلی بنی ہوئی ہے۔

ویسے یہ سچ ہے کہ سائنسی شعور سے حیات و کائنات کے رموز و اسرار کی آگہی میں سہولت ہوتی ہے۔ کائنات اور مظاہر کائنات کے رموز و اسرار کی آگہی سے مالکِ حقیقی کی بزرگی اور برتری کا احساس بھی شدید ہوتا ہے۔

Azim Iqbal Adabistan, Ganj No One, Bettiah- 845438 (Bihar)

تبصرہ وتعارف

شعریات

مترجم: شمس الرحمٰن فاروقی

صفحات: 136، قیمت: 50 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: رغبت شمیم ملک برہم پترا ہاسٹل جے این یو 67

محمد حسین آزاد کی مقبول تصنیف 'آب حیات' کے انگریزی مترجم شمس الرحمٰن فاروقی نے ارسطو کی تصنیف Poetics کا ترجمہ 'شعریات' کے نام سے کیا ہے۔ یہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے پہلی بار 1980 میں شائع ہوئی۔ اب تک اس کے چار ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں۔ انھوں نے اپنے ترجمے کے لیے ایس ایچ بوچر کی کتاب کا انتخاب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بوچر کا انگریزی ترجمہ مستند ہے۔

انگریزی میں 'Poetics' کا اولین ترجمہ تھامس ٹوئینگ (Thomas Twining) نے 1789 میں کیا تھا۔ تھامس ٹوئینگ سے اب تک انگریزی میں دس سے زیادہ مترجمین کے ترجمے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان میں ٹوئینگ کے علاوہ ایس ایچ بوچر، انا گرام بائی واٹر، ولیم ہمیلٹن فائف، ایل جے پوٹس، گی ایم اے گروب، رچرڈ جینکو، اسٹیفن ہالی ویل، مالکوم ہیتھ، اور سیتھ بینارڈیت اور میکائل ڈیوس وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں تازہ ترین ترجمے سیتھ بینارڈیت اور میکائل ڈیوس کے ہیں۔ یہ ترجمے 2002 میں سینٹ آگسٹائن پریس سے شائع ہوئے۔ اردو میں ''Poetics'' کا اولین ترجمہ مشہور ترقی پسند نقاد عزیز احمد نے کیا۔ بعد ازاں اس کا اردو ترجمہ محمد یٰسین اور جمیل جالبی نے بھی کیا ہے۔

'شعریات' 136 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں 87 صفحات ارسطو کے اصل متن کا ترجمہ ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے 'شعریات' پر 49 صفحات پر مشتمل مقدمہ لکھا ہے۔ یہ مقدمہ ارسطو شعریات کے جہات کو روشن کرتا ہے۔ اس میں انھوں نے ارسطو کی مبحث میں افلاطون کے نظریات کو بھی شامل کیا ہے۔ یہ امر اپنی جگہ درست ہے کہ افلاطون کے ذکر کے بغیر ارسطو کی تفہیم مشکل ہے۔ انھوں نے افلاطون اور ارسطو دونوں کے نظریات کا تقابل بھی پیش کیا ہے اور متنازع مباحث کو بھی موضوع بحث بنانے کی سعی کی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے شعریات کو موجودہ تنقیدی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے شعریات کے ترجمے میں، ترجمے کے لوازمات کا خاص خیال رکھا ہے۔ انھوں نے ترجمے کے دوران متن کی روح میں اترنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس کا اندازہ 'شعریات' کے مطالعے کے دوران بخوبی ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے ترجمے میں متن کے لفظ اور معنی دونوں کے توازن کا التزام کیا ہے۔ انھوں نے اپنی علمی بصیرت سے بوچر کی مبہم اور گنجلک عبارتوں کی تصحیح اور بعض عبارتوں سے اختلاف بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''میرا اصول ہمیشہ یہ رہا ہے کہ ترجمہ حتی الامکان لفظاً اور معناً دونوں طرح اصل سے قریب رہے۔ چنانچہ میں زیر نظر رسالے میں بھی نہ تو محض خیال کو اپنے لفظوں میں ڈھال دیا ہے اور نہ لفظی ترجمہ کر دیا ہے بلکہ ترجمہ اور ترجمانی دونوں کی کوشش کی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے ترجمے میں بعض نئے اور اہم نکات کی جانب بھی ہماری توجہ مبذول کی ہے۔ ان نکات میں انھوں نے ارسطو کی اصطلاحات Mimesis اور Katharasis کے مروج ترجمے کو زیادہ موزوں تسلیم نہیں کیا ہے۔ انھوں نے یہ کہا کہ Mimesis کے انگریزی ترجمے میں تبدیلی ممکن نہیں ہے کیوں کہ یہ اصطلاح ہماری سائیکی کا حصہ بن چکی ہے۔ البتہ ان کا خیال ہے کہ اردو میں یہ تبدیلی ممکن ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ اصطلاحات اردو میں پوری طرح ہماری سائیکی کا حصہ نہیں بن پائی ہیں۔ لہٰذا انھوں نے نہایت غور وفکر کے بعد Mimesis کا ترجمہ 'نمائندگی' اور Katharasis کا 'تنقیہ' کیا ہے۔ ان کے نزدیک اس ترجمہ میں ارسطو کی اصطلاحات سے زیادہ لگاؤ نظر آتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''ارسطو نے Mimesis سے محض اس قسم کی نقل مراد نہیں لی تھی جس کا تاثر لفظ Imitation سے پیدا ہوتا ہے۔ انگریزی میں اس سے مفر ہمیشہ ممکن نہیں ہوا ہے کیوں کہ وہاں اب Imitation کی اصطلاح ہی مشہور اور مروج ہو چکی ہے۔ لیکن اردو میں چوں کہ ایسا معاملہ نہیں ہے اس لیے 'نقل' کی جگہ 'نمائندگی' رائج ہو جانے کے امکانات ہیں۔ Katharasis کا ترجمہ میں نے بڑے غور وفکر کے بعد 'تنقیہ' کیا ہے کیوں کہ جدید تحقیق کی رو سے یہی معنی ارسطو کے مدعا سے قریب ترین ہیں۔''

ارسطو کی تصنیف 'شعریات' ادبی تھیوری کا اولین نمونہ ہے اور دنیا کی تمام زبان میں ارمغان کی حیثیت رکھتی ہے۔ ارسطو نے ہی سب سے پہلے ہمیں ادب کی پرکھ اور جانچ کا پیمانہ عطا کیا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس تصنیف کا ترجمہ نہایت سلیس اور رواں دواں انداز میں کیا ہے۔ انھوں نے اس میں ادبی چاشنی کا بھی خاص خیال رکھا ہے۔

تاریخ ادب اردو (1838-1858) (دسویں جلد)

مصنف: پروفیسر محمد انصار اللہ

صفحات: 524، قیمت: 132 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 25

مبصر: فاروق اعظم قاسمی، 50 پیریار ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

اردو زبان وادب کی تاریخ وتحقیق کے حوالے سے پروفیسر محمد انصار اللہ کا نام اجنبی نہیں ہے۔ میر امن اور مولانا محمد حسین آزاد سے ہوتے ہوئے مسعود حسین خان تک آکر اردو کے آغاز کے نظریاتی مباحث کا دروازہ ایک طرح سے بند ہوتا دکھائی دیتا ہے اور آج ایک حد تک تمام ماہرین لسانیات اردو کا اس بات پر تقریباً اتفاق ہو چکا ہے کہ دہلی اور اطراف دہلی اردو زبان کا مولد ومسکن ہے اور 'اس کے مستند نمونے سولہویں صدی سے زیادہ پرانے نہیں' ...لیکن علی گڑھ کے پروفیسر انصار اللہ جو خود پورب (اعظم گڑھ) کے باشندہ ہیں اور پوربی زبان کے پارکھ بھی، انھوں نے 'پدماوت کی مختصر فرہنگ' (1972) اور ملا داؤد کی 'چندراین' (1996) کے دیباچے کے توسط سے اودھ کو اردو کی جائے پیدائش اور اودھی کو اردو کی بنیاد قرار دیا ہے۔ موصوف نے داخلی شواہد کے ذریعے اس کے سنہ تصنیف 1377 اور جائے تصنیف اودھ کو بتایا ہے۔ اس جدید تحقیق کے مطابق اس تصنیف کی عمر 'کدم راؤ پدم راؤ' سے چالیس سال زیادہ ثابت ہوتی ہے۔ فاضل محقق نے خسرو کے ہندوی سے اودھی مراد لیتے ہوئے 'چنداین' کو اردو کی سب سے پہلی تصنیف قرار دی ہے۔

تحقیق وتنقید پر پروفیسر انصار اللہ کے قلم سے سیکڑوں کتابیں منظر عام پر آئیں اور مقبول

عام وخاص ہوئیں۔اسی سلسلے کی ایک کڑی ہزاروں صفحات پر پھیلی 'تاریخ ادب اردو' بھی ہے۔

یوں تو اس موضوع پر جمیل جالبی سے لے کر تاحال متعدد مصنّفین کی درجنوں کتابیں منصۂ شہود پر آئیں اور ہر ایک کی اپنی اپنی الگ شان اور اہمیت وافادیت ہے۔ جمیل جالبی کی کتاب گرچہ اب تک مکمل نہیں ہو پائی ہے؛ تاہم اردو ادب کی تاریخ میں اسے استناد واعتبار حاصل ہے۔اسی طرح گیان چند جین اور سیدہ جعفر کی پانچ جلدوں پر مشتمل مشترکہ تصنیف ستر ہویں صدی کی تاریخ ادب اردو کا احاطہ کرتی ہے،اس کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹی بڑی کتابیں ہیں جو بعد کے دور کا احاطہ کرتی ہیں؛ لیکن پروفیسر انصار اللہ کی یہ کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے سب سے الگ اور منفرد ہے۔

زیر نظر کتاب موصوف کی سترہ جلدوں پر مشتمل تاریخ ادب اردو کی دسویں جلد ہے۔ بنیادی طور پر کتاب کو دو علاقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔پہلا روہیل کھنڈ اور دوسرا لکھنؤ۔اول الذکر میں بالترتیب چھ شہر شامل ہیں: بریلی، مرادآباد، بدایوں، رام پور، شاہ جہاں پور اور فرخ آباد۔

کتاب کی ابتدا میں ایک اجمالی فہرست ہے جو مذکورہ شہروں پر مشتمل ہے پھر ان شہروں میں ہر شہر کی ایک مفصل فہرست ہے، گویا ایک شہر ایک باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر باب کو دو کلیدی حصوں میں بانٹا گیا ہے۔ایک نظم دوسرے نثر۔منظوم حصے میں اس بات پر خاص توجہ دی گئی ہے کہ متعلقہ علاقے میں نظم کی کس کس صنف میں طبع آزمائی کی گئی ہے۔مصنف نے ان تفصیلات کو الگ الگ بیان کیا ہے؛ البتہ صنف غزل کو اولیت دی گئی ہے۔اس کے بعد ہر صنف میں طبع آزمائی کرنے والے شاعر پر علی حدہ بحث کی گئی ہے۔

کتاب کی پیشانی پر 1858-1838 کا اندراج اس شبہے میں ڈالتا ہے کہ اس کا تعلق زیر نظر مکمل کتاب سے ہے یا صرف کتاب کے اسی حصے سے؟ اسی طرح سے قاری کے ذہن پر یہ سوال بھی ابھرتا ہے کہ آیا مذکورہ ان بیس سال کے عرصے میں اردو کی تاریخ مندرجہ ذیل انھی مقامات پر بنتی رہی یا اردو کے دوسرے جزیرے بھی آباد ہو رہے تھے اور وہاں بھی اردو ادب کے تاریخی ہیولے تیار ہو رہے تھے؟

مصنف نے عہد وار تاریخ مرتب کرنے کے بجائے شخص وار تاریخ مرتب کی ہے اس طرح انھوں نے روایتی طرز سے انحراف کر کے ایک الگ انداز سے اردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے کی سعی جمیل کی ہے۔اس میں مذہبی نثر کا ایک مستقل عنوان قائم کر کے مصنف نے اردو ادب کے ایک مردہ پہلو کو بھی زندگی عطا کی ہے۔

کتاب کے اخیر میں کتابیات کے ضمن میں ڈیڑھ سو معتبر ومستند کتب و رسائل کا اشاریہ قابل ذکر ہے۔ زبان وبیان پر قدرے قدامت کا غلبہ ہے اور اسلوب میں بھی کہیں کہیں بوجھل پن ہے تاہم مجموعی طور پر سادہ نثر کو کام میں لایا گیا ہے۔خلاصہ یہ کہ شخص واحد کی طرف سے اس عظیم خدمت کو مکمل ایک انجمن کا کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

بچوں کی دنیا

مدیر: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

صفحات: 64، قیمت: 10 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: شہزاد انجم، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

قومی اردو کونسل کی جانب سے شائع ہونے والا ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کا پہلا شمارہ کئی حیثیتوں سے اہمیت کا حامل ہے۔بچوں کی ذہنی تربیت اور اعلیٰ علمی وادبی ذوق پیدا کرنے کے لیے بچوں کے رسائل کی اشد ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ یوں تو دہلی اور ہندوستان کے دیگر شہروں سے بچوں کے رسائل شائع ہوتے ہیں لیکن یہ رسائل بہت کم ہاتھوں تک پہنچ پاتے ہیں۔بچوں کے رسائل میں کئی ایسے رسائل ماضی میں شائع ہوئے ہیں جن سے نسلوں کی تربیت اور ذہنی آبیاری ہوئی ہے۔قومی اردو کونسل کی جانب سے شائع ہونے والے اس رسالے سے یہ امید ہے کہ یہ رسالہ گھر گھر پہنچے گا جس سے بچوں میں اردو پڑھنے لکھنے کا ذوق پیدا ہوگا اور اس رسالے کو بچے شوق سے پڑھیں گے اور ان کا علمی وادبی ذوق نکھرے گا۔اس رسالے کی آمد پر میں قومی اردو کونسل کے ارباب حل وعقد کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے بہتر اور نیک قدم اردو کی ترویج واشاعت کے لیے اٹھایا ان کا یہ عمل یقیناً تاریخی نوعیت کا حامل ہوگا۔

تازہ شمارے میں نظمیں، کہانیاں، کامکس، قسط وار ناول اور کئی معلوماتی مضامین شامل ہیں۔نصرت ظہیر کا مضمون 'ڈھائی ہزار سال پرانا بودھ دھرم' اور راشد جمال فاروقی کا مضمون 'چاکلیٹ کی کہانی' معلوماتی اور اہم ہیں۔محمد سراج عظیم، حسن جمال، محمد طاہر صدیقی اور رضوان رضا کی تحریر کردہ بچوں کی کہانیاں بھی سبق آموز اور دلچسپ ہے۔غیر ملکی کہانی 'نیک دل درزی' بھی دلچسپ ہے۔رسالے میں شامل نظمیں اچھی اردو پیاری اردو، میرا وطن، چڑیا گھر کی سیر، اف یہ گرمی، مچھلیاں واٹر ٹینک میں، تتلی تتلی اے تتلی خوبصورت اور دلآویز ہیں۔کھیل کھلاڑی کے تحت 'دنیا کا مقبول ترین کھیل ٹینس' بھی معلوماتی ہے۔ذہنی آزمائش کے لیے اپنا امتحان خود لیجیے اور آپ کی باتیں کے تحت اردو فیس بک کے ذریعے نئی نسلوں کی ذہنی آبیاری اور اردو زبان وادب سے شغف پیدا کرنے کا طریقہ بھی بہت خوب ہے۔

مجموعی طور پر یہ رسالہ اچھا ہے۔رسالے کا سائز البتہ چھوٹا ہے اسے قومی اردو کونسل کے دوسرے رسالے 'اردو دنیا' کے سائز کا ہونا چاہیے۔پیش نظر شمارے میں بچوں کی دنیا کا فونٹ سائز بھی کافی چھوٹا ہے اسے بچوں کو پڑھنے میں پریشانی ہو سکتی ہے۔اس کے حروف اور بڑے ہونے چاہیے۔تین صفحات پر پھیلی گلزار کی نظم 'شیر اور خرگوش' بھرتی کی نظم ہے۔تین صفحات میں دوسرے شعرا کی چھ خوبصورت نظمیں شائع کی جا سکتی تھیں۔اس رسالے میں مزید معلوماتی مضامین شامل کیا جانا چاہیے جو بچوں کے لیے دلچسپ اور فکر انگیز ہوں۔رسالے کے گٹ اپ پر تھوڑی اور توجہ کی ضرورت ہے۔اردو دنیا کے مقابلے میں اس شمارے کا گٹ اپ پھیکا اور ہلکا معلوم ہوتا ہے۔ رسالے میں معروف شعرا کی مشہور نظمیں، ہندستان کی اہم سیاسی، سماجی اور علمی شخصیات پر مضامین، دنیا کے معروف ادبا وشعرا کی سوانح، ہندستان کے مشہور شہروں، ندیوں، پہاڑوں اور عمارتوں پر بھی مضامین شائع کیے جا سکتے ہیں تاکہ نئی نسل کی معلومات میں اضافہ ہو اور وہ ہندستانی تہذیب وثقافت سے بخوبی واقف ہو سکیں۔

مجموعی طور پر یہ پہلا شمارہ اچھا ہے۔امید ہے آئندہ اس سے بھی بہتر مشمولات کے ساتھ یہ رسالہ شائع ہوگا۔

آٹھواں آسمان (شاعری)

مصنف: پروفیسر محمد علی اثر

صفحات: 204، قیمت 225 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس؛ دہلی

مبصر: محمد جابر زماں، 134، ستلج ہاسٹل، جے این یو نئی دہلی 67

اردو ادب میں محمد علی اثر کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں انھوں نے دکنیات کے محقق کی حیثیت سے اپنی جو شناخت بنائی ہے اس میں کسی دوسرے کی کوئی ساجھے داری نہیں بلکہ یہ صرف اور صرف ان کی ذاتی محنت اور دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ ان کی تحقیقات نے اردو کے اہم اور بزرگ محققین کی نظروں میں بھی اپنا مقام بنا لیا ہے۔انھوں نے ماضی میں عثمانیہ یونیورسٹی کے استاد کی حیثیت سے اپنے فرائض بھی ادا کیے ہیں اور علم وادب سے بھی اپنا واسطہ استوار

رکھا ہے۔ اس کے علاوہ اردو شاعری میں بھی انھوں نے اپنی شناخت قائم کی ہے۔ اس سے پہلے ان کے سات شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ 'آٹھواں آسمان' ان کا آٹھواں شعری مجموعہ ہے جس میں حمد و نعت کے علاوہ غزل، نظم، رباعی، قطعہ، ماہیا وغیرہ اصناف کے ذیل میں انھوں نے اپنے شعری کلام کو مرتب کیا ہے۔ ان کے مجموعے کا یہ صنفی تنوع ان کے شعری تجربے کی کثیر جہتی کو آشکار کرتا ہے۔ یہ تجربہ سادہ اور یک رخا نہیں ہے بلکہ اس میں بھی معنویت و تہہ داری کے رموز و نقوش عیاں ہیں جو ان کے زود گو اور کہنہ مشق ہونے پر دال ہیں۔ مجموعے کا حاوی حصہ غزلوں پر مبنی ہے۔ عام رویے کے برخلاف اس کتاب میں حمد و نعت بھی اچھی خاصی تعداد میں شامل ہیں۔ محمد علی اثر کا حمدیہ کلام بڑا پر شکوہ اور پر اثر ہے۔ دو اشعار دیکھیے:

شمس و قمر میں جس نے خود اپنا ظہور رکھ دیا
اس نے ہی شب چراغ میں تھوڑا سا نور رکھ دیا
تھوڑا سا غم دیا مجھے، تھوڑا سرور رکھ دیا
دونوں سے لطف لینے کا مجھ میں شعور رکھ دیا

محمد علی اثر اپنے تجربہ و احساس سے شاعری کشید کرتے ہیں۔ انھیں زندگی اور اس کے طلسم کی وقعت و معنویت کا ادراک ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں تفکر و تدبر کا دائرہ روشن اور امید و رجا کی کیفیت واضح ہے۔ اثر کو اس بات کا احساس ہے کہ تخلیق یونہی جنم نہیں لیتی بلکہ اس کے لیے خون جگر جلانا پڑتا ہے:

اپنی سوچوں پہ روشنی رکھنا — ہر تغیر کی آگہی رکھنا
شعر کہنا کبھی کبھی لیکن — اپنے لہجے میں تازگی رکھنا

ان کا کلام کلاسیکی اسلوب شعر اور روایت سے اکتساب تو کرتا ہے لیکن یہی اس کی کلی شناخت نہیں بلکہ انھوں نے جدید فکر و آگہی سے بھی اپنے شعری اسلوب کو جلا بخشی ہے۔ اور اس طرح کے اشعار تخلیق کیے ہیں:

میرے اندر تھا اک خلا شب بھر — اور میں خود سے تھا جدا شب بھر
میرے اندر ہی تھا وجود اس کا — میں جسے ڈھونڈتا پھرا شب بھر

جنگل میں صداؤں کے سنائی نہیں دیتا — وہ بھیڑ ہے چہرا بھی سجھائی نہیں دیتا

کوئی چہرا بھی دکھائی نہیں دیتا مجھ کو — یہ دھواں دیکھیے تا حد نظر کیسا ہے

ناخدا کو ڈبو کے دریا میں — خود ہی کشتی چلا رہی ہے ہوا
ریت پر نقش پا یہ کس کے ہیں — کیوں دبے پاؤں آ رہی ہے ہوا

محمد علی اثر کی غزلوں کا تیور معاصر غزلیہ اسلوب و آہنگ سے منفرد اور ممتاز ہے۔ ان کے کلام سے جس شعری شخصیت کی تشکیل ہوتی ہے وہ حساس اور فکر و شعور سے متصف ہونے کے ساتھ کسی قدر جذباتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں تہذیبی و اخلاقی اقدار کی پامالی اور سماجی و سیاسی صورت حال پر ردعمل ملتا ہے۔ وہ اپنے گرد و نواح سے بے نیاز نہیں اور نہ ہی اسے نظر انداز کر دینے پر آمادہ ہیں۔ یہ سب اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے دیکھ کر وہ خاموش نہیں رہ پاتے بلکہ اپنی پوری قوت کے ساتھ اس پر وار کرنا چاہتے ہیں لیکن بے بس ہیں۔ یہ تمام باتیں ان کے شعری تجربے کا حصہ بن گئی ہیں جن میں فکر و آگہی کے ساتھ جمالیاتی حظ بھی موجود ہے۔ اثر نے غیر مانوس الفاظ و مرکبات سے اجتناب کرتے ہوئے سادہ، پر اثر اسلوب اور رواں بحروں میں اپنے اکتساب و ادراک کو شعری پیکر عطا کیا ہے۔

اقبال اور بمبئی

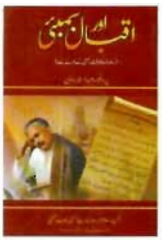

مصنف: پروفیسر عبدالستار دلوی
ناشر: انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی
مبصر: پروفیسر محمد ظفر الدین
مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدر آباد

پروفیسر عبدالستار دلوی کی تازہ ترین تصنیف 'اقبال اور بمبئی' ایک معرکتہ الآرا کتاب ہے جو مصنف کے تحقیقی مزاج اور بے پناہ کاوشوں کی عکاس ہے۔ کتاب کے مکمل نام سے اس کے مشمولات کی مزید وضاحت ہوتی ہے جو اس طرح ہے: 'اقبال اور بمبئی (روزنامہ خلافت، بمبئی کے حوالے سے) اور دیگر مضامین'۔ یعنی بیشتر مضامین روزنامہ خلافت کے حوالے سے اقبال اور بمبئی پر قلم بند کیے گئے ہیں جبکہ بعض دیگر مضامین بھی شاملِ کتاب ہیں۔ یہ کتاب انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی سے شائع ہوئی ہے جس کے اعزازی ڈائرکٹر خود پروفیسر عبدالستار دلوی ہیں۔ انجمن اسلام کے صدر ڈاکٹر ظہیر قاضی نے کتاب کا ابتدائیہ قلم بند کیا ہے جبکہ صدر انجمن ترقی اُردو ہند پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے پیش لفظ میں اقبال اور مصنف کے تعلق سے اظہار خیال کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''پروفیسر عبدالستار دلوی نے ممبئی سے اقبال کے تعلق کے بارے میں تحقیق کی ہے جس میں بہت کچھ وہ ہے جو اب تک لوگوں کو متوجہ نہیں کر سکا۔ اس معلومات کے ذریعے ان کی نجی اور تخلیقی زندگی کی نشو و نما سے متعلق کچھ کڑیاں مل جائیں گی۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے پہلے بھی اقبال کی شاعری، زندگی اور ان کے کلام کے تراجم پر اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ وہ اُردو کے معروف مستند محقق اور ماہر لسانیات ہیں مگر ان کی علمی دلچسپیوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اُردو اور مراٹھی کے تعلق سے بھی ان کی تحریریں اور تراجم کو اہل علم قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔''

کتاب میں مصنف کے بارہ مضامین ہیں جن میں بمبئی سے اقبال کے رشتے کے ساتھ ساتھ اُن سے متعلق مختلف حقائق کو سامنے لایا گیا ہے یا اُن پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ مصنف نے 'مقدمہ' میں ذکر کیا ہے کہ ''اس کتاب کے مضامین تنقید و تبصرہ سے زیادہ دستاویزی ہیں۔'' لہٰذا اُنھوں نے اقبال اور عطیہ بیگم فیضی پر اظہار خیال کیا یا اسلام اور ملوکیت پر علامہ کے خیالات کو بیان کیا، ہسپانیہ میں علامہ اقبال کے مشاہدات کو موضوع مطالعہ بنایا، اقبال کو ایشیا کے ملک الشعرا قرار دیے جانے پر معلومات فراہم کیں ... ہر جگہ مصنف کا تحقیقی وجدان کام کرتا رہا ہے۔ مصنف نے بڑے سلیقے سے 'تیسری گول میز کانفرنس'، 'لکھنؤ مسلم کانفرنس اور اقبال' پر قلم اُٹھایا ہے اور ترانہ ہندی کے سو سال مکمل ہونے پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اِن سب کے علاوہ جو مضمون قاری کو سب سے زیادہ متوجہ کرتا ہے وہ ہے: 'اقبال کا ایک غیر مطبوعہ خط'۔ پروفیسر دلوی نے اُردو والوں کو اس خط کی شکل میں ایک ایسا نادر تحفہ عطا کیا ہے جس کا کوئی جواب نہیں۔ اُنھوں نے یہ انگریزی خط لندن کی مشہور انڈیا آفس لائبریری سے کافی تگ و دو کے بعد حاصل کیا اور پھر اسے اصل، اُردو ترجمہ اور تفصیلی تمہید و تعارف کے ساتھ مضمون کی شکل میں پیش کر دیا۔ یہ خط دراصل عطیہ فیضی کی ہمشیرہ نازلی رفیعہ بیگم کے بعد از طلاق معاملات کے حوالے سے ہے۔ نواب آف جنجیرہ سدی احمد خاں سے جب اولاد نہ ہونے کے سبب اُن کی طلاق ہوئی۔ نواب صاحب نے نازلی رفیعہ بیگم کو ساز و سامان اور کثیر دولت اور ہیرے جواہرات کے ساتھ ایک جہاز سے بمبئی روانہ کیا اور اخراجات کے لیے تین ہزار روپے ماہانہ طے کر دیا۔ اُنہیں سرکاری ٹائٹل یعنی بیگم صاحبہ کا خطاب استعمال کرنے کی بھی اجازت دی گئی۔ مگر بعد میں جب حالات بدلے تو رقم کفالت اور خطاب دونوں ہی پر خطرات کے بادل منڈلانے لگے لہٰذا عطیہ بیگم اور خود نازلی بیگم کی ایما پر علامہ اقبال نے

وائسرائے کو ایک مفصل خط 17 اپریل 1933 کو تحریر کیا جس میں مذہبی عائلی اور عصری قوانین کے حوالوں اور دلائل سے نازلی بیگم کے حقوق کی حمایت کی گئی تھی۔ یہ خط پہلی بار پروفیسر دلوی کی کتاب میں شائع ہوا ہے جس کی دستاویزی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اِس خط کے علاوہ کتاب کے ٹائٹل پر شائع اقبال کا ایک پیغام قاری کو اپنی جانب خصوصی طور پر متوجہ کرتا ہے اور دعوتِ غور وفکر دیتا ہے۔ پروفیسر دلوی نے اپنے مضمون 'اقبال کی بمبئی میں آمد اور مسلمانوں کے نام ان کا پیغام' میں شامل اس پیغام کو ٹائٹل پر شائع کر کے اسے نمایاں کرنے اور اس کی اہمیت کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے۔

الختصر! یہ کہنا قطعی بے جا نہ ہوگا کہ زیرِ نظر کتاب کے ذریعے پروفیسر دلوی نے اقبالیات کے ضمن میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ اُنھوں نے اپنی کتاب 'اقبال اور بمبئی' میں کئی تحقیقی انکشافات کیے ہیں اور جو حقائق پہلے سے منکشف تھے اُن کے مخفی پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے۔ کتاب کی پیش کش بہت ہی معیاری اور صوری طور پر دلکش ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب ادبی دُنیا میں انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

دکنی ادب کے محققین و محسنین (ابتدا تا حال)

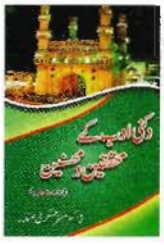

مصنفہ: ڈاکٹر مسز عسکری صفدر

صفحات: 440، قیمت: 400 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: عذرا نقوی، یونی ٹیک ہورائزن ٹاور 11، فلیٹ 502، پلاٹ نمبر 6 سیکٹر پی آئی 2، گریٹر نوئیڈا، جی بی نگر، 201308

ڈاکٹر مسز عسکری صفدر کی یہ ضخیم کتاب دکنی ادب سے دلچسپی رکھنے والے، طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کے لیے بہت اہم کتاب ہے۔ اس میں دکنی ادب کے محققین اور محسنین کے ادبی کارناموں اور حیات کا مفصل جائزہ ہے۔ مصنفہ نے اس موضوع پر بکھرے ہوئے مواد کو بہت محنت اور سلیقے سے پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنے موضوع سے متعلق زیادہ سے زیادہ مواد جمع کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس کتاب کے ذریعے دکنی ادب کے بعض محققین پہلی مرتبہ ادبی دنیا سے متعارف ہو رہے ہیں۔

کتاب کا پہلا حصہ تعارفی ہے جو خود اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ مصنفہ اور کتاب کا تعارف ممتاز ماہر دکنیات پروفیسر محمد علی اثر نے بعنوان 'حرفِ قلب' کرایا ہے۔ موصوف نے اس کتاب کی افادیت اور مصنفہ کے علمی شغف اور تحقیقی لگن کی بہت تعریف کی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے دکنی ادب کے کچھ اہم محققین کی غیر شمولیت اور تحقیقی مقالوں میں کچھ ناموں کی غیر موجودگی کی نشاندہی بھی کی ہے۔ پروفیسر محمد علی اثر اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

''عسکری صفدر نے مختلف جامعات ہند کے دکنی ادب سے متعلق تحقیقی مقالات کا اس باب میں احاطہ کر لیا ہے وہ یقیناً قابلِ تعریف اور قابلِ داد ہیں۔ اس فہرست کے مشاہدے سے ایک طرف مختلف جامعات میں لکھے ہوئے سندی مقالوں کے موضوعات اور ان کی رفتار کا اندازہ ہوتا ہے تو دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی موضوع یا ایک ہی موضوع سے ملتے جلتے کتنے ہی مقالوں کی تکرار ہوئی ہے۔''

کتاب کے تعارفی حصے میں ڈاکٹر محمد نسیم فریس، صدر شعبۂ اردو مولانا آزاد اُردو یونیورسٹی نے بھی 'صفِ میمنہ' کے عنوان سے کتاب پر اپنے تاثرات رقم کیے ہیں۔ کتاب کے تعارفی حصے میں مصنفہ کا ایک بہت مدلّل اور معلوماتی مقدمہ بھی شامل ہے جس میں اردو زبان کے آغاز پر مختلف محققین کے نظریات پیش کیے ہیں۔ اردو کے قدیم ناموں ہندی اور ہندوی کے مختلف ماخذوں پر نظر ڈالی ہے۔ دکن میں اردو کی آمد اور فروغ کا تاریخی پس منظر بیان کیا ہے۔ صوفیائے کرام کی خدمات کا ذکر کیا ہے، بہمنی، عادل شاہی اور قطب شاہی دور کے ادیبوں کا تذکرہ ہے۔ اور دکنی ادب کی تحقیق کے مسائل کے جائزہ لیا ہے۔

مصنفہ نے کتاب کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے، پہلا باب 'دکنی ادب کے محققین'، دوسرا باب 'دکنی ادب کے محسنین اور تیسرا باب ہے دکنی ادب سے متعلق لکھے جانے والے سندی مقالات کی فہرست۔ اس کتاب میں 113 محققین دکنیات شامل ہیں (حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دی گئی ہے)۔ ہر محقق کی ولادت، تعلیم اور ملازمت کی تفصیلات ہیں، پھر اس کی تصانیف کے نام دیے گئے ہیں اور اس کے بعد اس کی اہم تصنیف یا تصنیفات پر نظر ڈالی ہے۔ ڈاکٹر عسکری نے محقق کے حالات اور تحقیقی اور تصنیفی کاموں کے ذکر کے بعد، اس پر لکھے جانے والے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالوں یا کتابوں کی بھی تفصیل دی۔ مرحوم محققوں کی وفات پر نکالے گئے رسائل کے خاص نمبروں کو بھی ذکر کیا ہے۔ یقیناً یہ ساری تفصیلات جمع کرنا بہت مشکل کام ہے۔ لیکن طالب علموں اور ریسرچ اسکالروں کا کام ڈاکٹر عسکری نے یقیناً آسان کر دیا ہے۔ ہر چند کہ اس کتاب میں بقول پروفیسر اثر، معروضیت اور تمام اہلِ قلم کے ساتھ توازن کا زیادہ خیال نہیں رکھا گیا ہے۔

اس کتاب کے دوسرے باب میں 'دکنی ادب کے محسنین' میں سات شخصیات شامل ہیں۔ آصف سابع نواب میر عثمان علی خاں، نواب سالار جنگ سوم، نواب عنایت جنگ، حکیم سید شمس اللہ قادری، بابائے اردو مولوی عبدالحق، ڈاکٹر زور اور ادبیات اُردو اور مولوی نصیرالدین ہاشمی۔ میر عثمان علی خاں کو کتابیں اور مخطوطات جمع کرنے کا شوق تھا۔ ان کے جمع کیے ہوئے مخطوطات سابق کتب خانۂ آصفہ اور موجودہ اورینٹل مینوا سکرپٹ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر میں محفوظ ہیں۔ نواب سالار جنگ بہادر نے اپنی دولت کا بڑا حصہ مخطوطات پر صرف کیا۔ انھوں نے منہ مانگی قیمت پر نادر و نایاب مخطوطات خریدے جو اب سالار جنگ میوزیم کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ نواب عنایت جنگ بہادر نے بھی اپنے نادر کتب اور مخطوطات کتب خانۂ ادراۂ ادبیات کو تحفے کے طور پر دے دیے۔ یقیناً یہ ہستیاں ادب اور خاص طور پر دکنی ادب کے محسنین ہیں۔

کتاب کے آخر میں مصنفہ نے مختلف جامعات میں پی ایچ ڈی، ایم فل اور ایم اے کی سطح پر لکھے جانے والے 142 مقالوں کی نشاندہی کی ہے جس سے یہ ایک مکمل اور اہم حوالے کتاب بن گئی ہے۔

ننّھا بہادر

مصنف: رئیس صدیقی

صفحات: 88: قیمت: 30 روپے

ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

مبصر: توقیر راہی، C-190، نزد طیب مسجد، شاہین باغ، نئی دہلی

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ ماضی کا ادب اطفال ہمارے لیے ایک قیمتی اثاثہ و سرمایہ ہے۔ نیز ماں، نانی اور دادی کی گود ان کا پہلا مکتب ہے اور ان کی لوریاں و گیت بچوں کی متلاشی نظروں اور بے نام جستجو کے لیے پر مغز غذا ہے۔ آج کے جدید سائنس و ٹیکنالوجی کے منظر نامے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ادب اطفال تخلیق کرنا ہوگا، یہ وقت کا تقاضا ہے۔

ادب اطفال کی فہرست میں یوں تو بہت سے شعرا و ادبا شامل ہیں، لیکن نمایاں نام اسمٰعیل میرٹھی، افسر میرٹھی، ڈاکٹر ذاکر حسین، شفیع الدین نیر، ابن انشا، حامد اللہ افر، حفیظ جالندھری وغیرہ کے ہیں۔ حال میں، فیروز بخت، سراج حسین، رئیس صدیقی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

رئیس صدیقی محتاج تعارف نہیں۔ وہ عرصۂ دراز سے الیکٹرانک میڈیا (ریڈیو، ٹی وی) سے منسلک رہے ہیں۔ آج کل دوردرشن ڈی ڈی اردو سے وابستہ ہیں۔ ان کی تقریباً سات کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں، مثلاً 'شیروں کی رانی' (بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ)،

'اچھے خط کیسے لکھیں'، 'اردو لرننگ کورس'، 'زبان اردو'، 'باتونی لڑکی'، 'ننھا بہادر'، 'جان پہچان'۔ علاوہ ازیں غزلیں، افسانے، سائنس، فلم، کھیل کود اور ادبی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہی نہیں، مختلف شعبوں سے وابستہ شخصیات سے انٹرویوز نیز تراجم اندرون ملک و بیرون ملک تقریباً بیشتر اخبارات و رسائل و جرائد میں خامہ فرسائی کرتے رہے ہیں۔ ادب اطفال کے لیے یہ ان کے کارنامے و خدمات ہیں، جن کی وجہ سے مختلف اعزازات و ایوارڈز سے سرفراز ہوئے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'ننھا بہادر' اٹھاسی صفحات پر مشتمل ہے جو کہ مکتبہ پیام، نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ متذکرہ کتاب میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے 'آپ بیتی' کو 'جگ بیتی' بنایا ہے۔ اس سے کس کو انکار ہے کہ شاعر و ادیب خلا میں جنم نہیں لیتا، بلکہ ہمارے ہی درمیان پیدا ہوتا ہے اور اسی ماحول کا پروردہ ہوتا ہے۔ اسی انسانی معاشرے سے شاعری کے لیے موضوعات و مواد کا انتخاب کرتا ہے۔ 'ننھا بہادر' کی کہانیوں میں مصنف کی بھولی بسری یادیں اور تہذیبی قدریں طور سے طور پر نظر آتی ہیں۔ یہی چیزیں رئیس صاحب کو ادب اطفال کا تخلیق کار بناتی ہیں۔

پہلی کہانی 'ننھا بہادر' شجاعت و صداقت کا جہاں درس دے رہی ہے، وہیں کہانی 'دلیر انسان' اخلاص اور رب کائنات کے لیے مرنے جینے اور مارنے کا فلسفہ پیش کرتی ہے۔ 'بلی رانی' کی کہانی بڑی دلچسپ اور معنی خیز ہے یہ کہانی ایثار و قربانی پر مبنی ہے جو کہ آج کل عنقا ہے۔ آج کی مصروف زندگی میں انسان ایک مشین ہو گیا ہے کہ سڑک پر پڑے مظلوم بلبلاتے، چیختے، کراہنے کی صدا کو نظر انداز کر دیتا ہے، حیوانات پر رحم کھانا بعید از قیاس ہے۔ اسی طرح 'وفادار راجا' میں کتے کی وفاداری بیان کی گئی ہے جو کہ بچے کی ذہن سازی کے لیے اچھی کہانی ہے۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا سا گھر، شرارت، قلم چور، چھپا دشمن، بزدل ساتھی، عقل مند کوئل، چالاک مرغا، عقلمند کسان، شکاری شکار ہو گیا، عقلمند سوداگر، حاضر جواب لڑکا، قصہ ایک آئینہ کا، چوہیا رانی، آدم خور اور بھول بھلیاں، دان، اثر کڑوے پانی کا، موت کے لمبے ہاتھ، آغا صاحب کی ایک شرارت، کہانی میں کہانی، فیصلہ، انسانیت کا پاک چہرہ، جیسی کہانیاں متذکرہ کتاب میں شامل ہیں جن میں مذکورہ خصوصیات ہیں اور ہر ایک کہانی سبق آموز ہے نیز بچے جو کہ گیلی مٹی کی طرح ہیں، خوشنما برتن بن سکتے ہیں، شگفتہ گل سرسبد ہو سکتے ہیں، نہ جانے ان کی بھینی بھینی خوشبوؤں سے کتنے جہاں معطر ہو سکتے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ پیغامات و نصائح کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ زبان عام فہم اور سلیس ہے۔ اسلوب بیان فطری، سادہ و پرتاثیر ہے۔ رئیس صدیقی بھی 'تارے زمین پر' کی طرح بہت سے ٹمٹماتے، جھلملاتے، ستارے کو صفحۂ قرطاس پہ اتار لائے ہیں اور اسٹار، سپر اسٹار بننے کا خواب سجایا ہے۔ کاش کہ شرمندۂ تعبیر ہو سکے اور بس:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا مری

کندن پارے

مصنف: کندن لال کندن

صفحات: 152، قیمت 200 روپے

ناشر: مصنف

مبصر: ذاکر عثمانی، 49، ونوبا پوری، لاجپت نگر، نئی دہلی 24

زیر نظر تازہ شعری مجموعہ 'کندن پارے' نو مشق شعرا کو فن شاعری کے ساتھ ساتھ فن عروض پر بھی مائل و راغب کرتا ہے۔ جس کے لیے ہر کلام کے نیچے بحر و وزن کا اندراج کر دیا گیا ہے۔

مصنف کندن لال کندن کی یہ کارکردگی سوز و ساز کی صناعی معلوم ہوتی ہے جس کا مقصد مع تقطیع تحصیل بحر و وزن میں آسانی پیدا کرتا ہے۔ اسی نظریے سے غزلیں بھی کہی گئی ہیں۔ عروض کے مخصوص نکات کو عام کر کے فن عروض کو دلچسپ جہات عطا کرنے کی یہ سعی جمیلہ ہے۔

عروضی فن کاری کے علاوہ کندن لال کے کلام میں حسن زبان بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ سادگی، روانی، چستی، بندش و ترتیب الفاظ، فصاحت، بلند آہنگی وغیرہ جیسے امتیازات کلام میں جا بہ جا جلوہ گر ہیں جو قادر الکلام اور کہنہ مشقی کی بین دلیلیں ہیں۔ موضوعات کی طرف متوجہ ہوں تو تصوف، حب الوطنی، انسان دوستی جیسی اعلیٰ قدروں کے علاوہ زندگی کی عطا کی ہوئی بے چینیاں اور حسن و عشق کے متعلقات کی جلوہ گری بھی دامن دل کو کھینچتی ہے۔ قابل دید تصوف کی گہرائی پر فرماتے ہیں:

نوائے نغمۂ دل کش ہو، ساز میں تم ہو! جھلک رہے ہو حسینوں کے ناز میں تم ہو!

تصوف کا ایک عقیدہ 'ہمہ اوست' کا ترجمان شعر ہے۔ جو کچھ ہے ذات اعلیٰ ہے، حقیقت کل ہے۔ باقی سب سراب و فسانہ!

یوں کائنات تک ذات باری کی مظہر ہے۔ 'ویدانت' کی یہ فلسفیانہ فکر شعرا کو مرعوب کرتی ہے۔ کندن کیسے مستثنیٰ رہتے۔ شعر انداز بیاں کی سادگی کے سبب فلسفیانہ خیال کو مترنم کر گیا ہے جس میں جمالیاتی مزاج کی تسکین بھی قابل داد ہے۔ اسی مضمون کو مقطع میں دوسرے پر لطف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کندن خود حسن مطلق کی جلوہ گاہ بننے کے متمنی ہیں، یعنی خدا اپنی ہستی کو انسانی میڈیا کے ذریعے واشگاف کرتا ہے، عمدہ مقطع ہے:

حجاب راز میں چھپنے نہ دے گا یہ کندن! کرو گے حشر بپا آ کے جو مجاز میں تم!

آگے استغنا کی صفت کا یہ اظہار کہ ''بندے کو ہر حال میں راضی برضا رہنا چاہیے۔'' شان محبوبی یہ کہ ''کوئی گلہ نہ کیا جائے۔'' غزل کی رسمیات میں اس ایک رسم کو کیا خوب فصیح انداز عطا کیا ہے:

تیرا گلہ کس لیے؟ تیرا گلہ کیوں کروں؟ وقت پہ سب کچھ دیا، مرحبا کیا کیا!

پھر 'روزالست' کی تلمیح کو موجودہ صورت حال سے منسلک کر کے وقت کے فاصلے کو ختم کر دینا اچھے شاعر ہی کا کمال ہوتا ہے۔ انسان ظالم ہے کہ وعدہ کرتا ہے وفا نہیں کرتا۔ نہ صرف دنیا کی نظر میں بلکہ خود کی نظر میں تماشا بن جاتا ہے۔ قابل دید شاعرانہ انداز قابل عبرت بھی ہے:

عہد کیا تھا یہی، تیرے ہی گن گاؤں گا! شرم و حیا بیچ کے خوب تماشا کیا!!

موجودہ بدترین صورت حال، انسان کے اعمال ہی کا نتیجہ ہے۔ چونکہ فقرا، اولیا، اور عارفین شراب معرفت پی کے کبھی دھمال نہیں کرتے۔ اس صوفیانہ وصف کے ذریعے صورت حال کا پس منظر دکھانے کے لیے تعلی کے انداز میں کیا خوب فرمایا ہے:

پی کے مے عشق جب مست ازل میں ہوا! میں نے، نہ کندن کبھی بھول کے غوغا کیا

یہ وہ تپسیا ہے، مراقبہ ہے، meditation ہے جو صوفیا کی صفت ہے، غیر محسوس طریقے پر ان نقلی عارفین اور سنتوں پر بڑا پر لطیف طنز کیا گیا ہے کہ مے عشق پینے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر مراقبے تک سے واقف نہیں ہوتے۔

'کب تک رہے' میں حالات کو بدلنے کی بات بڑے دل کش انداز میں کہی ہے۔ آسمان کو ہماری روایت میں 'مصائب اتارنے' کا ذریعہ مانا گیا ہے۔ آسمان ظالم ہے کہ تقدیر سب کھیل کرتی ہے مگر آسمان نامہربان کیوں ہے؟ انسان کا فرض ہے کہ وہ ناراضی کا سبب معلوم کرنے کے لیے خود احتسابی بھی کرے! یہ زیریں لہریں شعر کو معنی خیز بنا گئی ہیں۔ نامہربانی کی آتش فشانی کے سبب دنیا آتش فشاں بن گئی ہے۔ اس سیاست کو سمجھنا انسان کے لیے لازم ہے۔ اسی غزل میں پھر فرماتے ہیں:

آندھیاں، طوفان ہیں ہر گھڑی کندن جہاں! میرا نازک آشیاں دیکھیے کب تک رہے!!

کندن لال نے اپنی ذات کو اپنے آشیاں کے پردے میں نشانۂ ستم بنا کے پوری دنیا کے درد و کرب کے اظہار کے لیے بلیغ خود کلامی سے کام لیا ہے۔ مزید فرماتے ہیں:

بوجھنا ہے بوجھ لیں سب کچھ بتا سکتا ہوں میں! ہاتھ میں یہ جام جم دیکھیے کب تک رہے

'جام جم' کی تلمیح کے وسیلے سے شاعر نے علم و آگہی کا اظہار بہت دل کش پیرائے میں کیا ہے۔ جتنی بھی داد دی جائے کم ہوگی۔

ٹونک میں اردو کا فروغ

صفحات:271 قیمت:122 روپے
مصنف: سید ساجد علی ٹونکی
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر شفقت اعظمی 'دلکشا'، N-49، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

'ٹونک میں اردو کا فروغ' ساجد علی ٹونکی کی گیارہویں پیشکش ہے، جس کی محرک بقول مصنف، مختار شمیم کی کتاب 'ریاست ٹونک میں اردو شاعری' ثابت ہوئی، جس میں ٹونک کے علمی، ادبی، سیاسی اور تاریخی کوائف بھی پیش کیے گئے ہیں۔ اس طرح زیر تبصرہ کتاب کو مختار شمیم کی کتاب کی توسیع قرار دیا جاسکتا ہے۔

ریاست ٹونک کے قیام کے وقت دہلی اردو کا عظیم مرکز تھا، جہاں میر، سودا، درد و جرأت کی اقلیم سخن پر حکمرانی تھی۔ بلاشبہ 1857 دہلی میں اردو کا عہد زریں تسلیم کیا جاتا ہے لیکن مسلم دور حکومت کا سیاہ ترین باب بھی یہی دور ثابت ہوا۔ 1857 کی بربادی کا سب سے زیادہ فائدہ اسی ریاست کو پہنچا، جب دلی اجڑ رہی تھی، یہاں کے نابغۂ روزگار علما، فضلا، شعرا اور ادبا ہجرت کر کے ریاست ٹونک کی طرف کشاں کشاں چلے آرہے تھے جو اس پرآشوب دور میں بھی گہوارۂ امن بنا ہوا تھا۔ یہاں کی حکومت (عہد نوب وزیرالدولہ) مہاجرین و مجاہدین کی نصرت میں بڑی سیر چشمی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ 141 سال کی طویل مدت پر محیط ریاست ٹونک معارف پروری کا روشن منارہ بن چکا تھا۔ لیکن ملک آزاد ہوتے ہی اس ریاست کے علمی و ادبی منظر نامے پر زوال کی پرچھائیاں دراز سے دراز تر ہوتی چلی گئیں، اس لیے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مٹتی ہوئی قدروں کے تناظر میں اس کی تابناک تاریخ کو منضبط کر کے مصنف نے اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔

یعنی عرض مصنف کے بعد کتاب میں ٹونک کی مختصر تاریخ پیش کی گئی ہے جس میں اہم سرکاری عہدوں اور مصطلحات کی وضاحت بھی کی گئی ہے، مثلاً میر منشی، نائب منشی، وکیل بخشی، توشہ خانہ، میر عمارت، دفتر شاہ گرد پیشہ وغیرہ پھر سات نوابین کے تذکرے ہیں، جن کی علمی و فنی فتوحات پر تحقیقی روشنی ڈالی گئی ہے، اس کے بعد وہاں کے ممتاز ادارہ 'عربی و فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی اردو خدمات، کتب خانے، تعلیمی ادارے اور ان کی اردو خدمات، ٹونک کالج کی ادبی خدمات، ادبی انجمنیں، اردو مطبوعات کا مختصر تعارف، شعرائے ٹونک، اردو نثر نگار، اردو ڈرامے کا فروغ جیسے گوناگوں موضوعات کے تحت انتہائی عرق ریزی سے حاصل شدہ مواد اور حاصل مطالعہ کو حسن ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں شامل چند مضامین مختلف رسائل و جرائد کی زینت بن چکے ہیں، جنھیں مناسب حذف و اضافہ کے ساتھ اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ کتاب میں اردو کی ترقی میں درپیش مسائل اور انھیں دور کرنے کے وسائل کی طرف بھی واضح اشارے موجود ہیں جو بہرحال توجہ طلب اور قابل قدر ہیں۔ تمام تر کمال و جمال کے باوصف کمپوزنگ کی غلطیاں کھٹکتی ہیں مثلاً:

ص22، س2 پر صفدر کے بجائے سفدر لکھا ہوا ہے۔ ص55، س19: 'ایجاز البیان' کے بجائے 'ایجاز البیا' درج ہے۔ کمپوزنگ کی ترتیبی غلطیاں تو اور ستم ایجاد ہیں مثلاً: ص 163 پر اختر شیرانی کے کلام کی کمپوزنگ ترتیب (Composing setting) غیر مربوط ہے، یہی حشر کیف ٹونکی کے منتخب کلام کا بھی ہوا ہے (ص167)۔

ص91 پر یہ عبارت درج ہے:

''اب ہم ان پرائمری اسکولوں کا جائزہ لیں گے جہاں اردو ثانوی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔'' جبکہ ان کا تذکرہ تک نہیں کیا گیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ موضوع ان کے پروگرام میں شامل رہا ہو لیکن ڈاٹا کی عدم فراہمی کے سبب تشنۂ تکمیل رہ گیا ہو، بہرحال ایسی صورت میں مذکورہ عبارت حذف یا اس کی وضاحت کر دینی چاہیے تھی۔

مرکب الفاظ کے ٹوٹنے کی غلطیاں تو بار بار سرزد ہوئی ہیں۔ کمپوزنگ کی معقول ترتیب نہ ہونے کے سبب الفاظ کے نصف حصے پہلی سطر میں اور باقی نصف حصے دوسری سطر میں منقسم ہو گئے ہیں مثلاً: ص23، س21: امیر الدولہ، ص55، س7: نور الحسن، ص233، س1: فاضل الطب، س3: خزینۃ الخطوطات، س14: تعمیر حیات۔

ایسی اہم اور تحقیقی کتاب مصادر و مراجع سے معرا ہے، جبکہ مآخذ کی شمولیت سے ریسرچ اسکالرس کو مستقبل میں بڑی سہولت ہوتی اور بنیادی مآخذ تک انھیں پہنچنے میں آسانی ہوتی۔

بلاشبہ 'ٹونک میں اردو کا فروغ' انتہائی محنت، عرق ریزی نیز وسیع مطالعہ کی مظہر ہے جو اپنے موضوع سے بھرپور انصاف کرتی ہے، کتابت و طباعت شاندار، کاغذ معیاری نیز ٹائٹل دیدہ زیب و معنی خیز ہے۔ مواد، تنوع اور کتاب کا ظاہری حسن دیکھتے ہوئے قیمت برائے نام ہے۔ امید کہ نہ صرف ادب کے طلبہ، اساتذہ و محققین کے حلقوں میں اس کی بھرپور پذیرائی ہوگی بلکہ اسے وسیع پیمانے پر تعلیمی اداروں، دینی مدارس اور جامعات کی لائبریریوں کی زینت بنایا جائے گا اور اس طرح مصنف کے جذبۂ تصنیف و تحقیق کو مناسب داد مل سکے گی۔

ادراک معانی

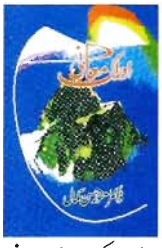

مصنف: ڈاکٹر منور حسن کمال
صفحات:176، قیمت:125 روپے
ناشر: مصنف
مبصر: رضی احمد ندوی، دہلی یونیورسٹی دہلی،

چند ایسی کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں جنھیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ مصنف نے نہ صرف یہ کہ موضوع سے انصاف کیا ہے بلکہ ایسے موضوع اور شخصیات جن پر ہزاروں کتابیں موجود ہیں نیا پن بھی عطا کیا ہے، منصور حسن کی یہ کتاب ایسے ہی علمی اور تحقیقی مواد سے مملو ہے۔ اس کا تعلق ادب، تخلیق، تنقید اور غزل کے علاوہ تاریخ ادب سے بھی ہے، جا بجا علم و ادب اور زبان و اسلوب سے بھی اس کتاب کی ہم رشتگی کا احساس ہوتا ہے۔

'ادراک معنی' ڈاکٹر منور حسن کمال کی تحقیقی و تنقیدی کتاب ہے، آج ایک وسیع حلقہ منور حسن کمال سے متعارف ہے، ان کی کئی کتابیں منظر پر آکر شرف قبولیت حاصل کر چکی ہیں، جن میں 'حضرت تھانوی: مختصر حالات، خدمات اور کارنامے' ادیب اور اردو گائڈ'، 'اردو کے چند نصابی شعرا'، 'تحریک خلافت اور جدوجہد آزادی'۔

منور حسن کمال نے اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، پہلا حصہ 'باب تاریخ' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے جو نہایت وقیع اور معلومات افزا پانچ مضامین پر مشتمل ہے۔

دوسرے حصے کو مصنف نے 'باب نقد' کے طور پر پیش کیا ہے اور اس حصے میں موصوف نے آٹھ شخصیات پر لکھے گئے مضامین کو جگہ دیتے ہوئے اس طرح کے عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ کتاب کے تیسرے حصے کو منور حسن نے 'باب غزل' کا نام دیا ہے، اور اس کے تحت شاعری کے حوالے سے بارہ اہم شخصیات، ان کی خدمات کا نہ صرف اعتراف کیا گیا ہے بلکہ مصنف نے ان پر مختلف پہلوؤں اور جہات سے روشنی ڈالتے ہوئے اپنے مقالے کو پرمغز بنا کر پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ اس سے ان کی ذہانت، بصیرت، شعر و نقد کی گرفت کے ساتھ اس سے ان کی غیر معمولی وابستگی اور لگاؤ کا اندازہ ہوتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں شاعری اور تنقید کے حوالے سے جن شخصیات پر گفتگو کی گئی ہے ان میں بہت سے ایسے ہیں جن پر بے شمار کتابیں اور مضامین تحریر کیے جا چکے ہیں اور وہ اپنی ایک شناخت بھی رکھتے ہیں لیکن کئی ایسے بھی ہیں جن پر ابھی گفتگو کے راستے وا نہیں ہوئے یا ہوئے بھی ہیں تو شاذ و نادر، لیکن منور حسن کمال نے نہ صرف یہ کہ ان کو جگہ دی بلکہ ان کی خدمات اور ادبی سفر پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، جو ماضی کی صرف

بازیافت ہی نہیں بلکہ روشن مستقبل کے امکانات کی جستجو بھی ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ منورحسن کمال نے شخصیات کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے ایسی چیزیں بھی پیش کی ہیں جو تاریکی میں گم تھیں اور جس کے بارے میں ہماری معلومات ناکافی ہیں۔ موصوف نے ان تمام پوشیدہ گوشوں کی عکاسی کسی حد تک کامیابی کے ساتھ کی ہے، ساتھ ہی اس کتاب کی تکمیل کے لیے جدید تحقیقی وتنقیدی مواد سے بھی استفادہ کیا ہے اس کے ساتھ ہی اپنی بات کو وضاحت کے لیے دلائل پیش کرنے کے علاوہ حسب ضرورت اقتباسات اور حوالے سے بھی کام لیتے نظر آتے ہیں۔

زیرتبصرہ کتاب کی ورق گردانی سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موصوف کا ذہنی وقلمی سفر ارتقا کی جانب رواں دواں ہے۔ ادب کو ادب کی اہمیت، تقاضے اور فنی لوازمات کے ساتھ برتنے کے عادی ہیں، البتہ کہیں کہیں شخصیت سے مرعوب نظر آتے ہیں۔

منورحسن کمال نے 'ادراکِ معانی' میں جو پہلا مضمون شامل کیا ہے وہ 'مظفرنگر کے تاریخی، تخلیقی رنگ و بوُ کے نام سے شامل ہے، اس مضمون میں انھوں نے مظفرنگر کی تاریخی، تہذیبی اور ادبی فضا و ماحول کو بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے، ساتھ ہی وہاں کے شعرا، دانش وروں اور ناقدوں کا تذکرہ بھی خوبصورت انداز میں کیا ہے، لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ ٹھیک اسی نام سے مصنف کی ایک دوسری کتاب زیرطبع کیا ہے، کیا بہتر ہوتا اگر کمال صاحب اس مضمون کو کتاب میں شامل نہیں کرتے تاکہ آنے والی کتاب کے تعلق سے قاری کی جستجو برقرار رہتی۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ کتاب اپنے آپ میں اہمیت کی حامل ہے، مواد اور اسلوب دونوں اعتبار سے یہ کتاب اہم ہے، منورحسن کمال کے اسلوب میں فصاحت اور سلاست تو ہے ہی اس کے علاوہ ایک عجیب قسم کی روانی بھی ہے، اور جہاں تک مواد کا تعلق ہے تو کتاب کے موضوعات ومشمولات اس کی شہادت کے لیے کافی ہیں، امید ہے کہ یہ کتاب قاری کو پسند آئے گی بالخصوص طلبا کے لیے کافی مفید، معلومات افزا اور معاون ومددگار ثابت ہوگی۔

شگوفہ (نصرت ظہیر نمبر)

مہمان مدیر: پروفیسر محمد ظفرالدین
صفحات: 180، قیمت: 100 روپے
ناشر: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال
مبصر: امتیاز وحید، C-90 (ڈاکٹر راہی)
ٹاپ فلور، مریم اپارٹمنٹ، شاہین باغ، نئی دہلی

ماہنامہ 'شگوفہ' نے ماہ اپریل کا شمارہ 'نصرت ظہیر نمبر' عصر حاضر کے نامور طنز ومزاح نگار، صحافی اور مترجم نصرت ظہیر کے نام مختص کرتے ہوئے اپنے 44 سالہ اشاعتی تسلسل میں خصوصی گوشوں اور خصوصی نمبر کی اپنی دیرینہ روایت کو آگے بڑھایا ہے، عصری ادبی منظرنامے میں 'شگوفہ' فکاہیہ ادب کا نمائندہ آرگن ہے بلکہ صحیح معنوں میں فی الوقت اس پہلو پر اس کی حیثیت مقدمۃ الجیش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے خصوصی شمارے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہے ہیں۔ اپنے طویل اشاعتی سفر میں 'شگوفہ' نے حیوان ظریف غالب، کنہیالال کپور، مجتبیٰ حسین، رشید احمد صدیقی، یوسف ناظم وغیرہ جیسے نابغۂ روزگار اہل قلم پر خصوصی شمارے شائع کیے ہیں۔ اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ شگوفہ کا معیار کیا ہے۔ شگوفہ کے 'نصرت ظہیر نمبر' کو انھی معیار بندی کے تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ خصوصی اشاعت کے لیے شگوفہ نے ایک طرح یہ بھی ڈالی ہے کہ اس مخصوص نمبر کا مدیر ایک ایسا شخص ہو جو اس پہلو کے بھی ابعاد سے پوری طرح واقف ہو لہٰذا 'نصرت ظہیر نمبر' میں مہمان مدیر کے بطور 'پروفیسر ظفرالدین' کا انتخاب شگوفہ کی اسی روایت کا حصہ ہے۔

موجودہ فکاہیہ منظرنامے میں نصرت ظہیر نمائندہ قلم کار کی حیثیت رکھتے ہیں جو کوئی تیس سال سے لکھ رہے ہیں، بلاشبہ وہ ایک چہار دانگ واقف کار قلم رکھتے ہیں جن میں سیاست، سماج اور کائنات میں بسنے والے مختلف ذی روح کی نفسیات بطور خاص انسانی معاشرت کے ناہموار اور متضاد رویوں کے بیان کی بھرپور صلاحیت ہے، شگوفہ کا یہ خصوصی شمارہ نصرت ظہیر کے فن اور ان کی شخصیت کے انھی اسرار ورموز پر روشنی ڈالتا ہے۔ ان کے فن پر پروفیسر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس، شجاع خاور، پروفیسر نثاراحمد فاروقی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، مجتبیٰ حسین، حقانی القاسمی، مناظر عاشق ہرگانوی، ظفر عدیم، ڈاکٹر شیخ عقیل اور سراج نقوی جیسے اہل قلم وناقدین نے لکھا ہے جن سے نصرت ظہیر کا قد، مزاح، مزاج، طنز اور ان کے تخلیقی رویوں کا علم ہوتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ کس طرح ایک انسان ہمہ آن اپنے کالم میں عصری مسائل سے الجھتا ہے اور انھی مسائل حیات کے بیچ قہقہے لگاتا اور قاری کو گدگداتا ہے۔

نصرت ظہیر کے ایک رفیق کار موہن چراغی نے لکھا ہے کہ نصرت ظہیر ''بے حد جذباتی بھی ہیں اور حساس بھی۔ معمولی سی چوٹ لگے آنسو بہہ نکلتے ہیں اور میں نے کئی بار ان کے یہ آنسو دیکھے ہیں۔'' یہ نصرت ظہیر کی سچی تصویر ہے۔ مزاح تطہیر قلب کا متقاضی ہے اور طنز طہارت باطن کا۔ ایک میلا انسان قلم سے صدق ووفا کی جوت نہیں جگا سکتا۔ نصرت ظہیر میں جو کشش ہے وہ طہارت باطن کی راہ سے ہوکر آتی ہے اس کا اعتراف شمارے میں شامل مضامین سے بخوبی ہوتا ہے۔ صحافت میں نصرت ظہیر نے جو راہ نکالی ہے وہ ان کی خود ساختہ راہ ہے۔ اس سے فنکار کے غیرتقلیدی رویے کا پتہ چلتا ہے۔ نصرت ظہیر نے کثرت سے لکھا ہے، پیروڈیاں لکھی ہیں، کالم ان کی تحریر کا محور ہے، جن میں انشائیوں کی چمک، تاثرات، رپورتاژ، روداد، سفرنامہ، ادبیت اور وسیع صحافیانہ بانکپن پایا جاتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ غالباً یہ ہے کہ نصرت ظہیر بیشتر اوقات اپنے من کی موج لکھتے ہیں۔ یہی ان کی تحریر کی معراج ہے۔ اسی خصوصی شمارے میں تین صفحات ان کی شاعری کے لیے بھی مختص ہیں، جن سے ان کے شعری ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ گرچہ ان میں 'بوئے اسداللّٰہی' اور '... جیسے شراب چواتے ہیں' والی ان کے کالم کی حرارت محسوس نہیں ہوتی، اس خصوصی شمارے میں ان کے کارٹون سازی کے شوقِ خاص کی بساط بھی بچھائی گئی ہے۔

'انتخاب مضامین نصرت ظہیر' کے تحت ان کے 19 منتخب مضامین بھی شامل اشاعت ہیں جن میں نصرت ظہیر کے فن کی عظمت پوشیدہ ہے گویا شروع کے نصف صفحات میں ناقدین نے فنکار کے جن فنی محاسن کو نمایاں کیا ہے یہ منتخب مضامین ان کی مثالیں اور نمونے کی تحریریں ہیں۔ البتہ اس خصوصی شمارے میں نصرت ظہیر کی ترجمہ نگاری کا کوئی سراغ نہیں ملتا جب کہ ان کے پہلے ترجمہ پر انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے بھی نوازا جاچکا ہے۔ اسی طرح نصرت ظہیر کے صحافتی عقدے بھی بہتر طور پر کھولے گئے ہیں جب کہ ان کی ادبی صحافت کا کوئی خاص تذکرہ نہیں کیا گیا ہے۔ نصرت ظہیر کا یہ پہلو بھی اتنا قابل اعتنا ضرور ہے کہ مذکورہ دونوں پہلوؤں پر کم ازکم دو مختصر تحریریں شامل ہونی چاہیے تھیں۔ بقیہ مشمولات لائق تحسین ہیں۔

مہمان مدیر کی حیثیت سے پروفیسر ظفرالدین کا اداریہ قابل مطالعہ ہے جو نصرت ظہیر کی ذات اور مجموعی رویے کی تفہیم میں معاون ہے۔ مہمان مدیر موصوف نے بجا طور پر نصرت ظہیر کو ایک 'خودساز شخصیت' بتایا ہے تاہم نصرت ظہیر کی شخصیت سازی کا فیض عام ہے۔ صحافت کی دنیا میں نہ جانے نصرت ظہیر نے کتنے ہیرے تراشے ہیں، اس کا اعتراف مہمان اداریہ سے بھی ہوتا ہے۔

شگوفہ کا یہ خصوصی شمارہ دراصل طنز وظرافت کے ایک کمیٹڈ قلم کار کی صلاحیتوں اور اس کے Contribution s کا اعتراف ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ شگوفہ کا یہ مستحسن قدم خود نصرت ظہیر کی زندگی ہی میں اٹھایا گیا ہے، اس لحاظ سے شگوفہ کی جملہ ٹیم قابل مبارک باد ہے۔ ■

ادارہ

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ نئی دہلی 110025

ایگزیکیوٹیو بورڈ کی XXXVII(37) ویں میٹنگ کی روداد

تاریخ: 25.06.2013 وقت: 11:00 بجے صبح مقام: بورڈ روم (فرسٹ فلور)، انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر 87-86 لودھی روڈ، نئی دہلی

میٹنگ میں موجود (دائیں سے) جناب (پروفیسر) علی گٹی مُسلیار، جناب پی کے ساہا، جناب نوین سوئی، قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی، پروفیسر اختر الواسع، جناب علیم الدین اسعدی، جناب وقار الدین، جناب (ڈاکٹر) محمد عبدالحلیم اظہری اور قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایڈمنسٹریشن) جناب کمل سنگھ

حاضرین:

1. پروفیسر وسیم بریلوی (وائس چیئرمین، این سی پی یو ایل)	: صدارت	2. جناب (ڈاکٹر) محمد عبدالحلیم اظہری	: ممبر
3. جناب (پروفیسر) اختر الواسع	: ممبر	4. جناب سید وقار الدین	: ممبر
5. جناب شیخ علیم الدین اسعدی	: ممبر	6. جناب (پروفیسر) علی گٹی مُسلیار	: مہمانِ خصوصی
7. ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام (ڈائرکٹر، این سی پی یو ایل)	: ممبر سکریٹری		

نمائندگانِ وزارت

1. جناب نوین سوئی، ڈائرکٹر، آئی ایف سی۔
2. جناب پی کے ساہا، ڈی ایس (لینگویجز) ایم ایچ آر ڈی

سب سے پہلے این سی پی یو ایل کے وائس چیئرمین نے ڈائرکٹر اور ایگزیکیوٹیو بورڈ کے اراکین کا خیر مقدم کیا، اس کے بعد سلسلے وار ایجنڈے کے نکات پر بحث ہوئی۔

آئٹم نمبر XXXVII.1: روداد کی توثیق۔

ایگزیکیوٹیو بورڈ کی مورخہ 10 جنوری 2013 کو منعقدہ میٹنگ کی روداد کی توثیق کی گئی اور جسے ریکارڈ میں رکھا گیا۔

آئٹم نمبر XXXVII.2: عمل آوری کی رپورٹ۔

ایگزیکیوٹیو بورڈ کی میٹنگ منعقدہ 10 جنوری 2013 کی روداد کا بغور مطالعہ کیا گیا اور اسے ریکارڈ کے لیے پیش کیا گیا۔

آئٹم نمبر XXXVII.3: کونسل کے سالانہ اکاؤنٹس کے ڈرافٹ پر غور کرنے اور اسے برائے 13-2012 منظور کرنا۔

ایگزیکیوٹیو بورڈ نے کونسل کے سالانہ اکاؤنٹس برائے 13-2012 کی فائنانس کمیٹی کی سفارشات کے مطابق توثیق کی۔

آئٹم نمبر XXXVII.4: کونسل کی سالانہ رپورٹ برائے 13-2012 کا مطالعہ اور منظوری بابت

کونسل کی سالانہ رپورٹ برائے 13-2012 کو ایگزیکیوٹیو بورڈ نے منظوری دی۔

نمائندگانِ وزارت نے یہ مشورہ دیا کہ اگلے سال سے رپورٹ کے سرورق اور اندرونی صفحات میں فوٹو گرافس بھی شامل کیے جائیں۔ ان کا خیال تھا کہ تصاویر نمایاں اور واضح ہونی چاہئیں۔

آئٹم نمبر XXXVII.5: کونسل کے کمپیوٹر سینٹرز CABA-MDTP کی اسکیم برائے موبائل کے ذریعے مونیٹرنگ سسٹم کے ڈیزائن اور فروغ کے سلسلے میں نیشنل انفارمیٹکس سینٹر (NIC) سے موصول ہوئی تجویز کا مطالعہ۔

اصولی طور پر اس تجویز کو منظوری دے دی گئی۔ مالی مسائل کے باعث یہ مشورہ دیا گیا کہ بعدازاں فائنس کمیٹی کی میٹنگ میں اس کی رپورٹ پیش کی جائے۔

آئٹم نمبر XXXVII.6: مولانا آزاد ایجوکیشنل فاؤنڈیشن (وزارت اقلیتی امور) حکومتِ ہند کی CABA-MDTP کے 100 مراکز بالخصوص مدارس اور اقلیتی اداروں کے مدِنظر این سی پی یو ایل کے اشتراک سے جاری کرنے کی تجویز کا مطالعہ

بورڈ کو مطلع کیا گیا کہ این سی پی یو ایل خصوصاً ملک کے مدارس اور اقلیتی اداروں کے لیے CABA-MDTP کے 100 مراکز کھولنے بابت مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن وزارتِ اقلیتی امور، حکومتِ ہند کے ساتھ ایک معاہدہ کرنے جارہا ہے، جو یہ اسکیم مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن (MAEF) وزارتِ اقلیتی امور حکومتِ ہند کے ذریعے عمل میں آئے گی۔ اس کے تمام اخراجات مولانا آزاد ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کے ذمّے ہوں گے۔ نمائندگانِ وزارت نے یہ مشورہ دیا کہ این سی پی یو ایل کے اخراجاتی سرٹیفکیٹ (utilization certificate) کی رسید کے مطابق MAEF پہلے اپنے فنڈز فراہم کرے۔

آئٹم نمبر XXXVII.7: جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے ساتھ CABA-MDTP کورس کی تجویز اور مطالعہ۔

اس تجویز کے تمام پہلوؤں پر بحث کی گئی اور کمیٹی نے اس تجویز کو این سی پی یو ایل کے ذریعے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر کو بھیجا تا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے ساتھ مل کر CABA-MDTP کورس کا اجرا کیا جاسکے۔ یہ مشورہ دیا گیا کہ کوئی دوسری باہری ایجنسی کی خدمات بھی اس پروگرام کے لیے لی جاسکتی ہیں۔ اس تجویز کو ایک ایجنڈے آئٹم کے طور پر ہندوستانی زبانوں کے فروغ کی کمیٹی کے سامنے پیش کیے جانے کا مشورہ دیا گیا۔

آئٹم نمبر XXXVII.8: اقلیتوں کے تعلق سے مختلف اسکیموں کے اطلاق والی ذیلی کمیٹی کے مختلف نکات پر عمل درآمد کا مطالعہ

آئٹم نمبر 1	نکتے	عمل درآمد
آئٹم نمبر 1	بیورو میں اردو زبان کو ایک علیحدہ مرتبہ دیا جانا چاہیے، جسے اردو بیورو کا نام دیا جاسکتا ہے	یہ طے کیا گیا کہ کوئی علیحدہ بیورو قائم نہیں ہوگا۔ یہ موجودہ صورت میں این سی پی یو ایل ہی کے طور پر رہے گا۔
آئٹم نمبر 2	این سی پی یو ایل کے پلان میں 60 کروڑ فنڈ اور 60 کروڑ نان پلان میں اضافے کی ضرورت ہے۔	کمیٹی نے پلان کے تحت موصول ہونے والے فنڈز کے بابت نمبر 23017/21/2012-1F-1، بتاریخ 06.05.2013 زیر MHRD مکتوب نمبر F.No. 3-8/2013-Language Coordination Cell بابت بتاریخ 10.05.2013 کے سلسلے میں وزارت اور اس کے عہدیداران کا شکریہ ادا کیا۔
آئٹم نمبر 3	ہر سال 100 نئے کمپیوٹر ٹریننگ کے مراکز کھولے جائیں۔	یہ مطلع کیا گیا کہ امسال 50 کمپیوٹر مراکز قائم کیے گئے۔
آئٹم نمبر 4	اردو تعلیمی کورس کے مراکز زیادہ سے زیادہ کھولے جائیں۔ اس ضمن میں جو تجاویز موصول ہوئی ہیں ان پر فوراً عمل درآمد کیا جائے۔	کمیٹی کو یہ مطلع کیا گیا کہ این سی پی یو ایل کے ذریعے درج ذیل مراکز کھولے گئے: اردو ڈپلوما-56 عربی ڈپلوما-26 عربی سرٹیفکیٹ-38 ایک ممبر نے یہ مشورہ دیا کہ اردو کے ساتھ فارسی کو بھی شامل کیا جائے۔ ڈائرکٹر نے یہ اطلاع دی کہ این سی پی یو ایل اردو زبان کے فروغ کے لیے ایک قومی نوڈل ایجنسی ہے تاہم اس تجویز کو پروگرام کمیٹی کے سامنے پیش کیا جائے گا۔
آئٹم نمبر 5	مختلف میٹنگوں کو منعقد کرنے اور ان کمیٹیوں کو سہولت کے ساتھ کام کرنے کے لیے NMCME کے بجٹ 32 لاکھ کو بڑھا کر ایک کروڑ کرنے کی درخواست۔	اور جیسے ہی کمیٹیوں اور اسٹینڈنگ کمیٹیوں کی میٹنگوں کے انعقاد کے لیے سالانہ بجٹ موصول ہوتا ہے، بجٹ میں اضافے کی تجویز پیش کردی جاتی ہے۔

آئٹم نمبر XXXVII.9: تکنیکی تعلیم کے بابت ذیلی کمیٹی کی میٹنگوں بالترتیب منعقدہ 07.05.2013 اور 10.05.2013 کی رودادیں برائے توثیق۔

تکنیکی تعلیم کے بابت ذیلی کمیٹی کی منعقدہ 7.05.2013 اور 10.05.2013 کی نشستوں کی روداد کی توثیق اور منظوری۔

آئٹم نمبر XXXVII.10: تخلیقی ادب پینل کی تشکیل کا مطالعہ۔

بورڈ نے وائس چیئرمین اور ڈائرکٹر این سی پی یو ایل کو تخلیقی ادب کے پینل کی تشکیل کے لیے اختیار دیا ہے کہ وہ افسانوی اور غیر افسانوی ادب، ناول، شاعری، مختصر افسانہ، ڈرامہ وغیرہ کے تعلق سے تجاویز کے تمام پہلوؤں پر غور کریں۔ اس کے تحت این سی پی یو ایل کی پہلے سے شائع شدہ افسانوی تحریریں شامل نہیں ہیں۔

آئٹم نمبر XXXVII.11:

اردو وِکی سائٹ (Urdu Wiki site) کے فروغ بابت۔

اصولی طور پر یہ منظور کرلیا گیا۔ بورڈ نے اس سے اتفاق کیا اردو وِکی سائٹ کو کونسل بہتر شکل دے گی۔ اس تجویز کے تحت NIC کی خدمات کو بھی مدِنظر رکھا جائے گا۔ اسے قائم ہونے کے ایک ہفتہ میں CDAC Pune بلا معاوضہ وِکی فریم ورک تیار کردے گا۔ وِکی سائٹ کے قیام کے بعد این سی پی یو ایل اپنے تمام مواد اس سائٹ پر مہیا کردے گا جو عام لوگوں کے لیے بے حد مفید ثابت ہوگا۔ این سی پی یو ایل اس مواد کو مہیا کرنے سے پہلے ہر طرح کی تصدیق کرے گا۔

آئٹم نمبر XXXVII.12:

DietY (وزارتِ اطلاعات) کے اشتراک سے نیشنل اردو پورٹل کو بہتر بنانا۔

بورڈ نے یہ منظور کیا کہ اردو سے متعلق بنیادی معلومات کے لیے نیشنل اردو پورٹل ناگزیر ہے۔ وزارتِ اطلاعات اور این سی پی یو ایل اس کے لیے فنڈ فراہم کرے گا اور جگہ NIC مہیا کرے گا۔

درج ذیل وہ ممکنہ پروگرام ہیں جسے نیشنل اردو پورٹل مہیا کرے گا:

- اردو سرچ انجن
- لغات/ یک موضوعی فرہنگیں
- اردو ڈِجٹل آرکائیوز
- ڈِجٹل دستاویزی مرکز
- قرطاسِ ابیض اور دستاویزات کی طباعت
- اینی میٹیڈ (ذی روح) بچوں کا ادب
- اردو کی انسائیکلوپیڈیا
- اردو آموزش سافٹ ویئر
- اردو کی بورڈ
- اردو فونٹس اور دیگر سافٹ ویئر اور مآخذ وغیرہ
- اصولی طور پر انھیں منظوری دی گئی۔

آئٹم نمبر XXXVII.13:

CDAC، پونا کے اشتراک سے اردو زبان کمپیوٹنگ میں مہارت پیدا کرنے کے لیے ایک مرکز کا قیام۔

وزارت کے نمائندے نے یہ مشورہ دیا ہے اس کی تجاویز اور پیش کردہ تفصیلات جن کا تعلق مقاصد اور فائدہ پہنچانے والے نیز مالی امور سے ہے، اگر ان میں کچھ دشواریوں کا امکان ہے تو اس سلسلے میں وزارت سے رابطہ قائم کیا جائے۔

آئٹم نمبر XXXVII.14:

مسودے کو مالی تعاون کی سفارش کرنے والی کمیٹی کی منعقدہ میٹنگ بابت مورخہ 08.01.2013۔

این سی پی یو ایل کی گرانٹ اِن ایڈ کمیٹی نے 08.01.2013 کو منعقدہ میٹنگ کی روداد جو منظور کرلی گئی اور جسے ریکارڈ کرلیا گیا۔ گرانٹ اِن ایڈ درج ذیل علیحدہ علیحدہ شق اساس جدول میں پیش ہے جسے منظور کیا گیا۔

کل منظور شدہ رقم کی شق وار تقسیم

شمار نمبر	تفصیلات	روپے
.1	71 سیمیناروں/ کانفرنسوں/ ورکشاپس/ مشاعروں کا انعقاد	47,15000/-
.2	01 سالانہ لیکچر سیریز کا انعقاد	25,000/-
.3	86 اردو مخطوطات کی خرید	23,05,674/-
.4	04 عربی/ فارسی مخطوطات کی خرید	1,07,655/-
	کل رقم	71,53,329/-

آئٹم نمبر XXXVII.15:

22.05.2013 کی گرانٹ اِن ایڈ کمیٹی کی منعقدہ میٹنگ کی روداد۔

گرانٹ اِن ایڈ کمیٹی کی 22.05.2013 کی منعقدہ میٹنگ کی روداد جسے منظور کیا گیا اور ریکارڈ کے لیے محفوظ کرلیا گیا۔

گرانٹ اِن ایڈ کی منظور شدہ رقم شق وار درج ذیل ہے:

کل منظور شدہ رقم کا شق وار جدول

شمار نمبر	تفصیلات	روپے
.1	62 سیمینار	44,30,000/-
.2	32 لیکچر سیریز	8,00,000/-
.3	39 اردو مخطوطات	7,89,111/-
.4	4 عربی/ فارسی مخطوطات	1,31,935/-
	کل رقم	61,51,046/-

آئٹم نمبر XXXVII.16:

بلک پرچیز اسکیم کے تحت کتابوں/ مجلّوں/ جریدوں (اردو، عربی اور فارسی) کی خرید کی سفارش کرنے والی کمیٹی کی منعقدہ میٹنگ بابت 06.01.2013 کی روداد۔

Bulk Purchase Committee کی منعقدہ میٹنگ بابت 06.01.2013 کی روداد، جسے منظور کرلیا گیا اور ریکارڈ کے لیے محفوظ کرلیا گیا۔

شق وار کل منظور شدہ رقم

شمار نمبر	کتاب	تعداد	رقم
.1	اردو کتب	160	2464150

.2	عربی وفارسی کتب	8	175500
	کل کتابیں	168	2639650
.3	اردو مجلّے	50	1009400
	کل رقم (کتابیں اور جرائد)		3649050

آئٹم نمبر XXXVII.17:

17.05.2013 کو منعقدہ بلک پرچیز کمیٹی کی میٹنگ کی روداد

قومی اردو کونسل کی کتابیں، مجلّے اور جرائد کی تھوک خریداری کی سفارش کرنے والی کمیٹی کی روداد جسے منظور کیا گیا اور ریکارڈ کے لیے محفوظ کیا گیا۔

شمار نمبر	کتابیں	تعداد	رقم
.1	اردو کتب	130	2057420
.2	عربی وفارسی کتب	4	27000
	کل کتابیں	134	2084420
.3	اردو جرائد	4	80000
	کل رقم (کتابیں اور جرائد)	138	2164420

آئٹم نمبر XXXVII.18:

این سی پی یو ایل میں موجودہ کام کے بارے نمٹنے کے لیے معاون اسامیوں کی توثیق اور منظوری بابت غور۔

یہ واضح کیا گیا ہے کہ این سی پی یو ایل کا قیام اردو زبان کے فروغ کے لیے 01.04.1996 میں عمل میں آیا تھا۔ اسامیوں کی کل تعداد 52 مختص کی گئی تھی۔ عربی اور فارسی زبانوں کے کاموں کی نگہداشت بھی گورننگ کونسل این سی پی یو ایل کے ایگزیکیوٹیو بورڈ کی منظور کردہ قرارداد کے تحت اس وقت تک قومی اردو کونسل ہی کے ذمے قرار دی گئی تھی جب تک کہ ان زبانوں کے علیحدہ علیحدہ آزاد ادارے قائم نہیں ہو جاتے۔ شروع شروع کونسل کے لیے مختص بجٹ 84 لاکھ روپئے تھا جو اب بڑھ کر 60 کروڑ روپئے ہو گیا ہے۔ بجٹ میں توسیع اس امر کی طرف واضح اشارہ کرتی ہے کہ کونسل کی کارکردگی میں ہمہ جہت اضافہ ہوا ہے۔ کونسل کے دائرۂ کار کی توسیع کے پیش نظر افراد کی شدید کمی محسوس کی جارہی ہے جس کی طرف وزارت کو بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ موجودہ 52 افراد کو 73 کر دیا جائے۔ منسوخ کردہ 21 عہدوں میں سے وزارت نے صرف 11 عہدوں کو ہی منظوری دی ہے جس سے کل تعداد 63 ہو سکی ہے۔ کونسل ایک ساتھ کئی اکادمیاتی پروگرام کا اجرا کرنے جارہی ہے جس میں اردو اور عربی کے مطالعاتی مراکز کا قیام، کمپیوٹر استعمال کرنے والوں کے لیے کمپیوٹر پروگرام کی تیاری (Computer Application) اور کثیر لسانی DTP مراکز کا قیام، خطاطی اور گرافک ڈیزائن کے مراکز کا قیام جیسے اہداف مقرر ہیں۔ اس طرح کے پروگرام کی ہر سال توسیع ہو رہی ہے اور جو بے حد مقبول عام ہیں۔ ملک کے مختلف علاقوں سے ان مراکز کے قیام کے لیے مسلسل درخواستیں موصول ہو رہی ہیں۔ جلد ہی فارسی زبان میں ڈپلوما کورس اور پیشہ ورانہ کورسیز بھی شروع ہونے والے ہیں۔ اس طرح ہر سال کونسل پر کام کا بوجھ بڑھتا جارہا ہے۔ صرف 63 عہدے بے حد نامناسب ہیں۔ مختلف کمیٹیوں میں اس مسئلے پر بحث ہوتی رہی ہے اور یہ طے پایا گیا تھا کہ جب تک کہ نئے عہدوں کو منظوری ملے اسٹاف کی کمی کو بطور معاہدہ افراد سے پُر کیا جائے۔ متعلقہ کمیٹی کی سفارش پر کونسل نے درج ذیل بطور معاہدہ خدمات حاصل کی ہیں۔

کونسل کے وسیع تر کاموں کی جانچ درج ذیل وزارت کی جانب سے قائم کردہ کمیٹیوں نے کی تھی اور رپورٹ بھی دی تھی۔ ہر کمیٹی/رپورٹ میں اضافی افرادی قوت منظوری کے لیے سفارش بھی کی ہے:

1. انڈین مینجمنٹ انسٹی ٹیوٹ (IMI) نئی دہلی 2. گوئل کمیٹی Ed.CIL.3

لہٰذا قومی اردو کونسل کے درج ذیل 52 اضافی عہدوں کی ضرورت ہے۔

شمار نمبر	عہدے کا نام	اضافی ضرورت
.1	ڈپٹی ڈائرکٹر	3
.2	اسسٹنٹ ڈائرکٹر	2
.3	ریسرچ آفیسر	2
.4	اسسٹنٹ ایڈیٹر	2
.5	سائنٹفک/ٹیکنیکل آفیسر	1
.6	ایڈمنسٹریٹیو آفیسر	1
.7	پرائیویٹ سکریٹری	1
.8	ریسرچ اسسٹنٹ	11
.9	آفس سپرنٹنڈنٹ	2
.10	آڈیٹر	1
.11	سائنٹفک/ٹیکنیکل اسسٹنٹ	2

.12	لائبریرین	1
.13	جونیئر اسٹینو (انگلش)	2
.14	پروف ریڈر	3
.15	یو.ڈی.سی./اے.سی.	9
.16	اردو ٹائپسٹ	8
.17	ہندی ٹائپسٹ	1
	کل	52

آئٹم نمبر XXXVII.19:

ڈی ڈی اے کے لیے آفس بلڈنگ کے لیز ایگری مینٹ کی دستاویز پر دستخط کے لیے این سی پی یو ایل کے ایک آفیسر کی نامزدگی۔

بورڈ نے ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، ڈائرکٹر نیشنل کونسل فار پروموشن آف اردو کو این سی پی یو ایل کی طرف سے ڈی ڈی اے کے ساتھ تصفیہ طلب درج ذیل دستاویزات پر دستخط کرنے کا اختیار دیا ہے:

1. لیز ڈیڈ 2. بلڈنگ کامپلیشن سرٹیفکیٹ

آئٹم نمبر XXXVII.20:

پلاٹ کے حصول اور آفس کی عمارت کی تعمیر اور این سی پی یو ایل اور این سی ای آر ٹی کی کتابوں کو اسٹور کرنے کے لیے کرائے کی جگہ کے حصول کے سلسلے میں مالی مسئلے جیسے امور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے غور وخوض۔

ایگزیکیوٹیو بورڈ کی طرف سے خرید کی تجویز کو قبول کیا گیا۔ یہ طے کیا گیا کہ اس تجویز کو کسی دوسرے اجلاس میں رکھا جائے گا۔ اس سلسلے میں وزارت کے ساتھ پہلے خط وکتابت کی جائے۔ اسی دوران یہ طے کیا گیا کہ مطلوبہ جگہ کو کرائے پر لینے کی راہ بھی تلاش کی جاسکتی ہے۔

آئٹم نمبر XXXVII.21:

اسامیوں کو پُر کرنے کے لیے ڈیپوٹیشن کالم کے تحت اضافی تعلیمی مطلوبہ لیاقت کی شرائط پر غور وخوض۔

پرنسپل پبلی کیشن آفیسر PB-3 میں گروپ A کا زیر غور عہدہ جس کا گریڈ Rs.15600-39100+Grade Pay Rs. 7600/- ہے۔ امیدواروں کی ناکافی شرکت اور ناکافی لیاقت کے باعث خالی ہے۔ اس کے لیے درج ذیل اشتہاری نوٹس میں R/R مطلوبہ لیاقت کی نشاندہی بھی کی گئی تھی۔ جن امیدواروں نے اس عہدے کے لیے شرکت کی تھی، تعداد کے لحاظ سے ناکافی تھے اور وہ مطلوبہ لیاقت کے مطابق بھی نہیں تھے۔ اس لیے کسی کا تقرر نہیں ہوسکا۔

A- آفیسرز آف دی سینٹر/اسٹیٹ گورنمنٹس ریسرچ ادارے/یونیورسٹیز/آٹونومس بوڈیز

1. باقاعدہ طور پر جس کا عہدہ مذکورہ عہدے کے برابر کا درجہ رکھتا ہو۔
2. کم از کم 5 سال کا تجربہ ہو اور 15600-39100+Grade Pay Rs. 6600/- کی شرح کے مطابق اسکیل ہو۔

B- ایم اے اردو، اشاعتی کاموں کا 10 سال کا تجربہ ہو اور کالم نمبر 7 کے تحت درج شدہ ملازمت کے شرائط کے مطابق ہو۔

بحث کے دوران یہ بات بھی سامنے آئی کہ R/R میں ترمیم کرکے اگر 5 سال کی شرط کردی جائے تو امیدواروں کی تعداد میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ اراکین کی اس رائے کو مان لیا گیا اور تجویز کو وزارت کے سامنے رکھنے کے لیے منظوری دے دی گئی تاکہ درج ذیل R/R ترمیمات کی جاسکیں۔

حوالہ نمبر	FOR	READ
بھرتی کے قاعدے کالم نمبر 7(2) کالم نمبر 11، A(i)	10 سال کا اشاعتی کام کا تجربہ مع ریسرچ یا معلّمی کا تجربہ، ادارت ترجمے کے کام، چھپائی کی تکنیک اور کتابوں کی اشاعت کا تجربہ باقاعدہ بنیاد پر برابر کے عہدوں پر مامور یا Rs. 15600-39100+Grade Pay Rs. 6600/- کے اسکیل پر کم از کم 5 سال ملازمت کی ہو۔	عام انتظامیہ کا 5 سال کا تجربہ مع ریسرچ، معلّمی، ادارت، ترجمہ/اشاعتی کام کا ترجمہ باقاعدہ بنیاد پر برابر کے عہدوں پر مامور رہا ہو، یا 3 سال کا تجربہ ہو جس کا اسکیل Pay band-3, Rs. 15600-3900+Grade Paym 6600/- کے مطابق ہو۔

آئٹم نمبر XXXVII.22:

ان نئے روایتی کورسیز کے مالیاتی ضابطوں پر غور وخوض، جو NVEQF کے تحت NGOs یا مطالعاتی مراکز چلاتے ہیں۔ ان میں Paper Machie (کاغذ کی لگدی کو مختلف صورتوں میں ڈھالنے کا فن جن پر نقاشی بھی کی جاتی ہے)، Brassware Manufacturing (تانبے اور جستے کی بنی ہوئی چیزوں کی صنعت) Creative Writing (تخلیقی تحریر کاری) اور سیاحت اور سیاحتی مینجمنٹ جیسے شعبے شامل ہیں۔

بورڈ نے آئٹم نمبر XXXIII.13 کی روداد بابت اجلاس منعقدہ 24.06.13 کے مطابق مالیاتی کمیٹی کی تجویز کی توثیق کی۔

یہ طے کیا گیا کہ نئے کورسیز کے شروع ہونے اور ان سے متعلق مالیاتی مسائل پیدا ہونے کے باعث یہ تجویز (CPIL) کونسل برائے فروغ ہندوستانی زبان کے سامنے رکھا جائے گا۔

صدر کے شکریے کے ساتھ یہ اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

پروفیسر وسیم بریلوی
وائس چیئرمین قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

یونیورسٹیوں کی اردو سرگرمیاں

سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد
ریسرچ اسکالرس سیمینار

حیدرآباد: جنوبی ہندوستان میں اعلیٰ اور معیاری تعلیم کی ایک اہم درسگاہ سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد ہے۔ اس یونیورسٹی کو ہندوستان کی جامعات میں ایک معیاری یونیورسٹی کا مقام حاصل ہے۔ یہاں کا شعبہ اردو بھی اپنی علمی وادبی کاوشوں کی بدولت ساری اردو دنیا میں ایک اہم شناخت رکھتا ہے۔ 3 جولائی 2013 کو شعبہ اردو سینٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد میں 'کاوش 2013' ریسرچ اسکالرس کا بین جامعاتی اردو سیمینار منعقد کیا گیا۔ سیمینار کا موضوع 'اردو تحقیق مسائل اور حل' تھا۔ اس سیمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت ڈین ہیومانیٹز پروفیسر امیتابھ داس گپتا نے کی۔ جبکہ بطور مہمان خصوصی ڈاکٹر محسن جلگانوی صاحب ایڈیٹر اوراق ادب، روزنامہ اعتماد

حیدرآباد مدعو تھے۔ اس اجلاس کے افتتاحی پروگرام کے خیر مقدمی خطاب میں کہا کہ تحقیق کی صفت، جستجو اور خوب سے خوب تر کی تلاش ہے۔ یہ سیمینار تحقیق کے عنوان پر تحقیق کاروں کے لیے تحقیق پر تحقیق کرنے کے لیے منعقد کیا گیا ہے اور یہ کام نئی نسل کے سپرد ہے کہ آج کی نئی نسل جس قدر اپنے مسائل کو پہچانتی ہے پرانے لوگ شاید نہ پہچانیں۔ سیمینار کے کنویز جے محمد شفیع نے سیمینار کے اغراض و مقاصد بیان کیے اور کہا کہ سیمینار کا مقصد اردو کے ریسرچ اسکالرس کے لیے ایک پلیٹ فارم مہیا کرنا ہے۔ افتتاحی اجلاس میں حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی کی ریسرچ اسکالر ثمیہ تمکین کی کتاب 'ناصر کاظمی کی شاعری میں پیکر تراشی' کا رسم اجرا وائس چانسلر پروفیسر راما کرشنا راما سوامی نے انجام دیا۔ انھوں نے افتتاحی سیشن کے اس پہلے اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کافی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اسی زبان نے انقلاب آزادی کا نعرہ بلند کیا اور ہمارے ملک کی آزادی میں ایک اہم رول ادا کیا۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر محسن جلگانوی نے اپنے خطاب میں کہا کہ سچائی کا کوئی نعم البدل نہیں اور تحقیق سچائیوں کی تلاش میں حقائق کو پانے کا نام ہے۔ افتتاحی اجلاس کے بعد مقالہ خوانی کا دور شروع ہوا۔ صدارت ڈاکٹر محسن جلگانوی اور پروفیسر محمد انورالدین نے کی اور نظامت شاہانہ مریم نے کی۔ پہلا مقالہ ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی صدر شعبہ اردو گری راج و گورنمنٹ ڈگری کالج نظام آباد نے 'جامعاتی تحقیق کے مسائل اوران کا حل' کے عنوان پر پڑھا۔ ڈاکٹر اسلم فاروقی اس سیمینار میں شعبہ اردو کے سینئر اسکالر کے طور پر شریک ہوئے۔ دوسرے اجلاس کے دیگر مقالہ نگاروں میں بدر فاطمہ، ناہید سلطانہ، غوثیہ بانو، عرفانہ بیگم، ثمیہ تمکین، سراج احمد شامل تھے۔ ڈاکٹر محسن جلگانوی نے اس اجلاس میں پڑھے گئے تمام مقالوں کا اپنے صدارتی خطاب میں جائزہ لیا۔ پرفیسر محمد انورالدین نے بھی صدارتی خطاب میں شعبہ اردو سے ریسرچ اسکالرس کے لیے رسالہ شائع کرنے اور تحقیقی مقالے لکھوانے کا مشورہ دیا۔ اس سیشن کی صدارت ڈاکٹر رضوانہ معین ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اردو اور ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی نے کی۔ پہلے مقالہ نگار محمد عبدالعزیز سہیل عثمانیہ یونیورسٹی نے 'انٹرنیٹ اردو تحقیق میں مواد کی فراہمی کا جدید ذریعہ مسائل اوران کا حل' کے عنوان پر پیش کیا۔ تیسرے سیشن میں جملہ 15 مقالے پڑھے گئے۔

محمد عبدالعزیز سہیل، ریسرچ اسکالر، (عثمانیہ)، حیدرآباد، 10 جولائی 2013

کشمیر یونیورسٹی میں پیپر ماشی پر دوروزہ ورکشاپ اختتام پذیر

سری نگر: کشمیر کے پیپر ماشی ہنر وصنعت کو فروغ دینے کے مقصد سے گزشتہ شنبہ کو ایک ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا۔ اس دوروزہ ورکشاپ میں ملک کے بڑے فنکار، ماہرین اور اسکالر کے ساتھ ساتھ ماہرین تعلیم نے ششماہی سرٹیفکیٹ کورس اور اس کے نصاب کو حتمی صورت دی۔ اِس دوروزہ ورکشاپ کا انعقاد ڈائرکٹر آف لائف لونگ لیننگ (ڈی ایل ایل)

یونیورسٹی آف کشمیر میں پیپر ماشی پر ورکشاپ کا منظر دائیں سے: ڈاکٹر جی ایچ میر، پروفیسر اے ایم شاہ، ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، خواجہ غلام علی گلزار، اعجاز خسرو

یونیورسٹی آف کشمیر اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے عمل میں آیا۔ اس موقعے پر پروفیسر اے ایم شاہ تعلیمی امور کے ڈین یونیورسٹی کے اہلکاروں سے عرض کیا کہ اس پروگرام کو وسعت دینے کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی اس کی جانکاری فراہم کی جائے۔ یہ ایک شروعاتی مرحلہ ہے پھر بھی ڈی ایل ایل اور این سی پی یو ایل کو اس پیش رفت کے لیے مبارک باد دی جانی چاہیے کیوں کہ اس طرح کے کورسیز کو عملی صورت دینا قابل تعریف ہے۔ اس کورس کو مزید فروغ دینے کے لیے فنکار اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کریں۔ یہ کورس بازار میں اپنی پہچان بنانے میں کارگر ثابت ہوگا۔ بشرطیکہ اسے بہتر ڈھنگ سے سکھایا اور پڑھایا جائے تاکہ صنعت وحرفت کی عالمی منڈی میں اپنا مقام متعین کر سکے۔ اس موقعے پر ڈائرکٹر ڈی ایل ایل ڈاکٹر جی ایچ میر نے کہا کہ بہت جلد اس پروگرام کو یونیورسٹی سے باہر متصل علاقوں تک بڑھایا جائے گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ کشمیر یونیورسٹی اس کمیونٹی اور اس ہنر کو سیکھنے والے کے درمیان بہتر تال میل قائم کرسکتی ہے۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ اس صنعت کا دھیرے دھیرے معدوم ہوجانا ایک تشویش ناک مسئلہ ہے جس کی بقا اور فروغ کے لیے ہمیں مل جل کر کوشش کرنی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ سی ڈی آئی کے ماہرین اور ایس سی بی ٹی کے فنکار و اہلکار بہت جلد نصاب کو ترتیب دیں گے اور اس کورس کا آغاز آئندہ ستمبر میں ممکن ہے۔

رائزنگ کشمیر، 7 جولائی 2013

عالمی اردو نامہ

قطر میں عزیز نبیل کو اعزاز

قطر: انجمن محبانِ اردو ہند، قطر کے زیر اہتمام بمقام گرانڈ ریگل (پانچ ستارہ) ہوٹل، ایک نہایت شاندار اور پروقار محفلِ شعر و ادب کا انعقاد گزشتہ جمعہ عمل میں آیا۔ یہ شاندار تقریب انجمن کے جنرل سکریٹری عزیز نبیل کے اعزاز میں اور فرسٹ سکریٹری برائے سفارت خانۂ ہند قطر جناب انیل نوٹیال کے الوداعیہ کے طور پر منعقد ہوئی۔ ابتدائی نظامت کرتے ہوئے انجمن کے نائب معتمد عمومی احمد اشفاق نے سب سے پہلے انجمن کے چیئرمین، معروف علمی و ادبی، ملی و سماجی شخصیت جناب حسن عبدالکریم چوگلے کو محفل کی صدارت کے لیے اسٹیج پر مدعو کیا۔ قطر میں سفارت خانۂ ہند سے تشریف لائے انسانی ہمدردی سے معمور شخصیت فرسٹ سکریٹری جناب انل نوٹیال نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی جب کہ معروف شاعر و ادیب مجلّہ دستاویز کے مدیر اعلیٰ عزیز نبیل مہمان اعزازی تھے جنھیں گزشتہ سال مہاراشٹر اردو اکادمی کی جانب سے

ماہنامہ پرواز (گوشۂ عزیز نبیل) کی رونمائی کا منظر

ساحر لدھیانوی ایوارڈ، اردو وراثت کا رواں کا نئی ادبی صلاحیت برائے شاعری کا قومی ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ تلاوت کلام اللہ کے بعد احمد اشفاق نے معروف صداکار عبید طاہر کو تقریب کی کارروائی سنبھالنے کے لیے مدعو کیا سب سے پہلے ماہنامہ پرواز لندن کے گوشۂ عزیز نبیل کی رونمائی عمل میں آئی۔ بعد ازاں بانی انجمن ابراہیم خان کمال نے عزیز نبیل کی شخصیت، فن اور ان کی ادبی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی اور مستقبل کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ مشاعرے کی باضابطہ نظامت کی باگ ڈور سنبھالتے ہوئے عبید طاہر نے اپنے منفرد انداز اور برجستہ گفتگو کے ذریعے مشاعرے کو کامیاب بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ مہمان اعزازی عزیز نبیل سمیت جن معتبر شعرائے کرام نے مشاعرے کو وقار بخشا ان کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں۔ محمد ممتاز راشد، شفیق اختر، ندیم ماہر، احمد اشفاق، منصور اعظمی، قیصر مسعود، زوار حسین زائر، اظہر ضیا، فیضی اعظمی، اطہر اعظمی، سعادت علی سعادت اور

جشن وسیم بریلوی

دوحہ، قطر: انڈیا اردو سوسائٹی-قطر کے زیر اہتمام، دوحہ شیراٹن ہوٹل کے 'الجلس' ہال میں 21 جون کو بوقت شب 8 بجے، عالمی یوم شاعری کی مناسبت سے 'جشن وسیم بریلوی' اور 'مشاعرہ 2013' منعقد ہوا۔ نظامت کے فرائض سوسائٹی کے بانی نائب صدر جناب عتیق انظر نے ادا کیے اور پروفیسر وسیم بریلوی کا استقبال کرتے ہوئے ان کی خدمت میں گلدستہ پیش کیا، مہاراشٹر (ہندوستان) سے تشریف لائے مہمان شاعر اور مشہور ناظم مشاعرہ جناب ابرار کاشف نے بڑے خوبصورت انداز میں شعرائے کرام کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ استقبالیہ کلمات، سوسائٹی کے صدر نشیں اور معروف سماجی شخصیت جناب عظیم عباس نے پیش کیے، آپ نے جشن اور مشاعرے کے اسپانسرز کا شکریہ ادا کیا اور صاحب جشن کی خدمت میں سوسائٹی کی جانب سے ایک لاکھ پچاس ہزار روپے کا چیک پیش کیا جس میں سے انھوں نے 50 فیصد رقم اتراکھنڈ ریلیف فنڈ کو بطور عطیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''اتراکھنڈ میں متاثر لوگوں کے غم میں شریک ہونا ہر فرد کی ذمے داری ہے۔'' بعد ازاں اتراکھنڈ میں قدرتی آفات سے جاں بحق ہونے والوں کی روحوں کی شانتی کے لیے دو منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی۔

دوحہ قطر میں جشن وسیم بریلوی کا خوبصورت منظر

سوسائٹی کے بانی صدر جناب جلیل نظامی نے اپنی تقریر میں جشن وسیم بریلوی پر روشنی ڈالی، آپ نے فرمایا کہ دوحہ میں شعرا کے جشن کا سلسلہ ختم ہوجانے کے بعد بڑی شدت سے اس کی کمی محسوس ہو رہی تھی، اسی خلا کو پر کرنے کے لیے اور فکشن نگار نہیں بلکہ شعرا کی پذیرائی کے لیے جشن وسیم بریلوی سے اس سلسلے کو دوبارہ شروع کیا جارہا ہے۔ آپ نے پروفیسر وسیم بریلوی کی شال پوشی بھی کی۔ جشن وسیم کے مہمان خصوصی، سفیر ہند برائے قطر عزت مآب سنجیو اردورہ نے بڑی شستہ اردو میں اردو زبان اور مشاعرے کی تعریف کی اور سوسائٹی کے ذمہ داران کو اس عظیم مشاعرے کے انعقاد پر مبارکباد پیش کی۔ آپ نے سوسائٹی کی جانب سے صاحب جشن کی ادبی خدمات کے اعتراف میں 'ایوارڈ برائے اردو شاعری 2013' پیش فرمایا۔ مہمان اعزازی عالی جناب موسی زینل موسی (مستشار برائے وزارت ثقافت وفنون) کے مبارک ہاتھوں سے سوسائٹی کی جانب سے مطبوعہ مجلّے کا اجرا عمل میں آیا۔ آپ نے سرزمین قطر پر شعرا کا پرجوش استقبال کیا اور فرمایا کہ بڑے بڑے شہنشاہوں کے نام و نشان مٹ جاتے ہیں زمانہ انھیں طاق نسیاں پر رکھ دیتا ہے لیکن شعرا اور ادبا ہمیشہ عوام کے دل و دماغ میں محفوظ رہتے ہیں، جیسے شیکسپیئر، احمد شوقی اور ٹیگور وغیرہ۔ صاحب جشن پروفیسر وسیم بریلوی نے اپنے صدارتی خطبے میں بڑی نپی تلی گفتگو فرمائی، ادبی تنظیموں کے مابین اختلافات کو آپ نے منفرد انداز سے دیکھا اور ان کے مثبت رخ سے سامعین کو روشناس کرایا۔ آپ نے مشاعرے کے حوالے سے فرمایا آپ نے اب تک لاتعداد مشاعرے پڑھے ہیں۔ لیکن بہت کم ایسے مشاعرے دیکھنے کو ملے جن کا آہنگ شروع سے اخیر تک قائم رہا اور ہر شاعر کو دلچسپی سے سنا گیا، سوسائٹی کا یہ مشاعرہ میری زندگی کا یادگار مشاعرہ ہے۔ اس مشاعرے کو کامیاب اور یادگار بنانے میں، مشہور اور تجربہ کار ناظم مشاعرہ جناب منصور عثمانی نے کلیدی رول ادا کیا۔ مندرجہ ذیل شعرا نے اپنے کلام سے مشاعرے کو اعتبار و وقار بخشا۔ پروفیسر وسیم بریلوی، منصور عثمانی، جوہر کانپوری، جلیس شیروانی، شکیل اعظمی، ساگر ترپاٹھی، نصرت مہدی، سردار سلیم، ابرار کاشف، شبینہ ادیب، آلوک سریواستو، ندیم شاد، جلیل نظامی، عتیق انظر اور رویس ممتاز۔

پریس ریلیز: جلیل نظامی، دوحہ قطر، 21 جون 2013

انور کریم۔ تقریب کے اختتام پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے عزیز نبیل نے انجمن کو اپنے عزم اور حوصلہ کا مصدر قرار دیتے ہوئے انجمن کے ایک ایک فرد کا شکریہ ادا کیا مہمان خصوصی انیل نوٹیال نے عزیز نبیل کو ان کی کامیابیوں کے لیے مبارکباد پیش کی اور نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے اپنی عزت افزائی پر انجمن کا شکریہ ادا کیا۔ صدر تقریب جناب حسن عبدالکریم چوگلے نے انجمن کی جانب سے اردو کے فروغ میں کی جانے والی کوششوں کو بہت اہم قرار دیا، اور کامیاب اور معیاری پروگرام پر اراکین انجمن کو مبارکباد پیش کی، مہمان اعزازی جناب انل ناٹیال کی خدمتِ انسانیت کے جذبے کا سلام کرتے ہوئے عزیز نبیل کی کامیابیوں پر خوشی کا اظہار کیا اور کہا یہ تو ابھی ابتدا ہے عزیز نبیل کو ابھی آگے بہت آگے تک جانا ہے۔ تقریب کے آخر میں شکریہ کے کلمات انجمن کے نائب میڈیا سکریٹری جناب نیاز احمد نے پیش کیے۔ روزنامہ 'صحافت' دہلی، 6 جولائی 2013

'حلقۂ دانش' جدہ کے زیر اہتمام محفل سخن

حلقۂ دانش، جدہ کے زیر اہتمام مقامی ہوٹل میں محفل سخن کا انعقاد کیا گیا۔ یہ محفل حلقۂ دانش کے ادبی و شعری سفر میں ایک نئے سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ حلقۂ دانش کے تحت 4 برس قبل ادب کے کچھ چاہنے والوں نے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس دوران شعر و ادب کی خوش رنگ کونپلیں پھوٹتی رہیں جن کی خوشبو نہ صرف جدہ اور مملکتِ سعودی عرب بلکہ بیرونِ ملک بالخصوص وطنِ عزیز کے چمن زار ادب کو مہکا رہی ہے۔ حلقۂ دانش کے مشاعرے میں جدہ اور بیرونِ شہر سے آئے ہوئے 26 سے زائد شعرائے کرام اپنی نشستوں پر متمکن تھے اور افق ادب سے اترے ستاروں کی جگمگاتی کہکشاں کا منظر پیش کر رہے تھے۔ دوسری طرف تشنگانِ سخن بھی کثیر تعداد میں موجود تھے۔ شب ساڑھے 10 بجے تقریب کا آغاز ہوا۔ نظامت کے فرائض اشفاق بدایونی نے انجام دیے۔ تلاوت کلام پاک کا شرف قاری محمد آصف کو حاصل ہوا۔ نعت طیبہ کے لیے معروف نعت خواں محمد نواز جنجوعہ کو دعوت دی گئی۔ انھوں نے اپنی خوبصورت اور مترنم آواز میں نعت پاک پیش کی۔ حمد و نعت طیبہ کی برکتوں سے فیض یاب ہونے کے بعد شمعِ محفل روشن کی گئی۔ اشفاق بدایونی نے صدرِ محفل، ہندوستان کے معروف شاعر رباب رشیدی کو مسندِ صدارت پر تشریف لانے کے لیے مدعو کیا ہے۔ مہمان خصوصی پاکستان کے ویلفیئر قونصلر کسیم الحق حقی تھے۔ حلقۂ دانش کے اساسی رکن شاعر قمر حیدر قمر کو بطور میزبان مسند پر آنے کی دعوت دی گئی۔ اشفاق بدایونی نے تقدیم و تاخیر کی روایت کے برعکس شعرا کو حروفِ تہجی کے اعتبار سے بلایا۔ یوں سب سے پہلے اس شاعر کو دعوت دی گئی جن کا نام 'الف' سے شروع ہوتا ہے۔ انور حسین، احمد محروم، انور انصاری، تبسم عارفی، ڈاکٹر توقیر حیدر، زوار قمر عابدی، زمرد سیفی، سہیل جدی، شرافت چاندپوری، عمران اعوان، رباب رشیدی، قمر حیدر قمر وغیرہ نے اس مشاعرے میں اپنے اشعار سے چار چاند لگائے۔ اردو نیوز، ہفتہ، 22 جون 2013

واشنگٹن میں پروفیسر نارنگ کو استقبالیہ

واشنگٹن: گزشتہ روز امریکی دارالحکومت واشنگٹن میں مشہور و معروف دانشور، صاحبِ طرز، نقاد، محقق، ماہر لسانیات پروفیسر گوپی چند نارنگ کو پرجوش استقبالیہ دیا گیا۔ سول کی 'عالمی تحریکِ تحفظ اردو' کی خاتونِ اوّل محترمہ یاسمین نغمی نے اس موقعے پر کہا کہ گوپی چند نارنگ کی مقناطیسی شخصیت کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے واشنگٹن کی تمام ادبی انجمنوں کو ایک چھت کے نیچے یکجا کر دیا ہے۔ پروفیسر نارنگ آسمانِ ادب کے چاند ہیں، آج یہ ہمارے اجلاس میں آئے تو دیکھ لیجیے امریکی دارالحکومت کے سخن وروں، ادیبوں اور دانشوروں کی کہکشاں چھت کے نیچے اتر آئی ہے۔ حلقۂ ارباب ذوق شمالی امریکا کے صدر ڈاکٹر ذوالفقار علی کاظمی نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ بلوچستان سونے چاندی اور قیمتی معدنیات کے خزانوں سے بھرپور ہے لیکن سب سے انمول خزانہ تو وہی ہے جو گوپی چند نارنگ کے نام سے 1931 میں ظاہر ہوا۔ ڈاکٹر کاظمی کے اس بلیغ جملے کی تفسیر یہ ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ 1931 میں بلوچستان میں ڈکی کے مقام پر پیدا ہوئے۔

جناب حفیظ الحق پروفیسر نارنگ کو پلیق پیش کرتے ہوئے — دائیں سے بائیں ڈاکٹر عبداللہ، یاسمین نغمی، ابوالحسن نغمی، پروفیسر نارنگ اور ستیہ پال آنند

مقبول شاعرہ اور 'ادبی مرکز' کی ترجمان، محترمہ مونا شہاب نے اس اجلاس میں گلدستہ پیش کیا اور انھوں نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کو حکومتِ پاکستان کی جانب سے 'ستارۂ امتیاز' ملنے پر پرجوش مبارکباد دی۔ واشنگٹن کی ادبی انجمن 'بزمِ سخن' کے بانی اور صدر محترم جعفر امام نے اظہارِ عقیدت کے طور پر گلدستہ پیش کیا اور پروفیسر نارنگ کی علمی و ادبی خدمات کو پرزور الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ اردو شعر و سخن کی عالمی انجمن گہوارہ ادب کی واشنگٹن شاخ کی جانب سے محترم حفیظ الحق نے پلیق پیش کیا، جس میں پروفیسر نارنگ کی لسانی اور ادبی خدمات پر انھیں نہایت اثر انگیز الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ اس اجلاس کی نظامت محترمہ یاسمین نغمی نے کی اور نظامت کے دوران انھوں نے شال کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ جن کاندھوں پر پروفیسر نارنگ نے اردو کی اَن تھک خدمت کا بوجھ اٹھا رکھا ہے میں ان شانوں کو شال اڑھانے کی عزت حاصل کر رہی ہوں۔ نہایت تواتر اور مستقل مزاجی کے ساتھ ماہانہ ادبی اجلاس کا اہتمام کرنے والی واشنگٹن کی سب سے پرانی انجمن 'حلقۂ ارباب ذوق شمالی امریکا' کے بانی جناب کفایت رحمانی نے پروفیسر نارنگ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے　　بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس اجلاس کی صدارت علی گڑھ المنائی ایسوسی ایشن کے حوالے سے معروف، اردو زبان کے سرگرم رکن محترم ڈاکٹر عبداللہ نے فرمائی جنھوں نے پروفیسر نارنگ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ پروفیسر نارنگ نے انتقاد میں ایک منفرد اسلوب اختیار کیا اور انھوں نے تنقیدی عمل کو تخلیقی عمل کی منزل تک پہنچایا۔ اجلاس میں پروفیسر ڈاکٹر محمد معظم صدیقی، پروفیسر ستیہ پال آنند بھی موجود تھے۔ اجلاس کے اختتام کے بعد متعدد کتابوں کے مصنف محترم عبیدالرحمٰن، ایڈووکیٹ نے اپنی کتاب 'خیالات پریشاں' پروفیسر نارنگ کو پیش کی۔ وہ واشنگٹن کے جن اصحاب و احباب سے ملے۔ ان میں حلقہ ارباب ذوق کے سیکریٹری پروفیسر ظہور ندیم، پروفیسر کمال ابدالی اور بیگم ریحانہ ابدالی، محترم عزیز قریشی، محترم عبدالرحمٰن صدیقی اور کراچی المنائی کے حوالے سے معروف محترم نعیم اللہ قاضی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ اس اجلاس میں ایک طویل عرصے کے بعد محترمہ شاہدہ کرمانی کو دیکھا گیا اور ان کی شمولیت پر لوگوں کو بے حد مسرت ہوئی۔ اس اجلاس کی ترتیب و تشکیل نظم و ضبط کے لیے سول کی جانب سے محترمہ عترت علی، محترم نور نغمی، محترم فواد حسن نغمی اور محترم قمر عباس کا شکریہ ادا کیا گیا اور سول کی جانب سے سید مبشر علی کا خصوصی شکریہ ادا کیا گیا۔

پریس ریلیز، ایم وقار، ایڈیٹر (SOUL)، واشنگٹن، 14 جون 2013

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبر نامہ

مرکزی حکومت ضلعی سطح پر پہلی جماعت سے لے کر 12 ویں جماعت تک کے اقلیتی طلبہ کے صحیح اعداد و شمار جمع کرائے، قومی اقلیتی نگراں کی قائمہ کمیٹی میں تعلیمی اصلاح سے متعلق اور بھی کئی اہم سفارشات، رپورٹ کے اردو ترجمہ کی رسم اجرا

نئی دہلی: 8 جولائی، حال ہی میں وزارت برائے ترقی انسانی وسائل کے قائم کردہ 'قومی تعلیمی اقلیتی نگراں' قائمہ کمیٹی نے اپنی رپورٹ مرکزی وزیر جناب ایم پلم راجو کو پیش کی تھی۔ انگریزی میں پیش کی گئی اس رپورٹ کا اب اردو ترجمہ بھی منظر عام پر آ گیا ہے۔ انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام منعقد ہوئی ایک اہم میٹنگ میں رپورٹ کے اردو ترجمے کی رسم اجرا کمیٹی کے چیئرمین جناب سراج حسین اور کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس موقعے پر وزارت کے افسران کے علاوہ پدم شری پروفیسر اختر الواسع، نیشنل انسٹی ٹیوٹ فار اوپن اسکولنگ (NIOS) اور سی بی ایس ای کے افسران نے بھی شرکت کی۔ میٹنگ میں غیر منظور شدہ مدارس کو (NIOS) سے جوڑے جانے پر غور و خوض کیا گیا اور یہ فیصلہ لیا گیا کہ غیر منظور شدہ مدارس کے طلبہ بھی اب نویں اور دسویں جماعت کے امتحانات دے سکیں گے، اس کے لیے دو پرچے زبانوں کے ہوں گے، جب کہ پانچ مضامین ووکیشنل تعلیم کے ہوں گے تاکہ غیر منظور شدہ مدارس کے طلبہ قومی دھارے سے جڑ سکیں۔ میٹنگ میں لڑکیوں کی تعلیم، ہنرمندی کے کورسیز اور دیگر پیشہ ورانہ تعلیم پر بھی غور و خوض کیا گیا۔ میٹنگ کی غرض و غایت بتاتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے کہا کہ قومی اقلیتی تعلیمی نگراں قائمہ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں اقلیتوں کی تعلیم، مدارس اور اردو تعلیم سے متعلق متعدد سفارشات حکومت کو پیش کیں۔ آج کی یہ میٹنگ اسی سلسلے کا ایک حصہ ہے۔ رپورٹ میں اقلیتوں کی تعلیمی اصلاح سے متعلق جو سفارشات پیش کی گئی ہیں ان کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:

کمیٹی کی پہلی سفارش ہے کہ حکومت موجودہ DISE (District Information System for Education) یعنی ضلعی پروجیکٹ کے تحت درجہ ایک سے درجہ آٹھ تک، اور Secondary Education Management Information System (SEMIS) پروجیکٹ کے تحت درجہ نویں سے درجہ بارہویں تک مذہبی اقلیتوں کے اعداد و شمار جلد از جلد جمع کرائے کیونکہ موجودہ اعداد و شمار ناقص ہیں۔

کمیٹی نے وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے علاوہ دیگر وزارتوں یعنی صحت اور خاندانی بہبود کی وزارت، (پیرا اور پیرا میڈیکل کورسیز)، زراعتی ریسرچ، ٹیکسٹائل بالخصوص فیشن ٹکنالوجی کی وزارتوں سے مل کر کام کرنے کی سفارش کی ہے، تاکہ اقلیتی طلبہ کو جدید کورسیز سے جوڑا جا سکے۔

کمیٹی نے انٹرمیڈیٹ کے بعد کی معلومات جمع کرنے کے لیے ایک سسٹم تیار کرنے کی بھی سفارش کی ہے، تاکہ داخلے کا مکمل ڈاٹا بینک تیار ہو سکے۔ اتر پردیش میں پرائمری سے اپر پرائمری اسکولوں میں جانے والوں کی تعداد کی کمی پر کمیٹی نے سخت تشویش ظاہر کی ہے۔ سال 2012-13 میں یہ تعداد محض 70.7 تھی، بعض ریاستوں میں پرائمری درجات میں جانے والے بچوں کی تعداد میں ہونے والی کمی کی وجوہات کی تفصیلات نہ ہونے کا بھی شکوہ کیا ہے۔ وزارت فروغ انسانی وسائل سے ضلعی سطح کے اعداد و شمار کا تجزیہ کرنے اور ریاستی حکومتوں سے مل کر اس مسئلے کو حل کرنے کی پرزور سفارش کی ہے۔

اسی طرح کمیٹی نے سروشکھا ابھیان کے تحت مدارس و مکاتب کو مالی امداد جاری کرنے کی سفارش کی ہے۔ کیونکہ RTE, Act 2009 کے تحت مدارس و مکاتب کو خارج کر دیا گیا تھا اور ان کی مالی امداد بھی بند کر دی گئی تھی۔ کمیٹی نے اسے جاری رکھنے کی سفارش کی ہے اور اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ متعدد علاقوں میں اردو میڈیم اسکول نہیں ہیں۔ بہت سے والدین اردو سیکھنے کے لیے اپنے بچوں کو مدارس بھیجتے ہیں لہٰذا ان مدارس کی مالی امداد کو بند نہ کیا جائے۔

کمیٹی نے دس فیصد تک کی اقلیتی آبادی والے اضلاع میں کستوربا گاندھی بالیکا ودیالیہ قائم کرنے کی سفارش کی ہے، کیونکہ یہ ودیالیہ اب تک ان علاقوں میں قائم کیے گئے تھے جہاں مذہبی اقلیتوں کی آبادی 25 فیصد سے زیادہ ہے۔ اردو آبادی والے علاقوں میں اردو میڈیم اسکول نہ ہونے پر بھی کمیٹی نے سخت تشویش ظاہر کی ہے اور یہ سفارش کی ہے کہ اسکولوں کے قیام کے ساتھ ساتھ باصلاحیت اردو اساتذہ کی تقرری اور نصابی کتابوں کی فراہمی کو بھی یقینی بنایا جائے۔

اردو میڈیم اساتذہ کی تربیت کے لیے Teachers Training اسکول قائم کیے جائیں اور تربیت یافتہ اردو اساتذہ کا ایک قومی رجسٹر تیار کیا جائے تاکہ کسی ریاست میں تربیت یافتہ ٹیچر نہ ہونے کی صورت میں دوسری ریاست سے اس کمی کو پورا کیا جا سکے۔

وزارت نے نجی و سرکاری شراکت پروگرام کے تحت 2500 ماڈل اسکول قائم کرنے کی ایک اسکیم تیار

مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل ایم پلم راجو کو قومی تعلیمی اقلیتی نگراں قائمہ کمیٹی کی رپورٹ پیش کیے جانے کا منظر

قومی اردو کونسل نے پوری اردو دنیا میں ایک نئی تاریخ رقم کی ہے

اردو فونٹ اور ''اردو کی بورڈ مینیجر'' کی اجرا سے اردو حلقوں میں زبردست خوشی کی لہر

نئی دھلی: مرکزی وزیر مواصلات کپل سبل نے 12 جولائی کو ایک پروقار تقریب کے دوران ''اردو کی بورڈ مینیجر'' اور اردو فونٹ میں نسخ کے 12 فونٹس اور ایک نستعلیق فونٹ کا اجرا اپنے ہاتھوں سے کیا۔ جس سے اردو زبان میں موبائل فون، لیپ ٹاپ، کمپیوٹر اور ونڈو فون پر اردو زبان میں استعمال کی راہ ہموار ہوگئی ہے اور اردو زبان پر جدید تکنالوجی کے دروازے کھل گئے ہیں۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ میں یہ یادگار لمحہ ہے جس کے بارے میں خود مرکزی وزیر کپل سبل نے کہا کہ وہ اس تاریخی دن کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے اور آج اس انتظار کی گھڑیاں ختم ہوگئیں۔ انھوں نے اپنی تقریر میں جس بات پر زور دیا وہ یہی کہ اردو زبان ہندوستانی تہذیب کی روح ہے۔ اس لیے اس زبان کی جتنی آبیاری کی جائے گی یہ زبان اتنی ہی خوشبو بکھیرے گی۔ پریم چند، آنند نرائن ملا، فراق گورکھپوری اور علامہ اقبال ایسی ہی شخصیات ہیں جنھوں نے اس تہذیب کو فروغ دیا اور اپنی خوشبو سے ملک کی فضا کو معطر کیا۔ دہلی اس تہذیبی میراث کا سب سے بڑا مرکز ہے اس لیے اب ہم اس تہذیب کو تکنیک کے ذریعے بھی پہنچان سکیں گے۔ انھوں نے کہا کہ آکاش ٹبلیٹ کی رسائی اردو کی رسائی اور اس کا فروغ ہے اور اب آکاش ٹبلیٹ کا استعمال کرنے والے نہ صرف اردو فونٹ اور ''کی بورڈ'' سے فائدہ اٹھا سکیں گے بلکہ اس میں اردو کے ذخیرے موجود ہوں گے۔ اپنی تقریر میں وزیر موصوف نے اس کارنامے کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین، وائس چیئر مین پروفیسر وسیم بریلوی اور کونسل کے دیگر اراکین عملہ کے ساتھ ساتھ سی ڈیک پونے کے عہدے داران و افسران کا بھی شکریہ ادا کیا اور ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کی۔

کپل سبل اردو فونٹ اور 'اردو کی بورڈ مینیجر' کا اجرا کرتے ہوئے۔ ساتھ میں پروفیسر وسیم بریلوی ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، پروفیسر اختر الواسع علیم الدین اسعدی وغیرہ

قومی اردو کونسل اور سی ڈیک پونے کی اس مشترکہ کوشش کی ستائش اردو حلقوں میں بھی ہو رہی ہے۔ انڈین کاؤنسل فار کلچرل ریلشنز کے نائب صدر اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے اس کارنامے کے لیے پہلے تو کونسل کو مبارک باد پیش کی اور پھر کہا کہ اردو زبان میں جدید تکنالوجی سے وابستہ ہونے کی تمام تر صلاحیتیں موجود ہیں لیکن انھیں استعمال میں لانے کی متحدہ کوششیں نہیں کی گئی ہیں۔ کونسل نے یہ انقلابی قدم اٹھا کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو زبان مستقبل میں بھی استفادہ کرتی رہے گی۔ معروف اردو ادیب و انکم ٹیکس کمشنر سید محمد اشرف نے بھی کونسل کے اس قدم کی بھرپور ستائش کی ہے۔ تکنالوجی کے میدان میں ہو رہی نت نئی تبدیلیوں سے ہر کوئی استفادہ کرے گا۔ انھوں نے کہا کہ اردو فونٹ اور'' کی بورڈ'' دستیابی نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری اردو دنیا کے لیے ایک تاریخی قدم ہے اور اس قدم سے اردو کے لیے جدید تکنالوجی سے جڑنے کی مزید راہیں ہموار ہوئی ہیں۔ اس تاریخی دن کے تعلق سے کچھ اسی قسم کے ملے جلے الفاظ معروف اردو ادیبہ کامنا پرساد کے ہیں ان کا کہنا ہے کہ کونسل کے اس قدم سے نئی اردو نسل کو ایک نیا حوصلہ ملے گا اور موجودہ اردو نسل مایوسی کے حصار سے باہر نکل سکے گی۔ تقریب کے دوران اس تحریک کے روح رواں ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اب ہم پاکستان کے محتاج نہیں ہوں گے کیونکہ اب تک ہم اردو والے اس قسم کے سافٹ فیئر کے لیے پاکستان کے محتاج تھے لیکن اب اردو فونٹ اور'' کی بورڈ'' سے اب ہماری یہ ضرورت پوری ہوگئی ہے انھوں نے کہا کہ یہ فونٹ اور کی بورڈ urdu.tdil-dc.in, tdil-dc.in یا urducouncil.nic.in پر دستیاب ہے اس سلسلے میں کسی طرح کی مدد کے لیے کونسل سے کسی بھی وقت رابطہ کیا جا سکتا ہے۔ پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 13 جولائی 2013

کی ہے لہٰذا 250 اسکول مذہبی اقلیتوں کے لیے مختص کیے جائیں۔ اسی طرح 33% لڑکیوں کے ریزرویشن میں اقلیتی فرقے کے لڑکیوں کو بھی اس اسکیم کا فائدہ پہنچایا جائے۔

11 ویں پنج سالہ منصوبے کے تحت وزارت نے 538 لڑکیوں کے لیے ہاسٹل قائم کیے ہیں جن میں کچھ کستور با گاندھی بالیکا ودھیالیہ کے ساتھ مل کر قائم کیے گئے ہیں۔ اس لیے کمیٹی نے یہ سفارش کی ہے کہ 90 اقلیتی اضلاع کے 100 لڑکیوں کی گنجائش والے کم از کم دو ہاسٹل قائم کیے جائیں۔

رپورٹ میں اعلیٰ تعلیم کے شعبے میں اقلیتی طلبہ کے کم تناسب پر سخت تشویش ظاہر کی گئی ہے، کمیٹی نے اعلیٰ تعلیم میں اقلیتوں کی شمولیت بڑھائے جانے نیز 90 اقلیتی اضلاع میں ماڈل ڈگری کالج قائم کرنے اور انھیں سو فیصد گرانٹ فراہم کرنے کی سفارش کی ہے۔

اسی طرح کمیٹی نے یو جی سی کے ذریعے چلائے جا رہے پروگراموں میں اقلیتی طلبہ کے حصے داری کو یقینی بنائے جانے اور انھیں وظائف دیے جانے کی سفارش کی ہیں۔ تاہم کمیٹی نے سائنس، کامرس، انجینئرنگ، تکنیک تک کی تعلیم اور پیشہ وارانہ تعلیم کو اقلیتی آبادی والے اضلاع میں فروغ دینے پر بھی زور دیا ہے۔

کمیٹی نے غیر امداد یافتہ مدارس میں دو پہر کا کھانا بچوں کو فراہم کرنے کی سفارش کی ہے۔ گیارہویں منصوبہ میں SPQM اسکیم کے تحت مدرسوں کو 350 کروڑ روپے کا فنڈ حکومت نے فراہم کرایا تھا لیکن بہت سی ریاستوں میں یہ فنڈ ریاستی حکومتوں کی جانب سے تقسیم نہیں ہوا تھا، کمیٹی نے مرکزی حکومت سے سفارش کی ہے کہ وہ ریاستی حکومتوں کو فنڈ جاری کرنے کی ہدایات جاری کرے۔

اسی طرح SPQM اسکیم کے تحت گریجویٹ اساتذہ کی تنخواہ -/6000 سے بڑھا کر -/8,000 اور پوسٹ گریجویٹ اساتذہ کی تنخواہ -/12,000 سے بڑھا کر -/15,000 کرنے کی کمیٹی نے سفارش کی ہے۔

کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں حکومت کی تمام تعلیمی اسکیموں کے بارے میں اقلیتی علاقوں میں بیداری پیدا کرنے کی بھی سفارش کی ہے۔ اور اس بیداری کے لیے اردو اخبارات، اردو ٹی وی چینلز، ویب سائٹس اور سوشل میڈیا کی مدد لینے پر بھی زور دیا ہے۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 9 جولائی 2013

عربی زبان کا جو حق ہے، وہ اسے ملنا چاہیے: اختر الواسع

نئی دھلی: اردو کی ترقی وفروغ کے لیے عربی وفارسی لازم وملزوم ہیں، کیونکہ اردو کی جڑیں ان دونوں زبانوں میں پیوست ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت ہند نے عربی وفارسی زبان کو کلاسیکل لنگویج کے زمرے میں شامل کر کے اس کے فروغ کی ذمے داری بھی قومی اردو کونسل (این سی پی یو ایل) کو سونپی ہے۔ آل انڈیا ایسوسی ایشن آف عربک ٹیچرس اینڈ اسکالرس کے زیر اہتمام تیار کردہ عربک ویب سائٹ کا افتتاح کرتے ہوئے اردو کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ اکرام الدین نے آج یہاں فروغ اردو بھون میں منعقدہ ایک تقریب میں ان خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا ملک بھر میں قائم اردو کونسل کے تقریباً ایک ہزار سینٹروں میں اردو کی ترویج واشاعت کے ساتھ عربی وفارسی ڈپلومہ کورسیز میں 25 ہزار طلبہ وطالبات زیر تعلیم ہیں۔ خواجہ اکرام الدین نے کہا کہ ایسوسی ایشن کے اشتراک سے کونسل عربی اور فارسی کے فروغ کے لیے بھی مزید سرگرم طریقے پر کام کرے گی۔ انھوں نے اردو کی طرز پر آن لائن عربک لرننگ سائٹ بنانے کی پرزور وکالت کی۔ پروفیسر اختر الواسع نے اپنے صدارتی خطبے میں ویب سائٹ کی لانچنگ کے لیے عربک ٹیچرس ایسوسی ایشن کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس تنظیم نے ویب سائٹ لانچ کر کے اسے آفاقی بنا دیا ہے۔ انھوں نے اس ویب سائٹ کے ایک سیکشن کو روزگار کے مواقع سے واقفیت کرانے کے لیے مختص کرنے کا بھی مشورہ دیا، تاکہ ہونہار اور باصلاحیت فارغین اس سے استفادہ کرسکیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ عربی زبان کا جو حق ہے وہ اسے ملنا چاہیے۔ قبل ازیں ایسوسی ایشن کے قیام اور عربک ویب سائٹ کی لانچنگ کے اغراض ومقاصد بیان کرتے ہوئے پروفیسر نعمان خان صدر ایسوسی ایشن نے کہا کہ تنظیمی سطح پر عربی زبان کو ترویج واشاعت کو فروغ دینے کی غرض سے یہ اقدامات کیے گئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ عربی زبان دنیا کی مقبول ترین زبانوں میں شامل ہے کیونکہ یہ پوری دنیا میں بولی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت ملک کی تقریباً 22 یونیورسٹیوں میں عربی زبان ادب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ

آل انڈیا ایسوسی ایشن آف عربک ٹیچرس اینڈ اسکالرس کے زیر اہتمام عربک ویب سائٹ کونسل کے ڈائرکٹر اجرا کرتے ہوئے

ملک کے تمام مدارس میں عربی پڑھائی جاتی ہے۔ تنظیم نے ملک کے مختلف شہروں میں مفت عربی تعلیم کا سلسلہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جدید ٹکنالوجی کی طرف ہماری پیش قدمی کا یہ پہلا قدم ہے۔ ڈاکٹر رضوان الرحمٰن نے ویب سائٹ کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ ابتدائی ویب سائٹ ہے جس میں آئندہ مزید توسیع کی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ اگلے دو تین دنوں میں عربی ویب سائٹ باقاعدہ طریقے سے کام کرنا شروع کردے گی۔ قابل ذکر ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، جواہر لال یونیورسٹی، سمیت مختلف یونیورسٹیوں کے پروفیسروں اور اساتذہ نے آل انڈیا ایسوسی ایشن آف عربک ٹیچرس اینڈ اسکالرس نام سے ایک کل ہند تنظیم قائم کی ہے اور اسی تنظیم نے یہ ویب سائٹ تیار کی ہے۔ تقریب کی نظامت ڈاکٹر نعیم الحسن اثری، شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی نے کی۔ قبل ازیں ڈاکٹر ولی اختر ندوی نے گلدستہ پیش کر کے صدر تقریب پروفیسر اختر الواسع کا استقبال کیا، جبکہ پروفیسر حبیب اللہ خاں نے کلمات تشکر پیش کیے۔ اس موقعے پر ایسوسی ایشن کے خازن ڈاکٹر فوزان، راجوری، یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے صدر ڈاکٹر شمس کمال انجم، شعبہ عربی ذاکر حسین دہلی کالج کے اساتذہ قاسم عادل، مفتی عبید اللہ، قومی کونسل کے ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ، قاسم انصاری، فیاض عالم کے علاوہ متعدد یونیورسٹیوں کے اساتذہ، ریسرچ اسکالر وطلبہ موجود تھے۔

روزنامہ انقلاب، دہلی، 9 جولائی 2013

اردو کتابوں کی موبائل وین بیجاپور میں

بیجاپور: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی حکومت ہند کے شعبۂ فروغ انسانی وسائل کے زیر اہتمام ملک بھر میں اردو کتابوں کی فروخت کے لیے گشت کر رہی موبائل وین تاریخی شہر بیجاپور پہنچی تو مقامی انجمن ڈگری کالج کیمپس میں کالج کے پرنسپل جناب ایڈی گولنگد اور کالج کے عملہ نے وین کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ کل 1100 ٹائٹل پر مبنی اس وین میں اردو ادب، تاریخ انسائیکلوپیڈیا، عربی وفارسی زبان والی اور دیگر نایاب کتابیں موجود ہیں جو اردو دانوں کو اپنی جانب راغب کر رہی ہیں۔ سارا دن وین انجمن کیمپس میں اپنے اردو کاروبار میں مشغول رہی تاہم تعلیمی اداروں کی چھٹی کے سبب فروخت اطمینان بخش نہ رہنے کے سبب کالج کے پرنسپل جناب نولگند نے اردو دوستی کا غیر معمولی ثبوت دیتے ہوئے کالج لائبریری کے لیے ہزاروں روپے کی کتابیں خریدیں۔ مذکورہ

وین کے ذریعے فروخت ہونے والے اردو کتابوں کی فروخت پر 20,25 اور 40 فیصد رعایت ہے جو 22 مئی کو جامع مسجد میں اپنا کاروبار چلائے گی جس کے بعد شہر کے دیگر علاقوں اور اداروں میں گشت کرے گی۔ اس موقعے پر وین انچارج جناب وی صدیق نے نامہ نگار سالار کو بتایا کہ وین کو دہلی چھوڑے ایک مہینہ کا عرصہ ہوا جو آندھرا پردیس کے شہر حیدرآباد اور دیگر شہروں سے ہوتے ہوئے کرناٹک کے علاقوں میں فروخت کے بعد یادگیر سے بیجاپور پہنچی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ گلبرگہ میں 50 تا 60 ہزار روپیوں کی کتابیں فروخت ہوئیں اور امید کی جاتی ہے کہ اردو کے شہر بیجاپور میں ایسا ہی تعاون ملے گا۔ یہاں سے وین تملناڈو جائے گی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر علیم اللہ، پروفیسر دولت کوٹی، ابوبکر مومن، ڈاکٹر رفیق پٹھان، کڈگی، قدیر احمد وغیرہ موجود رہے۔

روزنامہ سالار، بنگلور، 22 مئی 2013

قومی اردو کونسل کے تعاون سے

پنجابی یونیورسٹی میں توسیعی خطبہ

پٹیالہ: تصوف مذہب کی حدود سے آگے جا کر صلح کُل کی ایک آفاقی تحریک ہے، اس تحریک نے امنِ عالم کو بنانے کے لیے ہر دور میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار رضا لائبریری رام پور کے ڈائریکٹر پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین نے کیا۔ پنجابی یونیورسٹی کے بابا فرید صوفی سینٹر اور قومی اردو کونسل، نئی دہلی کے

باہمی اشتراک سے 20 جون کو منعقدہ توسیعی خطبے میں پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین نے وحدت الوجود اور تصوف کی معنویت کو واضح کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ صوفیائے کرام نے ہر زمانے میں ہندوستان کو جوڑنے کے عملی اقدام کیے ہیں جب کہ پڑھے لکھے کہے جانے والے لوگوں نے سیاسی طور پر ہندوستان کو تقسیم کیا ہے۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر جپال سنگھ نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ صوفی ازم سکھ ازم سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ انھوں نے گورو گرنتھ صاحب کے حوالے سے کہا کہ اس گرنتھ میں ہر مذہب کے روحانی بزرگوں کی بانیاں شامل ہونا وحدت الوجود کی بہترین مثال ہے۔ صوفی سینٹر کے ڈائریکٹر پروفیسر ناشر نقوی نے اس بات پر فخر کیا کہ پنجابی یونیورسٹی ایشیا کا پہلا تعلیمی ادارہ ہے جہاں بابا فرید کے نام سے اکادمک سطح پر تصوف کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ یونیورسٹی کے ڈین کالجز پروفیسر جمشید علی خان نے صوفی سینٹر کی اکادمک سرگرمیوں کی تفصیل پیش کی۔ پنجاب کے سابق اسپیکر سردار بیر دوِندر سنگھ نے کہا کہ پنجاب کو اس روحانیت پر ناز ہے کہ ہر صبح گورودواروں سے بابا فرید کے روحانی کلام کا پاٹھ کیا جاتا ہے، یہی پنجاب اور تصوف کے قریب ہونے کی سب سے بڑی مثال ہے۔ اس موقعے پر صوفی سینٹر کی ششماہی میگزین 'گنج شکر' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

پریس نوٹ: ڈاکٹر ناشر نقوی، پٹیالہ، پنجاب 21 جون 2013

اتر پردیش اردو میڈیم اسکولوں کی ضرورت، مسائل اور ازالہ

دیوریا: اتر پردیش میں اردو میڈیم اسکولوں کی ضرورت، مسائل اور ان کا ازالہ کے موضوع پر یہاں ہونے والے ایک سیمینار میں مقررین نے کہا کہ مادری زبان میں تعلیم کا بندوبست کرنا حکومت کی ذمے داری ہے۔ اس کی ضمانت دستور ہند میں دی گئی ہے اور حق تعلیم قانون (آر ٹی ای) میں بھی اس کی ضرورت بتائی گئی ہے، لہٰذا پرائمری، جونیئر، ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ سطح پر اردو میڈیم کے اسکول و کالج قائم کرنا ریاستی حکومت پر لازم ہے۔ مقررین نے اردو کو ہندوستانی تہذیب وثقافت اور تاریخ کا ایک اہم جزو قرار دیتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کی سرزمین پر جنم لینے والی اس زبان کو کسی مذہب سے جوڑنا ناانصافی ہے۔ سیمینار کا انعقاد سائنٹفک ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی دیوریا نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے تعاون سے کیا۔ نظامت کے فرائض شفیق الرحمان شفق نے انجام دیے۔ انجمن اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول، مالویہ روڈ، دیوریا میں منعقد ہونے والے اس سیمینار صدر جلسہ اور ایس ڈبلیو ایچ ڈگری کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ضیاء الدین خاں وارثی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ جن علاقوں میں اردو بولنے والوں کی خاطر خواہ تعداد موجود ہے وہاں حکومت کو انٹرمیڈیٹ تک اردو میڈیم کے اسکول قائم کرنے چاہئیں اور سائنس و ریاضی سمیت سبھی علوم کی تعلیم اردو میں دینے کا بندوبست کرنا چاہیے۔ مہمانِ خصوصی اور سینئر صحافی قطب اللہ نے اردو زبان کے تحفظ اور فروغ پر زور دیتے ہوئے کہا کہ دیوریا کی سرزمین بہت زرخیز ہے اور یہاں سے کئی کامیاب تحریکیں اٹھی ہیں۔ انقلاب کے بیورو چیف فضل الرحمٰن نے کہا کہ اردو کے سلسلے میں جہاں اتر پردیش میں قائم ہونے والی مختلف حکومتوں اور بیوروکریسی نے تعصب کا مظاہرہ کیا، تو وہیں اہل اردو نے بھی مواقع کا بھرپور استعمال کرنے میں کوتاہی کا مظاہرہ کیا، اردو کو اپنے گھروں سے نکال دیا۔ سیمینار

سائنٹفک ایجوکیشنل ویلفیئر سوسائٹی دیوریا کی جانب سے منعقد سیمینار میں اسٹیج کا ایک منظر

کے کنوینر ظہیر الباری نے مہمانوں اور حاضرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ اردو میڈیم اسکولوں کا قیام وقت کی ضرورت ہے۔ ادارہ کے منیجر ڈاکٹر ذاکر حسین نے حکومت سے مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ سیکنڈری درجات تک ہندی کے ساتھ 30 نمبر کا ابتدائی اردو مضمون نصاب تعلیم میں شامل کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ یوپی مادھیمک شکشا پریشد سے اردو میڈیم اسکولوں کو منظوری دی جائے، اس سلسلے میں قانون میں ترمیم کی فوری ضرورت ہے۔ گورکھپور سے آئے قاضی عبدالرحمٰن نے کہا کہ اردو صرف ایک زبان نہیں، ایک تہذیب کا نام ہے، اس کی حفاظت سب کی ذمے داری ہے۔ سماجوادی پارٹی کے لیڈر ہردے نارائن جیسوال نے کہا کہ اردو اور ہندی کی ترقی کے لیے انگریزی کی مخالفت ضروری ہے۔ وجے بہادر ایڈوکیٹ نے کہا کہ کسی زبان کو کسی خاص طبقہ یا مذہب سے نہیں جوڑا جانا چاہیے۔ ارشاد احمد کامل نے آزادی سے قبل کی لسانی سیاست کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے ساتھ تعصب کا مظاہرہ کیا گیا۔ ایپوا کی لیڈر پریم لتا پانڈے نے کہا کہ کسی زبان کی مخالفت کر کے ہم دوسری زبان کی ترقی نہیں کر سکتے، ہر زبان کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ انجمن کے صدر بسم اللہ منالاری، مارکسی لیننی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر رام کشور ورما وغیرہ نے بھی خطاب کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' گورکھپور، 9 جولائی 2013

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی :

مذہبی رواداری کی ضرورت پہلے سے زیادہ: نائب صدر جمہوریہ

نئی دھلی: آج کی دنیا میں رواداری کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے کیونکہ رواداری کے بغیر دنیا میں تہذیب وتمدن اور انسانیت کی بھی نہیں ہے اور اہم بات ہے کہ تقریباً سبھی مذاہب رواداری کی تعلیم دیتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار یہاں نائب صدر جمہوریہ ہند جناب حامد انصاری نے ایک تقریب میں کیا۔ مذکورہ تقریب کا انعقاد ڈاکٹر زینت شوکت علی کی لکھی گئی کتاب "Healing Memories - Civilization in Dialogue" کے اجرا کے سلسلے میں کیا گیا تھا۔ کتاب کا اجرا نائب صدر جمہوریہ ہند نے کیا۔ تقریب میں ماہر تعلیم جناب پی اے انعام دار نے مہمان کے طور پر شامل تھے۔ قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر زینت شوکت علی نے اپنی اس کتاب میں اس بات پر زور دیا ہے کہ دنیا میں تہذیبوں کا بقا رواداری سے بھی ممکن ہے۔ اس تقریب میں جن معروف شخصیتوں نے حصہ لیا اس میں قومی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین ڈاکٹر وجاہت حبیب اللہ، ہمدرد یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر جی این قاضی، مولانا آزاد فاؤنڈیشن کے چیئرمین وزیر احمد انصاری، قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی اور ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، دہلی اقلیتی کمیشن کے سینئر ممبر سردار پشپندر سنگھ، راشٹریہ لوک دل کے دہلی یونٹ کے جنرل سکریٹری جاوید اقبال خاں، روزنامہ 'سائبان' کے چیف ایڈیٹر جاوید رحمانی، ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ، روزنامہ 'آفتاب ہند' کے ایڈیٹر ایم جے انصاری اور اوکھلا ٹائمس پورٹل کے ڈائرکٹر اسد اور دیگر کے نام قابل ذکر ہیں۔

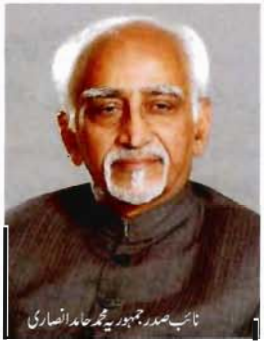
نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 25 جون 2013

مولانا آزاد یونیورسٹی ملک بھر میں اردو میڈیم اسکول کھولے گی

نئی دھلی: اردو زبان کی حالت زار کسی سے پوشیدہ نہیں ہے جب کہ اردو کے لیے بہت کام کیا جارہا ہے لیکن بنیادی طور پر اردو زبان کو زندہ رکھنے کے لیے کوئی ٹھوس کام نہیں ہوا ہے، اردو یونیورسٹی کا قیام بھی عمل میں آچکا ہے لیکن اردو میڈیم اسکولوں کی اب بھی کمی پائی جاتی ہے۔ اردو زبان کو بنیادی سطح پر فروغ دینے کے لیے ہم ملک میں اردو میڈیم اسکول کھولنا چاہتے ہیں۔ یہ بات مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے وائس چانسلر پروفیسر محمد میاں نے نئی دہلی میں ایک تقریب کے بعد نمائندہ انقلاب سے خصوصی گفتگو میں کہی۔ وائس چانسلر نے بتایا کہ جو طلبہ طالبات یونیورسٹی میں داخلہ لیتے ہیں ان میں یا تو مدارس کے طلبہ ہوتے ہیں یا وہ ہوتے ہیں جنھوں نے کبھی اردو میں تعلیم حاصل نہیں کی، اکثر طلبہ ایسے ہیں جن کی تعلیم اردو سے نہیں ہوئی لہٰذا ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ اردو میڈیم اسکول پہلے قائم ہونے چاہیے تاکہ ایک تسلسل قائم ہو، ان حالات کو دیکھتے ہوئے مولانا آزاد اردو یونیورسٹی حیدرآباد نے ملک بھر میں اردو میڈیم اسکول قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ شیخ الجامعہ محمد میاں نے بتایا کہ فی الوقت مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کے تین اردو میڈیم اسکول چل رہے ہیں جہاں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا نصاب پڑھایا جاتا ہے۔ ان میں ایک ہریانہ کے نوح، دوسرا اتر پردیش کے سنبھل اور تیسرا اسکول مغربی بنگال اور بہار کی سرحد آسنسول میں ہے، اس کے علاوہ کشمیر کے سری نگر میں بھی اردو میڈیم اسکول کا سنگ بنیاد رکھا جاچکا ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اردو میڈیم اسکولوں میں پرائمری اور مڈل تک دینیات لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جائے گی۔ انھوں نے بتایا کہ 'کستوربا گاندھی بالیکا ودیالیہ' کے طرز پر یونیورسٹی اس بات پر بھی غور کررہی ہے کہ طالبات کے لیے جو اردو میڈیم اسکول قائم کیے جائیں وہ 'رہائشی اسکول' ہوں تاکہ طالبات کے سرپرستوں کو روزانہ اسکول بھیجنے کی زحمت نہ ہوں اور اس اسکول میں تعلیم تو مفت ہوگی ساتھ ساتھ ہاسٹل فیس میں بھی خصوصی رعایت دی جائے گی۔ پروفیسر محمد میاں کے مطابق اردو میڈیم اسکول ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ دیگر زبانوں کی تعلیم نہیں دی جائے گی بلکہ اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی کی تعلیم بھی دی جائے گی۔

پروفیسر محمد میاں

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 19 جون 2013

دہلی یونیورسٹی اقلیتی زبانوں کا خیال رکھے: وجاہت حبیب اللہ

نئی دھلی: قومی اقلیتی کمیشن نے دہلی یونیورسٹی کو ہدایت جاری کی ہے کہ وہ اپنے چار سالہ کورس میں ترمیم کرتے ہوئے اردو، پنجابی اور دیگر اقلیتی زبانوں کو آپشنل قرار دے اور تمام کالجوں میں ان زبانوں کا آنرس کورس شروع کرے تاکہ ان زبانوں سے متعلق شعبوں کے بند ہوجانے کے خطرے کو ٹالا جاسکے اور ملک کی مشترکہ تہذیب اور کلچر کی امین زبانوں کی تعلیم جاری رہے۔ اردو، پنجابی، بنگلہ، اڑیہ، تمل اور دیگر علاقائی زبانوں کے دانشوران کی جانب سے گزشتہ ہفتہ قومی اقلیتی کمیشن میں درخواست دے کر یہ شکایت کی گئی تھی کہ دہلی یونیورسٹی کے ذریعے بی اے کا پاس کورس ختم کردینے اور چار سالہ کورس شروع کردیے جانے کے بعد ان زبانوں کی تعلیم کے لیے تو خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ جس کے بعد قومی اقلیتی کمیشن نے دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو طلب کیا تھا لیکن کسی وجہ سے وہ نہیں آئے اور انھوں نے ڈپٹی رجسٹرار جی آردت کو بھیج دیا۔ لوک نائک بھون واقع اقلیتی کمیشن کے دفتر میں چیئرمین وجاہت حبیب اللہ کی صدارت میں ہوئی میٹنگ میں ڈاکٹر مولا بخش، انور، پاشا ڈاکٹر ساجد حسین، ڈاکٹر روندر سنگھ اور وری اپّن سمیت کئی لیکچرار اور پروفیسر نے دہلی یونیورسٹی

وجاہت حبیب اللہ

ہر نوجوان کو شخصیت سازی کی تربیت حاصل کرنی چاہیے: ڈاکٹر پلم راجو

نئی دھلی: مرکزی وزیر برائے فروغِ انسانی وسائل ڈاکٹر پلم راجو نے کہا ہے کہ ملک کے ہر نوجوان کو شخصیت سازی کے فن کی تربیت حاصل کرنی چاہیے۔ وہ آج یہاں سراج الدین قریشی کی سرپرستی میں انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر اور نوبل ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام پچھلے 40 دنوں سے جاری 'پرسنالٹی ڈیولپمنٹ ورکشاپ' کی اختتامی تقریب سے بطور مہمان خصوصی خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے اسٹیج پر چند طلبا و طالبات کی شاندار کارکردگی کا مشاہدہ کرنے کے بعد کہا کہ انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر نوجوانوں کی جو تربیت دے رہا ہے اور سراج الدین قریشی جس لگن، جذبہ اور محنت سے

40 دنوں سے جاری پرسنالٹی ڈیولپمنٹ ورکشاپ کے اختتامی تقریب کے دوران
مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل ڈاکٹر پلم راجو، سراج الدین قریشی، اے ایم یو کے پرووائس چانسلر سید احمد علی و دیگر

نوجوانوں کی مفت تربیتی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اسے دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ انہی نوجوانوں کی بدولت ہندوستان بہت جلد سپر پاور بن جائے گا۔ ڈاکٹر پلم راجو نے اس موقع پر پرسنالٹی ڈیولپمنٹ کلاس کے استاذ محمد منور زماں کے طریقہ تربیت اور ان کی شخصیت سازی کے فن کی بھی تعریف کی۔ انھوں نے آئی آئی سی سی اور این ای ایف کی جانب سے محمد منور زماں کو اعزاز اور ٹرافی سے بھی نوازا۔ اس موقع پر ڈاکٹر مصطفیٰ (علیگ) (کی تصنیف 'حفیظ جالندھری کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ' اور این ای ایف کے تربیت یافتہ نوجوان زید الرحمٰن کی تحریر کردہ انگریزی کتاب 'یادگار افکار، یادگار الفاظ میں' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس پروگرام کی نظامت معروف صحافی ایم ودود ساجد نے کی۔ اس موقع پر تقریب کے مہمان اعزازی اور اے ایم یو کے پرو وائس چانسلر بریگیڈیر سید احمد علی نے پروگرام کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے پیش کش کی کہ اس ورکشاپ سے جتنے بھی نوجوانوں نے تربیت حاصل کی ہے وہ سب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں آکر اپنی آگے کی تعلیم پوری کریں۔ اس پروگرام کی صدارت سراج الدین قریشی نے کی۔ اس موقع پر جنرل واؤچر، سید اعجاز حیدر رضوی، احمد رضا، اقرار حسین، ایم این عباسی، ایم اے حق، محمد عبداللطیف خان، مالیگاؤں کے مشہور سماجی خدمت گار محفوظ الرحمٰن زری والا، ڈاکٹر مصطفیٰ (علیگ) اور زید الرحمٰن کے علاوہ تقریباً 400 سے زائد شرکا سمیت بڑی تعداد میں طلبا و طالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 جولائی 2013

کے تازہ کورس کے نفاذ کے بعد اپنے خدشات اور وسوسوں کا اظہار کیا۔ وجاہت حبیب اللہ نے ان سب کی باتوں کو بغور سنا اور انھوں نے دہلی یونیورسٹی کو ہدایت جاری کی کہ وہ حال ہی میں نافذ کیے گئے اپنے چار سالہ کورس میں تبدیلی لاتے ہوئے اس میں اردو، پنجابی اور دیگر اقلیتی زبانوں کو آپشنل قرار دے اور جن کالجوں میں ابھی ان زبانوں کے آنرس کورس نہیں ہیں، وہاں ان زبانوں کا آنرس کورس بھی شروع کرے۔ انھوں نے واضح طور پر کہا کہ دہلی یونیورسٹی اس طرح کا میکانزم تیار کرے جس سے اردو، پنجابی یا دیگر اقلیتی اور علاقائی زبانوں پر کوئی آنچ نہ آئے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 2 جولائی 2013

قاضی عبدالستار کو اعزازیہ

علی گڑھ: آذر اکادمی کے زیر اہتمام معروف ناول نگار پدم شری قاضی عبدالستار کے اعزاز میں ایک استقبالیہ جلسہ ابن سینا اکادمی میں منعقد کیا گیا جس کی صدارت پدم شری پروفیسر حکیم ظل الرحمٰن نے کی۔ آذر اکادمی کے صدر پروفیسر صغیر افراہیم نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے پروفیسر قاضی عبدالستار کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالی اور قاضی کے شاگرد رشید مظفر حسین سید کے ادبی سفر کا اجمالی خاکہ پیش کرتے ہوئے ان کا استقبال کیا۔ معروف شاعر مصاحد قدوائی نے قاضی عبدالستار کی خدمت میں منظوم خراجِ تحسین پیش کیا۔ مہمان خصوصی معروف صحافی مظفر حسین سید نے اپنے استاذ پروفیسر قاضی عبدالستار کی شخصیت اور فن پر مقالہ پیش کیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کی مقبول عام تصانیف شب گزیدہ، جان عالم کی انفرادیت اور فنی محاسن پر اظہارِ خیال کیا۔ اس موقعے پر آذر اکادمی کے سکریٹری مشرف حسین محضر نے اکادمی کی جانب سے پروفیسر قاضی عبدالستار کی ادبی خدمات کے اعتراف میں تہنیت نامہ اور مہمانِ خصوصی مظفر حسین سید کو سپاسنامہ پیش کیا۔ صدر جلسہ پدم شری حکیم سید ظل الرحمٰن نے منتظمین جلسہ کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر قاضی عبدالستار کا شمار اردو دنیا کے ان معدودے چند شخصیات میں ہے جن کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر طارق چھتاری، پروفیسر خورشید احمد، پروفیسر انیس انصاری، پروفیسر تقدس حسین، پروفیسر اصغر عباس، پروفیسر عبدالعلیم، پروفیسر عارف الاسلام، ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی، ڈاکٹر راشد انور راشد، کنور عارف علی خاں، انجینئر فرقان سنبھلی وغیرہ نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، یکم جولائی 2013

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونیکیشن میں اردو صحافتی کورس کا آغاز

نئی دھلی: دارالحکومت نئی دہلی کے فلّی آڈوٹوریم میں ہفت روزہ جدید مرکز کے زیر اہتمام آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کے مطالبے پر مرکزی حکومت نے ایک اہم فیصلہ لیا ہے، اس سے اردو صحافت کی ترقی میں کافی بل مدد ملے گی حکومت نے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونیکیشن میں اردو صحافت کا کورس شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونی کیشن میں فی الحال اردو صحافت کا یہ کورس قلیل مدت کا ہوگا اور بعد میں اسے فل ٹائم کر دیا جائے گا۔ حال ہی میں نئی دہلی میں اختتام پذیر ہوئی کل ہند اردو ایڈیٹرس کانفرنس میں اطلاعات و نشریات کے مرکزی وزیر جناب منیش تیواری کے ذریعے اردو اخباروں کے ایڈیٹرس اور ورکنگ صحافیوں کے ساتھ ہوئے تفصیلی تبادلۂ خیال کے بعد اس کورس کو شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ تبادلۂ خیال کے دوران اردو اخباروں کے نمائندوں نے وزیر موصوف سے اردو میڈیم میں صحافتی کورس شروع کرنے کی اپیل کی تھی۔ اردو صحافت میں سرٹیفکیٹ کورس شروع کرنے کا فیصلہ 26 جون 2013 کو ہوئی آئی آئی ایم سی اگزیکٹیو کونسل کی 124 ویں میٹنگ میں کیا گیا، جو اطلاعات و نشریات کے سکریٹری اور آئی آئی ایم سی کے چیئرمین جناب اُدے کمار ورما کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ یہ کورس غیر رہائشی ہوگا۔ اس میں جدید صحافت کی ٹیکنالوجی، ٹی وی کے لیے کاپی رائٹنگ اور

الا اروِن کے ریالٹی شو میں پروفیسر وسیم بریلوی کی بطور جج شرکت

پچھلے دنوں گلوکارہ اور اداکارہ الا اروِن نے اپنے بینر 'انتر دھونی پروڈکشن' تلے دوردرشن اردو کے لیے ایک منفرد ریالٹی شو "میں خیال ہوں کسی اور کا، مجھے سوچتا کوئی اور ہے" کی شوٹنگ ممبئی کے فلمالیہ اسٹوڈیو میں اپنی زیرِنگرانی مکمل کی۔ امیر خسرو کے کھیال سے شاعر کے خیال تک ... غزل گلوکاری سے شاعر کے ترنم تک۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آڈیشن کے ذریعے چن کر لائے گئے امیدواروں نے اس نرالے شو میں حصہ لیا۔ اس منفرد ریالٹی شو میں پہلی بار ابھرتے

(اسٹیج پر دائیں سے) انوپ جلوٹا، دیوکی پنڈت، وسیم بریلوی اور کویتا کرشن مورتی

ہوئے موسیقاروں کے ساتھ شعرا حضرات کو بھی اپنے فن کے جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ شاعر نے کلام لکھا، موسیقار نے طرز بنائی اور گلوکار نے اپنی آواز دی۔ اس پروگرام میں دورِ جدید کے مایہ ناز شاعر جناب وسیم بریلوی صاحب، مشہور گلوکارہ کویتا کرشنا مورتی اور کلاسیکی موسیقی کی بہترین فنکارہ دیوکی پنڈت نے جج کے فرائض انجام دیے۔

پروگرام میں منٹور (mantor) کی حیثیت سے جناب ابراہیم اشک، مقبول حسین خان اور محترمہ سیما سہگل کی شمولیت نے چار چاند لگا دیے۔ ہندوستان کے عظیم فنکار، کلاسیکی موسیقی کے سرتاج، جناب راشد علی خاں صاحب، نین گھوش، انوپ جلوٹا، کویتا کرشن مورتی، دیوکی پنڈت جیسے فنکاروں نے اپنے فن کے مظاہرے سے سامعین اور مقابلہ میں شرکت کرنے والوں کے نہ صرف دل جیتے بلکہ انھیں زندگی میں آگے بڑھنے کا ایک عزم دیا۔ پریس نوٹ، وکاس گپتا، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 18 جولائی 2013

تحریر کے علاوہ صحافت کی دیگر ضروری باتوں پر توجہ دی جائے گی۔ اس کورس کا مقصد اردو صحافت میں صلاحیت سازی کو بڑھانا اور ہنرمندی کو فروغ دینا ہے۔ ادارہ کورس کی مدت، نصاب اور فیس کے ڈھانچے کو حتمی شکل دینے میں مصروف ہے، جو توقع ہے کہ اگلے تعلیمی سال میں شروع ہو جائے گا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 28 جون 2013

ابن صفی پر ضخیم مجلّہ کی اشاعت

نئی دھلی: یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا کے قومی جنرل سکریٹری ڈاکٹر سید احمد خاں نے اظہارِ مسرت کرتے ہوئے کہا کہ یہ خبر اردو دنیا اور پرستاران ابن صفی کے لیے انتہائی اہم ہے کہ اردو دنیا کے عظیم ادیب اور ناول نگار ابن صفی کی شخصیت، فن اور ادبی خدمات کے حوالے سے ایک ضخیم کتاب 'ابن صفی: مشن اور ادبی کارنامہ' کے عنوان سے اردو بک ریویو، نئی دہلی کے زیرِاہتمام شائع ہو گئی ہے۔ ایک ہزار بتیس صفحات پر مشتمل یہ ضخیم مجلد کتاب کے مؤلف و مرتب اور اردو بک ریویو کے ایڈیٹر محمد عارف اقبال ہیں۔ ادارتی مشیران میں دہلی یونیورسٹی (شعبۂ اردو) سے وابستہ ڈاکٹر سید تنویر حسین اور معروف مجلّات 'اردو دنیا' 'فکر و تحقیق' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر عبدالحی شامل ہیں۔ روزنامہ 'جدید خبر' اور پندرہ روزہ 'خبردار جدید' کے ایڈیٹر معصوم مرادآبادی نے ابن صفی کے حوالے سے اس کتاب کو ابن صفی کا انسائیکلو پیڈیا قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر سید احمد خاں نے مزید کہا کہ اردو بک ریویو کے ایڈیٹر محمد عارف اقبال ابن صفی کی شخصیت، فن اور ادبی خدمات پر گزشتہ ایک برس سے بڑی عرق ریزی سے کام کر رہے تھے جس کے نتیجے میں یہ شاہکار کتاب منظرعام پر آسکی جس میں ملک کے اہم ادیبوں، نقادوں اور پرستارانِ ابن صفی کے تازہ مضامین خاص طور سے شامل ہیں۔ 'ابن صفی: مشن اور ادبی کارنامہ' کی اشاعت کا اردو دنیا کو شدت سے انتظار تھا۔ توقع ہے کہ یہ کتاب ابن صفی کی شخصیت اور ادبی خدمات کے حوالے سے یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالرز اور اردو داں عوام کے لیے بے حد مفید ثابت ہوگی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 29 جون 2013

اردو مدیران کی کل ہند کانفرنس

نئی دھلی: اطلاعات و نشریات کے مرکزی وزیر منیش تیواری نے کہا کہ حکومت نے اخبارات کو دیے جانے والے اشتہارات کی شرحوں پر نظرثانی کرنے کے لیے ایک کمیٹی قائم کی ہے جو تعداد اشاعت کے ساتھ ساتھ دیگر پیمانوں کو بھی مدنظر رکھتے ہوئے اپنی سفارشات پیش کرے گی۔ یہاں آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مسٹر تیواری نے کہا کہ ان کی

اردو ایڈیٹرس کانفرنس کے دوران راج ببر، ظفر علی نقوی، دگو جے سنگھ، کلدیپ نیر، مرکزی وزیر اطلاعات منیش تیواری اور رام ولاس پاسوان

وزارت میں ایڈیشنل سکریٹری جے ایس ماتھر کی قیادت میں قائم یہ کمیٹی اخبارات کو اشتہارات دینے کے لیے ان کی تعداد اشاعت کے علاوہ دیگر پیمانے بھی مقرر کرے گی۔ انھوں نے کہا کہ اب تک تعداد اشاعت کی بنیاد پر اخبارات کو تین زمروں چھوٹے، درمیانہ اور بڑے میں تقسیم کیا گیا ہے اور اسی کو پیمانہ بنا کر اشتہارات دیے جاتے ہیں لیکن اس پالیسی پر نظرثانی کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کمیٹی قائم کی گئی ہے۔ انھوں نے تسلیم کیا کہ اردو اور دیگر علاقائی زبانوں کے اخبارات کو کئی چیلنجز کا سامنا ہے اور ان کی مسائل انگریزی اخبارات سے بالکل مختلف ہیں۔ اطلاعات و نشریات کے وزیر نے اردو میں پیشہ ورانہ لحاظ سے تربیت یافتہ صحافیوں کی ضرورت سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ وہ انڈین انسٹی آف ماس کمیونی کیشن میں اردو صحافت کا کورس شروع کرانے اور اردو اخبارات کے لیے نوجوانوں کو نئی تکنیک کی تربیت دلانے کے لیے اس ادارے کے ڈائرکٹر جنرل سنیت ٹنڈن سے بات کرنے کی کوشش کی۔ کانگریس کے جنرل سکریٹری دگ وجے سنگھ نے اردو کو قومی اتحاد کی زبان قرار دیا۔ انھوں نے اردو ٹیچروں کی تقرری کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ جن اسکولوں میں 40 سے زائد اردو پڑھنے والے طلبہ ہوں وہاں اردو ٹیچر کی تقرری ہونی چاہیے۔ اس کانفرنس کا انعقاد ہفت روزہ جدید مرکز نے کیا تھا۔

روزنامہ 'خبر جدید' دہلی، 24 جون 2013

اقلیتی امور کی سرکاری ویب سائٹ پر اردو ندارد

نئی دھلی: وزارت اقلیتی امور نے ملٹی سیکٹورل ڈیولپمنٹ پروگرام (ایم ایس ڈی پی) فنڈ کا نفاذ اقلیتی ارتکاز ضلع (ایم سی ڈی) کے ساتھ ساتھ اقلیتی ارتکاز بلاک (ایم سی بی) کی سطح پر کرنے کا اعلان کیا اور اسے کابینہ نے بھی منظوری دے دی ہے۔ اس کے علاوہ اس کا نفاذ 20 ریاستوں کے بجائے 26 ریاستوں میں کرنے کے متعلق قرارداد کو بھی مرکزی کابینہ نے ہری جھنڈی دے دی لیکن اقلیتوں سے متعلق وزارت اقلیتی امور کی ویب سائٹ پر دی جانے والی جانکاری محض انگریزی میں ہونے کے باعث مسلمانوں کو اسکیم کا فائدہ اٹھانے میں

کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ واضح ہو کہ اقلیتی امور کی ویب سائٹ پر مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن، نیشنل مائینارٹی ڈیولپمنٹ فنڈ انڈ فائنس کارپوریشن (این ایم ڈی ایف سی)، نئی روشنی، ملٹی سیکٹورل ڈیولپمنٹ پروگرام (ایم ایس ڈی پی)، اسکالرشپ اسکیم، فری کوچنگ و دیگر اسکیم سمیت کئی اسکیموں کی جانکاری محکمہ نے اپنی ویب سائٹ پر مسلمانوں کی مادری زبان میں دینے کے بجائے صرف انگریزی زبان میں دی جس کا خاطرخواہ فائدہ نہیں ہوسکا۔ زکوۃ فاؤنڈیشن آف انڈیا کے صدر سید ظفر محمود نے کہا کہ ہندوستان میں ملک کی آبادی کا 19 فیصد حصہ اقلیتوں کا ہے اور اس میں مسلمانوں کا فیصد 73 ہے اس لیے اقلیتوں کے تعلق سے بنائی جانے والی اسکیموں کی جانکاری ان کی مادری زبان اردو میں بھی فراہم کی جانی چاہیے تاکہ اس کا خاطرخواہ فائدہ ہوسکے۔ مسلم مجلس مشاورت کے جنرل سکریٹری الیاس ملک نے کہا کہ اردو کو مختلف ریاستوں میں دوسری سرکاری زبان کا رجہ حاصل ہونے کے علاوہ اس زبان کا رشتہ تحریک آزادی سے ہے اور یہ مسلمانوں کی مادری زبان بھی ہے۔ اس لیے نہ صرف اقلیتی امور کی ویب سائٹ بلکہ مسلمانوں کے تعلق سے تمام معاملات میں اردو کو شامل کیا جانا چاہیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 22 جون 2013

بچوں کو مادری زبان میں تعلیم دلانا آئینی حق

نئی دھلی: فیڈریشن فار ایجوکیشن ڈیولپمنٹ کے زیراہتمام انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں فروغ اردو کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارجات کے چیئرمین جسٹس سہیل اعجاز صدیقی کی صدارت میں شروع ہوا اور نظامت ڈاکٹر محمد ایوب نے کی۔ اس موقعے پر دہلی کی وزیر تعلیم پروفیسر کرن والیہ نے کہا کہ اردو زبان صرف ثقافتی پروگراموں اور فلموں تک محدود نہیں ہونی چاہیے، اردو ہندوستانی زبان ہے اس کا دائرہ مزید وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج کی کانفرنس میں جو مسائل میرے سامنے آئے ہیں وہ جسٹس سہیل سے مشورہ کے بعد جلد حل کیے جائیں گے۔ صدارتی تقریر میں جسٹس سہیل اعجاز صدیقی نے کہا کہ قوم کے جو بھی مسائل ہیں وہ تعلیم کی کمی کی وجہ سے ہیں۔ جسٹس سہیل نے اردو زبان کے تعلق سے کہا کہ ہندوستان کے آئین میں تعلیم کے تعلق سے والدین کو بھی اس بات کا حق حاصل ہے کہ اپنے بچوں کو مادری زبان میں تعلیم دلائیں۔ پروگرام میں عبدالعلیم برنی کے علاوہ دہلی کے باہر سے آئے ہوئے مقرر مہمانوں نے بھی

آئی آئی سی میں منعقدہ فروغ اردو کانفرنس میں دائیں سے ریاض ملک، شکیل احمد، پروفیسر کرن والیہ، جسٹس سہیل اعجاز صدیقی و دیگر

اظہار خیال کیا۔ فیڈریشن کے جنرل سکریٹری شکیل احمد نے سچر کمیٹی کی سفارشات کو نافذ کیے جانے، دہلی کے اردو میڈیم اسکولوں میں اردو اساتذہ کی جلد تقرری، دہلی یونیورسٹی میں اردو میڈیم سے بی ایڈ کے لیے 20 سیٹیں مختص کیے جانے، دہلی کے 127 کالجوں میں اردو کے شعبے کا قیام اور اردو کو اس کا جائز مقام دیے جانے کے تعلق سے 11 نکات پر مبنی میمورنڈم پڑھ کر سنایا جسے بعد میں دہلی کی وزیر تعلیم کرن والیہ کو سونپا گیا۔ اس موقعے پر ایم اے قدوائی، ڈاکٹر زین العابدین، جاوید رحمانی، محمد الیاس، ماسٹر نثار احمد، ماسٹر مقصود احمد، شفیع قریشی، ٹی بھارتی کے علاوہ کثیر تعداد میں لوگ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 13 جون 2013

بچوں کا ادب نئی نسل کی ذہنی سطح کے مطابق ہونا چاہیے

لکھنؤ: نصف صدی پیشتر عربی اور اردو دونوں زبانوں میں بچوں کے ذہن اور ضرورت کی رعایت کرتے ہوئے ان کے لیے لٹریچر تیار کرنے کی طرف توجہ بہت کم تھی، اردو میں کچھ لٹریچر تیار کیا گیا تھا۔ اس بات کو ندوۃ العلما کے ذمے داروں نے محسوس کیا۔ عربی میں اس کام کو انجام دینے کی ضرورت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے خاص طور پر محسوس کی اور کتابیں تیار کیں۔ ان کے ہم عصر دوست حکیم شرافت حسین رحیم آبادی نے اردو میں اس ضرورت کی طرف توجہ دی۔ ان خیالات کا اظہار مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے عباسیہ ہال میں رابطہ ادب اسلامی کے زیراہتمام اور مکتبہ دین و دانش کے تعاون سے حکیم شرافت حسین رحیم آبادی کی بچوں کے ادب میں خدمات کے موضوع پر منعقد سیمینار میں کیا۔ مولانا نے بچوں کے ادب سے متعلق کہا کہ اشاعتِ کتب کی عمومیت سے قبل ایک طرح کا رواج یہ بھی تھا کہ مائیں اپنے بچوں کو اللہ، رسول اور صحابۂ کرام اور ائمہ عظام سے متعلق بنیادی باتیں قصہ کہانی کے عنوان سے بتا دیا کرتی تھیں، لیکن بعد میں حالات ایسے بدلے کہ یہ کام بہت کم ہوگیا، لہٰذا ضرورت اس بات کی طرف بڑھ گئی کہ نئی نسل کے لیے اس کے ذہن وضرورت کے مطابق لٹریچر تیار کیا جائے جو یہ ضرورت پوری کرسکے۔ مولانا رابع حسنی نے کہا کہ اس موضوع پر ندوۃ العلما میں ایک بین الاقوامی سیمینار مولانا علی میاںؒ کی سرپرستی میں منعقد ہوا اور رابطہ ادب اسلامی کی بنیاد پڑی۔ مولانا نے کہا کہ ادب کا کام ہے زبان کے توسط سے احساسات کا آپس میں تبادلہ کرنے کا، اپنے احساسات اور دوسروں کے احساسات سے متاثر ہونے کا۔ اسلام چونکہ پوری انسانی زندگی کو محیط ہے، اور زندگی گزارنے کا پورا نظام رکھتا ہے جس میں سب انسانی پہلو آجاتے ہیں۔ افتتاحی پروگرام کے آغاز میں مولانا نذر الحفیظ ندوی صدر شعبۂ عربی نے حکیم شرافت حسین رحیم آبادی کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی۔ سکریٹری رابطہ ادب اسلامی مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی نے کہا کہ بچوں کا ادب بہت وسیع موضوع ہے۔ عربی میں بچوں کے ادب پر بہت کم کام ہوا ہے۔ ہندوستان کو اس معاملے میں دیگر ممالک پر امتیاز حاصل ہے کہ یہاں بچوں کے ادب پر خاصا کام ہوچکا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے بھی بچوں کے ادب میں نمایاں کام کیا ہے۔ اسی طرح بچوں کے ادب کی تیاری میں ندوی فضلاء کا خاصا حصہ ہے۔ دارالعلوم ندوۃ العلما، کے مہتمم مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے حکیم شرافت حسین رحیم آبادی سے اپنے تعلقات کا تذکرہ کرتے ہوئے بچوں کے ادب سے متعلق ان کی تیار کردہ کتابوں کا تعارف پیش کیا اور ان کی اہمیت واضح کی۔ سیمینار کی صدارت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور نظامت مولانا نذر الحفیظ ندوی اور مولانا علاء الدین ندوی نے مشترکہ طور پر کی۔ سیمینار کے کنوینر محمد سلیمان رحیم آبادی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ مولانا سعید الرحمٰن اعظمی کی دعا پر جلسے کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 12 جون 2013

جاوید اختر کاپی رائٹ عالمی تنظیم کے نائب صدر

ممبئی: مشہور مصنف وگیت کار جاوید اختر کی جانب سے مصنّفین اور موسیقاروں کے لیے کاپی رائٹ (حق تصنیف) کے فوائد کے حصول کے لیے 3 سال سے جاری جدوجہد اب عالمی جدوجہد میں تبدیل ہوگئی ہے۔ کسی ہندوستانی فنکار کے لیے ایک غیر معمولی اعزاز کے طور پر انھیں انٹرنیشنل کانفیڈریشن آف آتھرس اینڈ کمپوزرس سوسائٹی (سی آئی اے سی اے سی) کا نائب صدر مقرر کیا گیا ہے۔ بیرونی تنظیم سی آئی اے سی اے سی ہر قسم کی تخلیقی تحریر پر ساری دنیا میں کاپی رائٹ قوانین کی نگرانی، ان کا تحفظ اور

جانچ پڑتال کرتی رہتی ہے۔ اصولی طور پر جاوید اختر اب ساری دنیا کے تمام فنکاروں کے لیے کاپی رائٹ قوانین کی جدوجہد کریں گے۔ واشنگٹن سے بات چیت کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ انھیں اس اعزاز سے خوشگوار حیرت ہوئی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستانی موسیقاروں کے کاپی رائٹ اور رائلٹی کے لیے ان کی جدوجہد انتہائی باوقار عالمی فورم پر پہنچ گئی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ شاید آپ کو اس بات کا علم ہوگا کہ سی آئی ایس اے سی 121 ممالک پر مشتمل ہے۔ سرکردہ تنظیم ان تمام ممالک میں کاپی رائٹ مسائل پر نظر رکھتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ان حالات میں وہ اسے ایک بہت بڑی ذمے داری قرار دیتے ہیں۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 9 جون 2013

دھلی :

وزیراعلیٰ کا اردو کے تدریسی مسائل حل کرنے کا وعدہ

نئی دھلی: سرکار اردو والوں کے تمام مسائل کو حل کرنے کی سمت میں کام کر رہی ہے۔ خاص طور پر تعلیمی شعبے میں پیش آرہی دقتوں کے متعلق سنجیدگی سے غور کیا جارہا ہے۔ آج وزیراعلیٰ شیلا دیکشت کو دیے گئے میمورنڈم

فیڈریشن فار ایجوکیشنل ڈیولپمنٹ کے کارکنان تعلیم و اردو کے مسئلہ پر وزیراعلیٰ سے تبادلہ خیال کرتے ہوئے

میں جن مختلف ایشوز کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے، سرکار اس کا تجزیہ کرے گی۔ جلد ہی اردو والوں کی خصوصی میٹنگ بلا کر تمام ایشوز پر تفصیلی غور وخوض کیا جائے گا۔ ان خیالات کا اظہار وزیراعلیٰ شیلا دیکشت نے اپنی رہائش گاہ پر فیڈریشن فار ایجوکیشنل ڈیولپمنٹ کے چیئرمین عبدالعلیم برنی اور جنرل سکریٹری شکیل احمد صدیقی نے کی۔ وزیراعلیٰ شیلا دیکشت نے وفد کے اراکین سے کہا کہ مسلمانوں کو سرکاری اسکیموں سے فائدہ اٹھانا چاہیے کیونکہ دیکھنے میں آیا ہے کہ اردو والے عوامی فلاحی اسکیموں سے مختلف وجوہات کی بنا پر استفادہ نہیں کر پارہے ہیں۔ اس سے قبل وفد کے اراکین نے وزیراعلیٰ کو سچر کمیٹی کی سفارشات کو دہلی میں ابھی تک نافذ نہ کیے جانے، اردو زبان کے فروغ کے لیے سبھی سرکاری محکموں کو ضروری احکامات جاری نہ کیے جانے اور سرکاری اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تقرری کے متعلق کوئی ٹھوس پالیسی نہ بنائے جانے سمیت تعلیم کے شعبے سے متعلق مختلف ایشوز سے واقف کرایا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 جون 2013

وقف بورڈ کی اردو ویب سائٹ

نئی دھلی: وقف کی تمام جائداد مسلمانوں کی ہے اور اس کا فائدہ بھی مسلمانوں کو پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن اس کے اغراض ومقاصد پر اس وقت قدغن لگ جاتا ہے جب ہم دہلی وقف بورڈ کی ویب سائٹ دیکھتے ہیں۔ مسلمانوں کی بڑی آبادی آزادی کی 6 دہائیوں کے بعد بھی انگریزی سے محروم ہے جس کا ذکر رنگ ناتھ مشرا اور سچر کمیٹی کی رپورٹ میں بھی کیا گیا، جسے قبول کرتے ہوئے مرکزی سرکار نے اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے مختلف منصوبے بنائے اور اسے عملی جامہ پہنایا۔ چودھری متین نے کہا کہ مسلمانوں کی مادری زبان اردو ہونے کے علاوہ اسے ریاست کی دوسری سرکاری زبان ہونے کا بھی شرف حاصل ہے لیکن دہلی وقف بورڈ کی ویب سائٹ انگریزی میں ہونے سے اردو داں طبقے کو ہونے والی پریشانیوں کو دیکھتے ہوئے اب اسے اردو میں بھی تیار کی جارہی ہے۔ واضح ہو کہ وقف بورڈ کی ویب سائٹ پر بورڈ کے تعلق سے تمام تفصیلی جانکاری دی گئی ہے۔ بورڈ کی سرگرمی، مساجد، وقف کی تفصیل، بورڈ کے چیئرمین و اراکین،

معاصر چیلنجز کا مقابلہ معاصر دنیا کو سمجھے بغیر نہیں کیا جاسکتا

نئی دھلی: ''جدید وقدیم تعلیم کی تقسیم بے معنی ہے۔ تعلیم تعلیم ہوتی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ مولانا محمود اسعد مدنی کی قیادت میں ایک ایسا ادارہ قائم ہو رہا ہے جو جدید تقاضوں اور ضروریات کو پورا کرنے میں معاون و مددگار ہوگا۔'' ان خیالات کا اظہار جناب نجیب جنگ وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے نیشنل انسٹی ٹیوٹ فار فیتھ لیڈرشپ (NIFL) کے قیام کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے یاسر عرفات ہال میں منعقد ہونے والی دوروزہ ورک شاپ کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔ جناب نجیب جنگ نے ورک شاپ کے منتظمین اور انسٹی ٹیوٹ کے ذمہ داروں کو یہ یقین دہانی بھی کرائی کہ اس حوالے سے جو بھی تعاون ان سے ممکن ہو سکے گا وہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ورک شاپ میں مدعو شرکاء کا استقبال کرتے

سابق شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نجیب جنگ، پروفیسر اختر الواسع، مولانا محمود مدنی، ماہر تعلیم برطانیہ ایم ایچ مقدم

ہوئے ڈاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائرکٹر پروفیسر اختر الواسع نے سب سے پہلے جناب نجیب جنگ کو دہلی کا پہلا مسلم لفٹیننٹ گورنر بنائے جانے پر انھیں مبارک باد دی۔ پروفیسر اختر الواسع نے ورک شاپ کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس کا مقصد فارغین مدارس کے لیے قائم ہونے والے نیشنل انسٹی ٹیوٹ فار فیتھ لیڈرشپ کے لیے نصاب ونظام تعلیم تیار کرنا ہے تاکہ اس کا آغاز بہتر انداز میں ہو سکے۔ ورکشاپ کے افتتاحی اجلاس کی صدارت انسٹی ٹیوٹ کے بانی ومحرک مولانا محمود اسعد مدنی چیئرمین شیخ الہند ایجوکیشنل چیریٹیبل ٹرسٹ نے کی۔ مولانا محمود مدنی نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ ہماری منشا یہ ہے کہ مسلمانوں اور اسلام کو درپیش چیلنج کو سمجھا جائے اور اس کے ساتھ اچھی طرح تعامل کیا جائے۔ ورک شاپ میں کلیدی خطبہ جناب ایم ایچ مقدم (ماہر تعلیم، برطانیہ) نے پڑھا۔ انھوں نے انسٹی ٹیوٹ کے قیام اور اغراض ومقاصد پر انتہائی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی۔ مولانا محمود اسعد مدنی نے اس جانب پہل کر کے ایک انتہائی قابل ستائش کام انجام دیا ہے۔ جناب مقدم نے انسٹی ٹیوٹ کا تعلیمی وتربیتی خاکہ بھی پیش کیا۔ ورکشاپ میں دو ورکنگ سیشن منعقد کیے گئے جس میں اہم اور قابل قدر شخصیات نے اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کیا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر ذین ندوی، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، 2 جولائی 2013

ڈی ڈی اردو کی نشریات کو بہتر بنانے کی کوشش

نئی دھلی: پرسار بھارتی کے سربراہ نے یقین دلایا ہے کہ ڈی ڈی اردو کی نشریات کو بہتر بنانے کی کوشش کی جارہی ہے اور اس کی ترقی اور فروغ کے لیے مثبت اقدامات کرنا ہماری ترجیحات میں شامل ہیں۔ وہ یہاں ڈی ڈی اردو کے مسائل پر منعقد ایک میٹنگ میں اظہارِ خیال کررہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ایک سال میں ڈی ڈی اردو میں کچھ بہتر تبدیلیاں آئیں گی۔ اس میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے دوردرشن کے ڈائرکٹر جنرل تریپوراری شرن نے کہا کہ جلد ہی میں ڈی ڈی اردو کو بہتر بنانے کے لیے کئی اقدامات کیے جارہے ہیں اور آج کی میٹنگ اس سلسلے میں بلائی گئی ہے۔ معزز شرکا نے نہ صرف میٹنگ کے انعقاد کو خوش آئند بتایا، بلکہ ڈی ڈی اردو کے فروغ واستحکام کے لیے مفید مشوروں سے نوازا،

(دائیں سے) تریپوراری شرن خطاب کرتے ہوئے جب کہ اسٹیج پر وی کے جین، ایس ایم افضل، ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین اور شفیع مشہدی

جن میں انفراسٹرکچر ڈیولپمنٹ، درست اردو جاننے والوں کی شمولیت، اردو اخبارات سے بہتر تال میل، ملک بھر سے اردو کی سرگرمیوں کی کوریج، حالات حاضرہ، سماجی مسائل و سائنسی و دیگر معلوماتی شوز کے علاوہ اردو سکھانے کے پروگرام کا دکھایا جانا وغیرہ شامل ہے۔ اس میٹنگ میں سی ای او جوہر سرکار، دوردرشن کے ڈائرکٹر جنرل تریپواراری شرن کے علاوہ ڈی ڈی نیوز کے ڈی جی ایس ایم خان، ایڈیشنل ڈائرکٹر جنرلس دیپا چندرا روی کے جین، ڈی ڈی اردو کے ایڈوائزرس آصف اعظمی اور انور جمال کے ساتھ ساتھ ملک بھر سے تشریف لائے اردو اداروں، میڈیا اور بیوروکریسی سے وابستہ معزز شخصیات نے شرکت کی جن میں احمد سعید ملیح آبادی، مولانا محمد ولی رحمانی، تریناتھ مشرا، سید شاہد مہدی، ڈاکٹر محمود الرحمان، ڈاکٹر انیس انصاری، پروفیسر مشیرالحسن، آر پی سنگھ صدا، میم افضل، ویدبھسین، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر آلوک رائے، ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین، سید محمد افضل، ڈاکٹر ظہیر قاضی، حسن کمال، ظہیرالدین علی خان، شفیع مشہدی، گوہر رضا، جمیل منظر، ڈاکٹر عزیز احمد، شائستہ یوسف اور عازم گروبندر سنگھ کوہلی شامل ہیں۔ میٹنگ میں ابتدائی کلمات اور تعارف ڈی ڈی اردو کے ایڈوائزر آصف اعظمی اور کلمات تشکر انور جمال نے پیش کیے، جب کہ ایڈیشنل ڈائرکٹر جنرل دیپا چندرا نے استقبالیہ کے فرائض انجام دیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 جون 2013

سی ای او سمیت دیگر معاملات کی جانکاری کے علاوہ ویب سائٹ پر مختلف قسم کے فارم بھی دستیاب کرائے گئے ہیں تاکہ لوگوں کو پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے لیکن ویب سائٹ سے اردو کو محروم رکھنے سے نہ صرف اسے کھولنے والوں کو دشواری ہوتی تھی بلکہ اس سے زبان کی ترویج وترقی پر بھی اثر پڑتا ہے، جس سے اردو داں طبقہ کافی نالاں تھے۔ ماذ انفوٹیک کے مالک شہباز اسلم نے بتایا کہ کسی بھی ویب سائٹ کو اردو زبان میں تیار کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 4 جولائی 2013

اردو اساتذہ کو رعایت دینے کا مطالبہ

نئی دھلی: اردو میڈیم اسکولوں میں اساتذہ کی کمی کو دور کرنے کی غرض سے دہلی حکومت نے 100 اسامیوں پر اردو کے گیسٹ ٹیچر رکھے گئے لیکن اس کے بعد حکومت کے ڈائرکٹریٹ آف ایجوکیشن نے اساتذہ کی تقرری کے لیے بی ایڈ اور 'ای ٹی ای' کے بعد 'سی ٹی ای ٹی' کا ٹسٹ پاس کرنا لازمی قرار دے دیا۔ حال ہی میں ڈائرکٹریٹ آف ایجوکیشن کی جانب سے معاہدہ کی بنیاد پر گیسٹ ٹیچروں کی تقرری کے لیے اشتہار شائع ہوا ہے، جس میں 'ٹی جی ٹی' اور پرائمری اساتذہ کے لیے 'سی ٹی ای ٹی' کی شرط لازمی رکھی گئی ہے۔ فی الحال 'سی ٹی ای ٹی' میں کامیاب امیدواروں خاص طور سے اردو اساتذہ کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔ اردو اساتذہ کے روزگار اور طلبہ کے روشن مستقبل کے پیش نظر حکومت کی 'سی ٹی ای ٹی' شرط سے فی الحال مستثنیٰ رکھنے کی غرض سے دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع نے دہلی کی وزیر تعلیم پروفیسر کرن والیہ کو ایک خط لکھ کر اس معاملہ پر توجہ مبذول کرائی ہے۔ پروفیسر اختر الواسع نے نمائندہ سے بات کرتے ہوئے کہا کہ ہم اردو میڈیم کے طلبہ کے مستقبل کے پیش نظر فکرمند ہیں اس کے علاوہ ہمیں اردو اساتذہ کا روزگار بھی عزیز ہے۔ لہٰذا حکومت بی ایڈ اور بیسک کی تعلیم حاصل کرنے والے اردو اساتذہ کے لیے ابھی سی ٹی ای ٹی کی شرط نہ لگائے تو اچھا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ حکومت کی جانب سے اردو اساتذہ کی تقرری کی گئی خواہ وہ گیسٹ ٹیچر کی شکل میں ہی سہی ایک اچھا قدم تھا لیکن دوسری جانب اردو اساتذہ کے لیے بھی سی ٹی ای ٹی کی شرط لگانا مناسب نہیں ہے۔ پروفیسر اختر الواسع نے بتایا کہ انھوں نے وزیر تعلیم کو ارسال کردہ مکتوب میں ذکر کیا ہے کہ موجودہ صورتِ حال کے پیش نظر اردو میڈیم اساتذہ کو کم از کم دو سال کی مہلت دی جائے اور ان امیدواروں کی درخواستوں پر بھی غور کیا جائے جو 'ای ٹی ای' یا 'بی ایڈ' کرچکے ہیں تاکہ اردو اسکولوں میں اساتذہ کی کمی کو پورا کیا جاسکے اور اردو طالب علموں کی پڑھائی کا نقصان بھی نہ ہو۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی 6 جولائی 2013

مستقبل کے اردو اساتذہ کی تربیت

نئی دھلی: کوچنگ کلاسیز برائے سی ٹی ای کے اختتامی اجلاس میں بطور مہمانِ خصوصی شریک محسنہ قدوائی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ اردو اکادمی، دہلی کی یہ عمارت جہاں میں پہلی بار آئی ہوں کو دیکھ کر ایک والہانہ خوشی کا احساس کررہی ہوں کہ یہ عمارت ہماری غلامی کی نشانی تھی جس کو انگریزوں نے جنگ آزادی کے متوالوں کو سزا دینے کے لیے مقرر کر رکھا تھا، لیکن آج آزادی کے بعد غلامی کے آثار کو مٹا کر اردو اکادمی، دہلی قائم ہے جہاں مستقبل میں اساتذہ مقرر ہونے والے نوجوان بچے بچیوں کی تربیت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ موصوفہ نے ابتدائی بنیادی تعلیم کی اہمیت وافادیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس سلسلے میں اردو اساتذہ کی ذمے داری بہت زیادہ ہے۔ انھوں نے قدیم تعلیمی مراکز میں مدرسوں کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے پہلے صدر بھی مدرسہ کے ہی طالب علم تھے۔ موصوفہ نے نہایت زور دے کر کہا کہ مشاعرے اور سیمینار کی اہمیت کا اعتراف کرنے کے باوجود اردو اکادمی کے ذریعے اساتذہ کی کوچنگ کرنے کا اہتمام اپنے آپ میں ایک تاریخ ساز قدم ہے، اس کے لیے میں اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع، سکریٹری انیس اعظمی اور تمام کارکنان کو مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ اس موقعے پر سب سے پہلے

امیر خسرو پر اسکولی بچوں کا اردو ڈرامہ

نئی دھلی: دہلی ایک تہذیبی مرکز تھا، ہے اور رہے گا۔ یقیناً یہاں کئی تہذیبی رنگینی کا باعث ملک کے کونے کونے سے آنے والے وہ فن کار یا تہذیبی سفیر ہیں جنھیں اپنی تہذیب سے عشق ہے لیکن یہ دیکھ کر انتہائی خوشی ہوتی ہے اور میں فخر کرتی ہوں اپنے آپ پر کہ مجھے اس عظیم ریاست کی خدمت کا موقع ملا جہاں کے چھوٹے چھوٹے بچے اس بلا کے ذہین فن کار ہیں کہ ان کے شاندار مستقبل کی دعائیں کی جاسکتی ہیں۔ 6 جولائی کی شام بستی نظام الدین کے چونسٹھ کھمبا (عرس محل) میں دہلی کی وزیر اعلیٰ محترمہ شیلا دکشت جب اپنے ان خیالات کا اظہار کر رہی تھیں تو موقع تھا اردو اکادمی، دہلی کے ذریعہ منعقدہ بچوں کے ذریعے پیش کیے جانے والے ڈراما 'امیر خسرو' کے اسٹیج شو کا ظ انصاری کے ذریعے تحقیقی مواد کو ڈراما کی شکل سکریٹری اردو اکادمی، دہلی اور مشہور و معروف ڈراما نویس انیس اعظمی نے دی تھی اور اسکولی بچوں کے معروف

ہدایت کار ندیم خاں نے گلیوں، محلوں میں رہنے والے عام بچوں کو ایک ماہ کے مختصر سے عرصے میں ٹرینڈ کر کے ایک تاریخی و تہذیبی گمشدہ باب کو نئی نسل کے سامنے نہایت روشن مینار بنا کر پیش کر دیا جو یہاں موجود تھے اس پیش کش کو قابلِ تحسین قرار دیا۔ اکادمی کی فعالیت کے سبب خاص طور پر دہلی کی قدیم تہذیب کی بازیافت میں میں بہت تیزی آئی ہے۔ 'امیر خسرو' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اور اس اسٹیج ڈراما کو اس قدر پسند کیا گیا کہ خود وزیر اعلیٰ دہلی نے اسٹیج پر موجود فن کاروں سے یہ گزارش کی کہ بعد از رمضان المبارک اس ڈراما کو آپ لوگ اسی جگہ پر بار بار اسٹیج کریں تاکہ نئی نسل ہماری ساجھی وراثت کی طاقت کو محسوس کر سکے۔ اس موقعے پر جہاں سکریٹری انیس اعظمی نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا وہیں وائس چیئر مین پروفیسر اختر الواسع نے آغا خاں فاونڈیشن کا شکریہ ادا کیا جس کی شراکت میں یہ ڈراما اسٹیج کیا گیا تھا۔ موصوف نے وزیر تعلیم، ثقافت و السنہ پروفیسر کرن والیہ کا بطور خاص شکریہ بھی ادا کیا اور وزیر اعلیٰ کو یقین دلایا کہ اردو اکادمی آج بھی ملک کی سرفہرست اردو اکادمی ہے اور آئندہ بھی اردو اکادمی، دہلی وزیر اعلیٰ دہلی کو مایوس نہیں کرے گی۔

روزنامہ 'خبر جدید' دہلی، 8 جولائی 2013

پروگرام کا آغاز کرتے ہوئے سکریٹری اکادمی انیس اعظمی نے نہایت تفصیل سے اردو اکادمی، دہلی کی سرگرمیوں کا تفصیلی ذکر کیا اور مہمانان کا تعارف پیش کیا۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ اردو اکادمی، دہلی ملک کی دیگر پندرہ اکادمیوں کے مقابلے میں اپنی سرگرمیوں کے باعث منفرد مقام رکھتی ہے اور اس کا سہرا سکریٹری اکادمی سے لے کر تمام کارکنان کے سر جاتا ہے جو نہایت ذمے داری اور محنت کے ساتھ مسلسل اردو اکادمی کے پروگرام اور پالیسز کو نافذ کرنے میں دن رات کوشاں رہتے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 جون 2013

آندھرا پردیش

روزگار پر مبنی کورسس سے اقلیتیں بھرپور استفادہ کریں

کرنول: یونک انگلش ہائی اسکول عباس نگر کرنول میں یونک کمپیوٹر سنٹر کے افتتاحی اجلاس کے موقعے پر مقامی رکن اسمبلی کاٹا سانی رام بھوپال ریڈی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور وزارت ٹکنالوجی، حکومت ہند نئی دہلی کی جانب سے منظور کردہ کمپیوٹر سنٹر اہلیان کرنول کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں۔ اقلیتوں کے لیے ملازمتوں کے مواقع فراہم کرنے کے لیے مرکزی حکومت غیر سرکاری تنظیموں کی مدد سے روزگار پر مبنی کورسیز چلانے کے لیے کمپیوٹر سنٹر منظور کر رہی ہے جس سے اقلیتی طلبا و طالبات استفادہ کر کے اپنے مستقبل کو سنوار سکتے ہیں۔ چیئر مین صمدانی گروپ آف انسٹی ٹیوشن، حیدر آباد مولانا خلیل احمد ندوی نے فرمایا کہ مسلمانوں کو اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے انتھک کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ شیخ کریم اللہ اگزیکٹیو ڈائرکٹر اقلیتی فینانس کارپوریشن کرنول نے کہا کہ موبائل اور کمپیوٹر کا صحیح استعمال ہمارے لیے فائدہ مند ہے اور غلط استعمال تباہ کن ہے۔ اسٹیٹ سکریٹری MEWA جناب شمس الدین صاحب مسلم نوجوان سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ایسے کورسس کا انتخاب کریں جو روزگار پر مبنی ہوں اور جس کے ذریعے قوم کی خدمت کی جاسکتی ہے۔ صدر جلسہ نے فرمایا کہ ہم اہلیان کرنول قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر اور ذمے داروں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے وقت کی اہم ترین ضرورت کو پورا کیا۔ حافظ عبدالمعید، حافظ عبدالسمیع نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ قاری عبدالرحمٰن کی قرأت سے جلسے کا آغاز ہوا۔ مولانا عبداللہ صاحب رشادی نے ہدیہ تشکر پیش کیا۔

پریس ریلیز، قاضی عبدالسمیع اسد، المدینہ ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، کرنول، آندھرا پردیش، 1 جولائی 2013

اتر پردیش:

مئو میں اردو اخبار خریدنے کی اپیل

مئو/علی گڑھ: سرسید اویرینس فورم کے زیر اہتمام ضلع کی ادبی، سماجی اور ثقافتی تنظیموں کا نمائندہ اجلاس حلیمہ اسپتال کے کلچرل ہال میں منعقد کیا گیا جس میں ضلع کی ادبی، ثقافتی اور سماجی حالات کا جائزہ لیا گیا۔ مختلف تنظیموں سے جڑے ہوئے ذمے داران نے اردو زبان اور ادب سے عدم دلچسپی تعلیم سے بے رغبتی اور سماج میں دن بدن بڑھنے والی اخلاقی برائیوں پر غور کیا اور اس سلسلے میں ایک لائحہ عمل تیار کیا۔ افتتاحی کلمات میں حلقہ ادب و صحافت کے سکریٹری نفیس احمد نے مشورہ دیا کہ ساری تنظیموں کو مل کر اتحاد اور اتفاق کے ساتھ کام کرنا چاہیے۔ گلوبل ایجوکیشن اور کیریر گائیڈینس کے سکریٹری عطاء الرحمٰن نے کہا کہ تعلیم کے شعبے میں بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے طالب علم اور حلقہ ادب و صحافت کے فعال رکن ریحان اسراری نے اردو ادب کے سلسلے میں کہا کہ مئو میں صلاحیتوں کی کمی

نہیں ہے لیکن وہ صلاحیتیں اخبارات ورسائل میں نمایاں نہیں ہیں۔ دارالعلوم بوائز انٹر کالج کے سابق منیجر اور پاورلوم اور ہینڈ لوم ایسوسی ایشن کے سکریٹری شاہد اختر (پیرس) نے اردو کی زبوں حالی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اب گھروں اور محلوں میں اردو کا ماحول نہیں ہے گو کہ خواتین بڑی تعداد میں اردو جانتی ہیں لیکن گھروں میں عام طور پر ہندی اخبار منگایا جاتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ گھروں میں اردو اخبارات اور رسائل جاری کیے جائیں۔ پروگرام کے کنوینر اور سرسید اویرنیس فورم کے قومی صدر ڈاکٹر شکیل صمدانی نے معاشرے میں پھیلی ہوئی سماجی برائیوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ ہر اسکول اور کالج میں اصلاح معاشرہ کے پروگرام منعقد کیے جائیں تاکہ نوجوان نسل کو اس کے نقصانات سے آگاہ کیا جاسکے۔ ڈاکٹر صمدانی نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا کہ ساری تنظیمیں مل کر ایک سمت میں اجتماعی قیادت میں کام کریں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 16 جون 2013

رام پور رضا لائبریری کی مطبوعات کی نمائش

رامپور: 5 جولائی، شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی کے زیر اہتمام رام پور رضا لائبریری کی مطبوعات کی نمائش یونیورسٹی کے رادھا کرشنن ہال میں منعقد ہوئی۔ جس کا افتتاح کرتے ہوئے ڈین یونیورسٹی پروفیسر ایم این رائے نے کہا کہ رضا لائبریری کی مطبوعات کی نمائش

کا شعبۂ فارسی کی جانب سے انعقاد علم وادب کے فروغ کا ہی ایک اہم قدم ہے۔ رام پور رضا لائبریری اپنی نادر قلمی اور مطبوعہ کتابوں، نایاب تصاویر اور بیش قیمت دستاویزات کے لحاظ سے پوری دنیا میں شہرت رکھتی ہے۔ یہاں عربی، فارسی، ترکی، پشتو، سنسکرت، ہندی، تمل اور پنجابی زبانوں کی تقریباً سولہ سترہ ہزار قلمی کتابیں، سیکڑوں قلمی تصاویر اور نادرۂ روزگار خطاطوں کی خوشنویسی کے بے شمار نمونے محفوظ ہیں۔ رام پور رضا لائبریری کی شہرت کا دارومدار اس کے ذخیرۂ مخطوطات اور قدیم مطبوعات پر ہے لیکن اس نے مخطوطات کی طباعت اور پیشکش نیز نئے اور پرانے علمی منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے بعد انھیں کتابی صورت میں اہل علم کے سامنے پیش کرنے میں بھی زبردست پیش رفت کی ہے۔ ڈاکٹر سید حسن عباس، صدر شعبۂ فارسی نے اس نمائش کی غرض وغایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ رام پور رضا لائبریری کے قیام کو دوسو سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے اور دوسو سال میں اس لائبریری کے علمی ذخیرے میں روز افزوں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ یہ سنٹرل گورنمنٹ کی زیر نگرانی چلنے والا خود مختار ادارہ ہے۔ لائبریری میں بیش قیمت مخطوطات، اسلامی خطاطی کے اعلیٰ نادر نمونے اور قدیم مطبوعات کا بہت عمدہ ذخیرہ محفوظ ہے۔ وہاں مخطوطات اور دستاویزات کی مرمت کا کام جدید تکنیک اور سائنسی آلات کی مدد سے کیا جاتا ہے۔ نمائش میں والمیکی کی رامائن کا فارسی متن اور ہندی ترجمہ تین جلدوں میں رکھا گیا ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ رنگین وخوبصورت تصاویر سے مزین ہے۔ تاریخ فیروز شاہی (ضیاء الدین برنی) کا مخطوطہ عکسی شایع کیا گیا ہے۔ اسی طرح نہج البلاغہ کے نسخے کی عکسی اشاعت عمل میں آئی ہے۔ اس کے علاوہ اشاریہ نیا دور، ادب شناسی، اردو شاعری کے نیم وادریچے، انگ درپن، اس پربودھ، مدھ مالتی، ادب گاہ رام پور، تاریخ کتابخانۂ رضا، اخبار الصنادید، خط کی کہانی، تاریخ رام پور، اردو زبان ولسانیات، تذکرہ شعرائے امروہہ، تاریخ اکبری وغیرہ بیش قیمت کتب نمائش میں رکھی گئیں۔ نمائش کے انعقاد کے سلسلے میں صدر شعبۂ فارسی نے رام پور رضا لائبریری کے ڈائرکٹر پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر سید حسن عباس، صدر شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی، 7 جولائی 2013

نئے تعلیمی سال میں اردو کے فروغ پر سیمینار

لکھنؤ: 7 جولائی کو غنی تعلیمی مرکز کی جانب سے ایک سیمینار بعنوان 'نئے تعلیمی سال میں اردو کے فروغ اور ہماری حکومت کی ذمہ داریاں' کے موضوع پر جے شنکر پرساد ہال قیصر باغ لکھنؤ میں حاجی عبدالنصیر ناصر کی صدارت میں منعقد ہوا جس کا افتتاح ڈاکٹر ریتا بہوگنا جوشی رکن اسمبلی وسابق صدر کانگریس کمیٹی اتر پردیش واختتام جناب ڈاکٹر اشوک باجپائی سابق وزیر سپا لوک سبھا امیدوار لکھنؤ کے علاوہ مولانا محمد مشتاق احمد ندوی سکریٹری اسلامک سینٹر آف انڈیا نظامت ڈاکٹر منصور حسن خاں نے کی۔ سیمینار کا افتتاح مولانا قمر سیتاپوری کی تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ ڈاکٹر ریتا بہوگنا جوشی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ چکبست، دیا شنکر نسیم، رگھوپتی سہائے فراخ گورکھپوری جیسے غیر مسلم ادبا وشعرا نے اردو کی بے مثال خدمت کی۔ انھوں نے کہا تاریخ جو ہندی میں تحریر ہے وہ اردو میں بھی تحریر ہو اور صرف مسلم بچوں کو ہی اردو کی تعلیم نہ دے کر سبھی بچیوں کو آٹھویں تک اردو کی تعلیم دینے کا مرکزی و ریاستی حکومتیں معقول بندوبست

علی گڑھ یونیورسٹی کورٹ کے نو منتخب ارکان

کاٹجو، نارنگ، کلب جواد، رشید مسعود شامل

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ضمیر الدین شاہ کی قیادت میں کامیاب کورٹ میٹنگ کرانے اور مسلم یونیورسٹی کورٹ کے نو منتخب اراکین کو مبارکباد کا سلسلہ جاری ہے۔ اس موقعے پر شہر اور یونیورسٹی کی کئی انجمنوں سے وابستہ افراد نے ملک گیر شہرت یافتہ شخصیات کو کورٹ میں منتخب ہونے کو فعال نیک قرار دیا ہے۔ معروف سماجی کارکن میر عارف علی نقوی نے کہا کہ ان شخصیات کے کورٹ میں ہونے سے نہ صرف کورٹ کی وقعت میں اضافہ ہوگا بلکہ یونیورسٹی کی توسیع

مولانا رابع حسنی | مولانا کلب جواد | ڈاکٹر ذاکر نائک | گوپی چند نارنگ | مارکنڈے کاٹجو | رشید مسعود سلیم | اقبال شیروانی

وترقی میں بھی مدد ملے گی۔ انڈین جرنلسٹ پارلیمنٹ کے نائب صدر شکیل احمد خاں نے کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ میں مولانا رابعہ حسنی ندوی، مفتی عطاء الرحمن قاسمی، مولانا کلب صادق، ڈاکٹر ذاکر نائک مظفر علی، گوپی چند نارنگ، سلیم اقبال شیروانی، رشید مسعود اور جسٹس مارکنڈے کاٹجو جیسی کئی نامور شخصیات کا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کا منتخب ہونا یہاں کے لیے فعال ثابت ہوگا۔ بیش پیش قیمتی مشوروں سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اس اہم ترین گورننگ باڈی بھی فیضیاب ہوگی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 14 جون 2013

کریں۔ طارق صدیقی نے کہا کہ اردو زبان صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ زبان ہندوستانی ہے۔ اس زبان سے سبھی مذہب کا لگاؤ ہے۔ اس زبان کو مذہبی زبان قرار دینا غلط ہے۔ وزیر اعظم منموہن سنگھ آج اپنے تمام کام اردو میں ہی کرتے ہیں۔ محترمہ صبیحہ نسرین بی جی آئی سترتھ بارہ بنکی نے کہا کہ موجودہ دور میں سرکاری انٹرکالج و ہائی اسکول میں اردو مضمون پڑھانے کا بندوبست نہیں ہے۔ نہ ہی ہائی اسکول اور نہ انٹرکالج میں اردو مضمون کو لازمی قرار دیا جارہا ہے۔ ایسی صورت میں جب اردو مضمون ہے ہی نہیں تو لڑکیاں ولڑکے آگے کی تعلیم کیسے حاصل کریں گے۔ 2010 میں 2054 سرکاری ہائی اسکول تھے جس کو ترقی دے کر انٹرکالج بنایا گیا۔ ان میں سے صرف 32 اسکولوں میں ہی اردو مضمون کو منظوری دی گئی ہے۔ جو نہایت ہی افسوس ناک بات ہے۔ آخر میں صدر جلسہ حاجی عبدالنصیر ناصر نے اپنی صدارتی تقریر پیش کی۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 8 جولائی 2013

کرناٹک:

شہر دھارواڑ میں تعلیمی کانفرنس

دھارواڑ: عصر حاضر میں مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے بچوں کو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم بھی دیں۔ یا عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم سے آراستہ کریں۔ ان خیالات کا اظہار سید تنویر ہاشمی صاحب نے اپنے صدارتی خطاب میں کیا۔ اس موقع پر محترم اے ایم ہنڈسگری صاحب (سابق وزیر حکومت کرناٹک) نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے ادارہ کے ذمے داران کو مبارکباد دی۔ مہمانِ خصوصی عزت مآب ایچ کے پاٹل (وزیر حکومت کرناٹک H K Patil, Pral Development and Panchayat Raj Minister) نے بڑی عقیدت و محبت کے ساتھ اپنے خطاب میں علامہ سید تنویر ہاشمی صاحب کو اور دھارواڑ کے تمام ذمہ داران و اہلیان کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ قرآن مجید کی پہلی آیت اقرا ہے جس کے معنی پڑھنا ہے مگر افسوس کی بات ہے کہ جس مذہب کی کتاب کی شروعات پڑھنے سے ہے اس مذہب کے ماننے والے علم کی روشنی سے دور ہیں۔ میں آواز دیتا ہوں کہ مسلمان تعلیمی و اقتصادی میدان میں آگے آئیں اور ترقی کریں۔ تعلیمی کانفرنس میں عوام سے خطاب کرتے ہوئے مفتی شریف الرحمٰن رضوی، مفتی منظور عالم مصباحی، قاضی محمد علی مصباحی نے دینی وعصری تعلیم کی اہمیت بیان کی۔ نظامت کے فرائض مولانا محمد مجیب اشرف نعیمی صاحب بے انجام دیے۔ اس کانفرنس میں کثیر تعداد میں علما و مشائخ وعمائدین شہر نے شرکت کی۔

پریس نوٹ، دارالعلوم حضرت ہاشم پیر، دھارواڑ، کرناٹک 22 جون 2013

مغربی بنگال:

پاکوڑ کے ضلع کلکٹر کو اردو سے متعلق میمورنڈم

پاکوڑ: پاکوڑ ضلع انجمن ترقی اردو شاخ کا ایک وفد ڈی سی فلد لیش ٹوپو سے کلکٹریٹ آفس میں ملا۔ وفد صدر مظفر حسن کی رہنمائی میں سب سے پہلے ڈی سی گوپاکوڑ آمد کی مبارکباد پیش کرتے ہوئے گلدستہ دیا گیا۔ پاکوڑ ضلع میں مسلم اکثریت ضلع ہونے کے باوجود اردو فروغ کے لیے اقدامات نہیں کیے گئے ہیں۔ ضلع میں اردو تعلیم کو لے کر محکمہ کی لاپرواہی منظر عام پر ہیں۔ صدر میں دو اردو میڈل اسکول ہیں مگر طلبہ کو آگے تعلیم جاری رکھنے کے لیے ہائی اسکول میں اردو اساتذہ کی تقرری نہیں ہونے کی وجہ سے مجبوراً ہندی میں تعلیم حاصل کرنی پڑتی ہے۔ دراصل وہ اردو مڈل اسکول کی عمارت ہے۔ انجمن ترقی اردو کے وفد نے ان مسائل سے ڈی سی کو آگاہ کیا اور مسئلہ کو حل کر اردو فروغ میں تعاون کی گزارش کی۔ ڈی سی ایف ٹوپو نے وفود کو ان دونوں مسائل پر غور کر جلد حل کرنے کا بھروسہ دلایا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' کولکاتہ، 12 جون 2013

'بزمِ یارانِ ادب' کی خصوصی نشست بر آمدِ موسمِ باراں

کولکاتا: شہر کولکاتا کی معروف شخصیت اور مدیر 'سہیل' جناب جمیل منظر نے ایک انجمن 'بزمِ یارانِ ادب' کا قیام عمل میں لایا ہے جس کے سرپرست وہ بہ نفسِ نفیس خود ہیں جب کہ صدرِ بزم ڈاکٹر امام اعظم اور معتمدین شگفتہ یاسمین غزل اور احمد معراج ہیں۔ اس انجمن کے زیر اہتمام ادبی نشستیں ہوا کریں گی۔ بزم کی اولین ادبی نشست جسے موسم باراں کی آمد سے معنون کیا گیا تھا' کا انعقاد جمیل منظر صاحب کے دولت کدے 'چھایا گھیرا' واقع 23 اے، اورینٹ رو، کلکتہ 17 میں ہوا۔ محفل کی صدارت جناب انجم عظیم آبادی نے کی جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ مہمانِ خصوصی کے طور پر جناب جمال احمد جمال مروئی والا موجود تھے۔ سب سے پہلے بزم کی معتمد شگفتہ یاسمین غزل نے بزم کا تعارف کراتے ہوئے اس کے اغراض و مقاصد سے حاضرین کو معلومات بہم پہنچائیں۔ عاصم شہنواز شبلی نے دورانِ نظامت بزم کے سرپرست جمیل منظر کی اردو دوستی کی ستائش کی نیز بزم ہذا کی جانب سے جمال احمد جمال کو 'آچاریہ' کے خطاب سے نوازا۔ اس نشست کی اہم خصوصیت یہ رہی کہ شہر کی باغ و بہار اور تہذیبی شخصیت جناب صلو چودھری جنھوں نے بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ کیا ہے اور ڈائریکٹر دوردرشن نیوز خورشید ملک نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر امام اعظم، (آر ڈی مانو، کولکاتا، 3 جولائی 2013

اعزاز و اکرام:

شافع قدوائی کے اعزاز میں تقریب

علی گڑھ: پروفیسر شافع قدوائی نے جس طرح سے اردو ادب کی خدمات صحافت کے تعلق سے انجام دی ہیں ان خدمات کو اردو دنیا اور زبان وادب فراموش نہیں کرسکتا ان خیالات کا اظہار شعبہ لسانیات کے سینئر پروفیسر وڈی آر ایس سینٹر کے کوآرڈی نیٹر پروفیسر اے آر فتیحی نے پروفیسر شافع قدوائی کے اعزاز میں منعقدہ تقریب کے موقع پر تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کیا۔ پروگرام کی صدارت شعبہ اردو کے سابق صدر پروفیسر خورشید احمد نے کہا کہ شافع قدوائی اپنی نوجوانی کی عمر میں ہی پروفیسر ہوئے اور انھوں نے اپنی توانائی کا استعمال جس طرح اردو ادب و زبان کو فروغ دینے کے لیے خرچ کیا وہ

پروفیسر قدوائی کے اعزاز میں منعقد تقریب کا ایک منظر

قابل ستائش ہے۔ پروگرام کے روح رواں پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ زبان وادب کی خدمات ہمارا پہلا فریضہ ہے اور ہر ذی علم وذی ہوش شخص کو اپنی زبان کی حفاظت کے تئیں سرگرم عمل رہنا چاہیے انھوں نے اس اعزازی تقریب کے تعلق سے پروفیسر اے آر فتیحی و دیگر مہمانان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یقین دہانی کرائی کہ ان سے جو بھی خدمات ہوسکیں گی وہ اپنے اس فریضۂ لازم کو تا حیات انجام دیتے رہیں گے۔ پروگرام میں شعبہ اردو کے پروفیسر و معروف فکشن و ناول نگار طارق چھتاری نے اپنے ناول کے اقتباسات کا تعارف کرایا افسانہ نگار احمد رشید و پروفیسر پریم چند نے اپنے اپنے افسانے پیش کیے

تاہم ایک شعری نشست کا بھی انعقاد ادبی محفل میں عمل میں آیا۔ شعرا میں فرحان احمد، ڈاکٹر راشد انور، ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی، ڈاکٹر زویا زیدی نے اپنا کلام پیش کیا۔ پروگرام کی نظامت شعبہ اردو کے معروف استاد و شاعر ڈاکٹر سراج اجملی نے کی جب کہ اظہار تشکر ڈاکٹر نوید انجم نے پیش کیا۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 8 جولائی 2013

عمر فاروقی کو غزل ایوارڈ

سیتاپور: جب کہیں ادب کا ذکر ہوتا ہے اور ادبی کاوشوں کی بات ہوتی ہے تو سیتاپور کی بزم اردو کا ذکر کیے بنا کوئی بات مکمل کر پانا ناممکن سا لگتا ہے۔ اکثر ایسے موقعے بھی آئے ہیں جب مجھے اس معروف ادبی تنظیم کے پروگرام میں شرکت کرنے کا موقع ملا ہے۔ مذکورہ بات بزم اردو کے دسویں ماہانہ طرحی پروگرام میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے عوام کو خطاب کرتے ہوئے ممتاز نثر نگار اور سابق پرنسپل گورنمنٹ انٹر کالج حسین لکھنؤ ڈاکٹر رضا رضوی نے کہی۔ صدر مشاعرہ مست حفیظ رحمانی نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ اردو بقا کی ذمے داری اب صرف ہم اردو والوں کی ہے اور ادبی تنظیمیں اس کام کو بخوبی انجام دے رہی ہیں۔ مضامین کی درسی کتب حکومت کی جانب سے تقسیم کی جارہی ہیں وہیں اردو کی کتابوں کی تقسیم حکومت نہیں کررہی ظاہر ہے ایسا صرف اس لیے کیا جارہا ہے کیونکہ حکومت اردو دشمنی پر آمادہ ہے۔ اس موقعے پر گزشتہ ماہ کے مصرع طرح لحہ لحہ ہے معتبر اپنا کے لیے بہترین غزل ایوارڈ قصبہ لہرپور کے ممتاز شاعر عمر فاروقی کو پیش کیا گیا۔ معلوم ہو کہ نیویارک کے ممتاز شاعر تنویر پھول نے اپنا کلام ای میل کے ذریعے آج کے مشاعرہ کے لیے بزم اردو کو ارسال کیا تھا۔

روزنامہ 'جدید میل'، دہلی، 8 جولائی 2013

پروفیسر مجید بیدار وزیٹنگ فیلو مقرر

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ شعبۂ اردو کو وزارت ثقافت حکومت ہند سے ملے ٹیگور پروجیکٹ میں مزید پیش رفت اور تحقیقی کاموں کے لیے اردو کے ممتاز محقق و نقاد اور ماہر دکنیات پروفیسر مجید بیدار نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم میں بحیثیت وزیٹنگ فیلو دو ماہ کے لیے جوائن کیا ہے۔ واضح رہے کہ پروفیسر مجید بیدار (حیدرآباد) سے قبل اردو کے مایہ ناز ادیب شمیم طارق اور عارف عزیز بھی اس پروجیکٹ میں بحیثیت وزیٹنگ فیلو یہاں آچکے ہیں۔ شمیم طارق نے 'ٹیگور شناسی' کے عنوان سے ایک نہایت ہی عمدہ کتاب اس پروجیکٹ کے لیے لکھی ہے، جب کہ عارف عزیز کتابوں کی ایڈیٹنگ کررہے ہیں۔ مجید بیدار، ٹیگور کے انگریزی مضامین کا اردو میں ترجمہ کررہے ہیں۔ ٹیگور کے انگریزی مضامین کے اردو ترجمے پر مشتمل ایک کتاب اس پروجیکٹ کے تحت جلد منظر عام پر آئے گی۔ اس پروجیکٹ کے تحت ٹیگور شناسی کے علاوہ گیتانجلی کا انگریزی سے اردو ترجمہ بھی ہوچکا ہے جسے شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی نے کیا ہے۔ ٹیگور کے ناول 'گورا' کا بنگلہ سے اردو ترجمہ ایم علی (کلکتہ) نے مکمل کردیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں بھی جلد منظر عام پر آجائیں گی۔ ان کتابوں کے علاوہ ٹیگور کے افسانوں کا انتخاب، ان کے انٹرویوز اور خطوط، ڈراموں کا انتخاب اور یادیں (سوانح) بھی تیاری کے مرحلے میں ہے۔ پچھلے دنوں وائس چانسلر نجیب جنگ (آئی اے ایس) نے اس پروجیکٹ کی ایک اہم میٹنگ کی اور اس پروجیکٹ کے تمام کاموں کا جائزہ لیا۔ انھوں نے پروجیکٹ کی پیش رفت سے خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا اور اپنی بیش قیمت آرا سے نوازا۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 5 جولائی 2013

راہیں محنت اور محبت سے نکلتی ہیں، مطالبوں سے نہیں: پروفیسر اختر الواسع

نئی دھلی: قرآن غیروں کو گلے سے لگانے کی تلقین کرتا ہے، ہم اپنوں میں غیریت تلاش کرتے ہیں۔ مسائل محنت اور محبت سے حل ہوتے ہیں ہم مطالبوں میں حل

استقبالیہ تقریب کو خطاب کرتے ہوئے سینئر صحافی نسیم عارفی (حیدرآباد)، ڈائس پر دائیں سے معصوم مرادآبادی، پروفیسر اختر الواسع، سید منصور آغا اور حامد علی اختر

تلاش کرتے ہیں۔ یہ بات پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے دعوت نگر کمپلیکس، نئی دہلی میں منعقدہ ایک استقبالیہ تقریب میں کہی جس کا اہتمام ان کے اعزاز میں ماہنامہ 'صلاح کار' کے مدیر حامد علی اختر نے کیا تھا۔ پروگرام کی صدارت سینئر صحافی اور ممتاز دانشور سیّد منصور آغا نے کی۔ استقبالیہ تقاریر کے بعد اپنی تقریر میں پروفیسر اختر الواسع نے برادران ملت سے اپیل کی کہ وہ مسلکوں کی حد بندیوں سے بلند ہوکر قوم اور ملت کی اجتماعی بہبود کی فکر کریں۔ استقبالیہ کے مدعوئین اور اس میں شریک تمام افراد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انہوں نے ان لوگوں کا بھی شکریہ ادا کیا جن کی سفارشوں اور محبتوں کے نتیجہ میں ان کو یہ اعزاز ملا۔ وائس آف امریکا کے نمائندے جناب سہیل انجم نے پروفیسر واسع کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے اپنے افتتاحی کلمات میں کہا کہ پروفیسر اختر الواسع نے اپنی طفلی سے اب تک جو منزلیں طے کی ہیں وہ نئی نسل کے لیے ایک مثال کی حیثیت رکھتی ہیں۔ روزنامہ 'جدید خبر' کے مدیر جناب معصوم مرادآبادی نے پروفیسر اختر الواسع کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اپنے ذاتی تجربہ کی بنیاد پر کہا کہ وہ ہر شخص کو ساتھ لے کر چلتے ہیں اور اپنے ہر شریک کار کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے اندر کسی طرح کی خودستائی نہیں اور یہ ان کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ ہے۔ معروف اردو نواز اور سماجی کارکن حکیم سیّد احمد خاں نے اپنے توصیفی کلمات میں پروفیسر اختر الواسع کی خوش اخلاقی اور تعاون کے جذبہ کی تعریف کی اور کہا کہ ان کو جو اعزاز ملا ہے وہ ہم سب کے لیے بھی اعزاز ہے۔ اس موقع پر روزنامہ اعتماد (حیدرآباد) کے مدیر جناب نسیم عارفی نے اپنی طرف سے اپنے روزنامہ کی طرف سے اور اردو برادری کی طرف سے ہدیہ تہنیت پیش کرتے ہوئے مسٹر واسع کی ذات اور صفات کی تعریف کی اور کہا کہ ان کو جو اعزاز ملا ہے اس کی خوشی ملک بھر میں محسوس کی جارہی ہے۔ صدر جلسہ سیّد منصور آغا نے کہا کہ میری شناسائی پروفیسر اختر الواسع سے 1970 میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طالب علمی کے زمانہ سے ہے۔ وہ ذہین ہیں، محنتی ہیں، اپنی دھن کے پکے ہیں۔ ساتھ ہی متین بھی ہیں۔ پدم شری ان کی منزل نہیں بلکہ نشان راہ ہے۔ ایسے اور بھی کئی نشان راہ ان کے منتظر ہیں۔ جلسے کی نظامت مدیر صلاح کار جناب حامد علی اختر نے کی اور اپنی طرف سے نیز جلسہ میں شریک تمام افراد کی طرف سے پروفیسر اختر الواسع کی خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند کی طرف سے پدم شری اعزاز دیے جانے پر دلی مبارکباد پیش کی۔ جناب سالک دھامپوری اور سیّد اظہار الحسن نے گلدستوں سے اور حکیم سیّد احمد خاں نے شال سے پدم شری کا استقبال کیا۔

پریس نوٹ، محمد عمران قنوجی پریس سکریٹری، اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن، نئی دہلی، 24 جون 2013

قیصر وارثی کا جشن

لکھنؤ: مسرور ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام سینٹ روم

پبلک اسکول گڑھی پیر خاں میں سوسائٹی کے سہ ماہی پروگرام میں جشن قیصر وارثی پورے تزک و احتشام کے ساتھ منایا گیا۔ صدارت کے کے سنگھ مینک نے کی۔ بحیثیت مہمان خصوصی نریندر بھوشن پی سی ایس سابق ایڈیشنل ڈائرکٹر اور بحیثیت مہمان اعزازی عالمی شہرت یافتہ شاعر واصف فاروقی شریک ہوئے جب کہ نظامت کا فریضہ خوش فکر شاعر شکیل گیاوی نے انجام دیا۔ سوسائٹی کے روح رواں ڈاکٹر منصور حسن خاں نے اپنے تعارفی کلمات میں کہا کہ ہماری سوسائٹی مجموعی طور سے علم وادب کے فروغ کے لے کام کررہی ہے اور خصوصی طور پر اردو کا فروغ اس کا بنیادی مقصد ہے۔ اس سے پہلے سوسائٹی عبدالستار خاں بیدل مرادی، پنڈت ہنومان پرساد عاجز، کے کے سنگھ مینک وغیرہ کو ان کے علمی و ادبی کارناموں کے احترام میں مسرور ایوارڈ سے نواز چکی ہے۔ اس موقعے پر صاحب جشن کو ایوارڈ، شال اور مومنٹو سے نوازا گیا۔ ادیبہ منصور اور علی اشرف نے مہمانوں کی گلپوشی کی۔ جشن قیصر میں صدر کے کے سنگھ مینک نے کہا آج ایک ایسے شاعر کا جشن منایا جارہا ہے جس نے اردو زبان و ادب کے فروغ میں اپنی پوری زندگی وقف کردی۔ مہمان خصوصی نریندر بھوشن نے کہا کہ میں ہندی کا شاعر ہوں مگر میری شاعری میں اردو کا بھرپور عکس ہے۔ اس بات کا صاف مطلب ہے کہ اردو اور ہندی گزشتہ دو دہائیوں میں خاص طور پر ایک دوسرے سے قریب ہوئی ہیں جو ہماری مشترکہ تہذیب اور گنگا جمنی ماحول کے فروغ کی علامت ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 14 جون 2013

رسم اجرا:

'اردو ٹوڈے'

پٹنہ: آج اشرفی ہاؤس ہارون نگر سیکٹر ٹو پٹنہ میں سہ ماہی رسالہ اردو ٹوڈے کے حوالے سے ایک اہم نشست منعقد ہوئی جس کی صدارت پروفیسر علیم اللہ حالی نے کی۔ اس نشست میں اردو انگریزی کی کئی معتبر شخصیتیں شامل

اردو ٹوڈے کا اجرا کرتے ہوئے دانشوران

ہوئیں۔ سب سے پہلے اردو ٹوڈے کی اشاعت پر دنیا بھر کے تمام ممالک کے ادیبوں، دانشوروں اور اردو دوستوں اور مدیران نے بے حد شکریہ ادا کیا۔ اس نشست کو پروفیسر افروز اشرفی مدینہ یونیورسٹی کی آمد پر ایک تہنیتی نشست بھی کہا جاسکتا ہے۔ نشست کے آغاز میں اردو ٹوڈے کے مدیر اعلیٰ آزادی و عالمی شہرت یافتہ دانشور ڈاکٹر قاسم خورشید نے اردو ٹوڈے کے حوالے سے فرمایا کہ اردو ٹوڈے اردو کو گلوبلائز کرنے اور عالمی سطح پر اردو کو متعارف کرنے کی بہترین کوشش ہے۔ یہ رسالہ دراصل ہم اردو سے محبت کرنے والوں کا ایک دیرینہ خواب تھا جسے ڈاکٹر افروز اشرفی کے تعاون سے اس خواب کی تعبیر پیش کرنے میں آج کامیاب ہوسکے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 23 جون 2013

رضا لائبریری کے اردو مسودات کی کیٹلاگ

رام پور: مرکزی ثقافتی وزیر چندریش کماری کٹوچ رام پور کے دورے میں انھوں نے تاریخی رضا لائبریری کو دیکھا اور احاطے میں ایک تقریب کے درمیان اردو مسودات کے کیٹلاگ کا اجرا کیا۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ نیشنل مشن آف مانومینٹس ملک بھر کی پرانی عمارتوں، تصویروں وغیرہ کو محفوظ دائرے میں لارہا ہے۔ فہرست تیار کرکے مانومینٹس کا تحفظ کیا جارہا ہے۔ رضا لائبریری کو تعلیم، تاریخ اور فن کا ذخیرہ بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس میں نادر مسودات کے تحفظ کا قابل ستائش کام کیا جارہا ہے۔ اس کی ترقی کو ہر ممکن مدد دی جائے گی۔ لائبریری میں مسودات کے اور بہتر تحفظ کو تین ماہر اشخاص یہاں بھیجے جائیں گے۔ تقریب کے آخر میں لائبریری کے ڈائرکٹر ایم ایس عزیز الدین حسین نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت ارون کمار سکسینہ نے کی۔ اس موقعے پر ممبر اسمبلی کاظم علی خاں عرف نوید میاں، ثقافت کی وزارت کے جوائنٹ سکریٹری راجیش رنجن سمیت تمام لوگ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 27 جون 2013

میٹھا نیم

8 جون کو بھارتیہ بھاشا پریشد ہال میں بزم وامق کے زیر اہتمام شاہد نور کا شعری مجموعہ 'میٹھا نیم' کتاب کی رسم اجرا تقریب کے موقعے پر پروفیسر سلمان خورشید کی صدارت میں جلسہ منعقد ہوا۔ پروفیسر قیصر شمیم نے شاہد نور کا شعری مجموعہ 'میٹھا نیم' کا اجرا کیا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے شمیم انور، حلیم صابر، ڈاکٹر عقیل احمد عقیل، جمیل منظر نے شرکت کی۔ جلسے میں ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ پروفیسر قیصر شمیم نے شاہد نور کی کی کتاب میٹھا نیم کا اجمالی تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ شاہد نور ایک سنجیدہ شاعر ہیں اور نئی نسل کی ترجمانی اپنی شاعری میں کرتے ہیں۔ یہ جدید لب و لہجے کے شاعر ہیں اور بہت سارے اشعار میں، غزل میں مفہوم اور الفاظ کے انتخاب میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ پروفیسر سلمان خورشید نے کہا کہ شاہد نور کی شاعری پروان چڑھتی جارہی ہے، اور مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی زندگی میں تجربات اور مشاہدے کے پیش نظر ادبی ترقی کے منازل طے کریں گے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' کولکاتہ، 11 جون 2013

مضراب سخن

ممبرا: ممبرا کے زم زم ہال میں مرحوم شاعر شوکت پردیسی کے مجموعہ کلام 'مضراب سخن' کی تقریب رونمائی بدست ڈاکٹر تابش مہدی و دیگر مہمانان کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس موقعے پر دہلی سے تشریف لائے ڈاکٹر تابش مہدی نے اپنی تقریر میں شوکت پردیسی کے حالاتِ زندگی سے سامعین کو واقف کرایا۔ انھوں نے بتایا کہ ''شوکت پردیسی تقریباً نصف صدی تک شعر و سخن کی خدمت کرتے رہے۔ غزلوں، نظموں، قطعات، رباعیات میں طبع آزمائی کی جب کہ بچوں کے لیے بھی نظمیں لکھیں۔ فلمی گیت اور نغمے بھی لکھے۔ ان کی کسی بھی تخلیق کو پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے جیسے انھوں نے اپنی پوری زندگی اُسی صنف پر صرف کردی ہو۔ 'مضراب سخن' پڑھنے کے بعد ان کی فکر و نظر کی گہرائی کا پتہ چلتا ہے۔''

روزنامہ 'اردو ٹائمز' ممبئی، 17 جون 2013

ماحولیات: ایک مطالعہ

ناگپور: آل انڈیا آئیڈیل ٹیچرس اسوسی ایشن (آئیٹا) یونٹ کامٹی کی جانب سے مورخہ 16 جون 2013 بروز اتوار محمد علی کالج آف ایجوکیشن کامٹی میں تقریب خاص کا اہتمام کیا گیا۔ آئیٹا کی جانب سے جناب ریاض الخالق نے کیریئر گائیڈنس کے تحت طلبہ کو اپنا مستقبل سنوارنے اور مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں رہنما اصول بتائے۔ اس کے بعد طلبہ کی مزید رہنمائی کے لیے ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل نے تعلیم کی اہمیت، مسائل اور کامیابیوں کے لیے محنت اور حصول علم پر زور دیا۔ اسی تقریب کا ایک اہم حصہ تقریب رونمائی کے تحت ڈاکٹر محمد رفیق اے ایس کی پانچویں تصنیف 'ماحولیات۔ ایک مطالعہ' کا اجرا عمل میں آیا۔ ڈاکٹر محمد یٰسین قدوسی سابق ناظم آثار ہند، ناگپور اور صدر جمہوریہ (حکومتِ ہند) سے انعام یافتہ

حفیظ کی شاعری اور 'شاہنامہ اسلام'

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) سید احمد علی نے ڈاکٹر مصطفیٰ (علیگ) کی کتاب 'حفیظ جالندھری کی شاعری خصوصاً شاہ نامۂ اسلام' کا انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں اجرا کیا۔ پیشے سے انجینئر ڈاکٹر مصطفیٰ تقریباً 33 سال تک دوردرشن میں ٹیکنیکل ڈائرکٹر کے عہدے پر رہے۔ انھوں نے 1997 میں پنجاب یونیورسٹی

انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں 'حفیظ جالندھری کی شاعری خصوصاً شاہ نامہ اسلام' کا اجرا کرتے ہوئے سید احمد علی و دیگر

سے اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وہ اے ایم یو کے بھی طالب علم رہ چکے ہیں اور انجینئرنگ کالج سے بی ای کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر مصطفیٰ نے بتایا کہ چنڈی گڑھ یونیورسٹی میں پہلی بار حفیظ جالندھری پر پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ اس موقعے پر بریگیڈیئر ایس احمد علی کے علاوہ مسٹر سراج قریشی اور مسٹر صفدر ایچ خاں سمیت متعدد معززین موجود تھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 5 جولائی 2013

اسکالر نے اس تصنیف کی رونمائی ادا کی اور ڈاکٹر محمد رفیق اے ایس کو اس بات کی بھی مبارکباد دی کہ ابھی ناگپور یونیورسٹی کے کانوکیشن میں انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری دی ہے۔ رفیق صاحب کا مقالہ کشمیری لال ذاکر پر تھا جس پر انھیں ڈگری ملی۔ ماحولیات ایک مطالعہ پر ان کی تصنیف بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اسے مہاراشٹر ساہتیہ اردو اکادمی ممبئی اور بہار اردو اکادمی پٹنہ نے ایوارڈ سے نوازا ہے۔ اسے شائع کرنے کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے مالی تعاون فراہم کیا ہے۔

پریس ریلیز، محمد رفیق، کامپٹی، ناگپور، 30 جون 2013

مسافرانِ ادب

نئی دھلی: انجمن فروغ اردو (رجسٹرڈ، دہلی) اور اردو اکادمی کے باہمی اشتراک سے درد دہلوی کی تازہ تصنیف 'مسافران ادب' کی رونمائی کے موقع پر غالب اکادمی نظام الدین میں ایک کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا گیا، جس صدارت حاجی نعیم ملک نے کی جب کہ نظامت دانش ایوبی نے کی۔ مشاعرے کی شمع محمد الیاس سیفی اور جمیل انجم دہلوی نے روشن کی۔ علامہ ظفر جنکپوری، کمال جعفری، معین اختر انصاری، سید خورشید عالم، حکیم اصغر احمد زیدی مجددی نے مہمانان کی حیثیت سے شرکت کی نیز پدم شری پروفیسر اختر الواسع اور آدیش تیاگی نے کتاب کی رونمائی کی۔ اس موقعے پر پروفیسر اختر الواسع نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ آج اکثریت ان لوگوں کی ہے جو خود نمائی اور خود ستائش کے خواہ ہیں، ایسے دور میں دوسرے فنکاروں کی کاوشوں کو منظر عام پر لانا یقیناً قابل قدر اور لائق تقلید عمل ہے۔ سینئر صحافی ارشد ندیم نے اپنے تبصرے میں کہا کہ: سیاسی سازشوں، صاحبانِ فکر و شعور کی منافقانہ حرکتوں اور طرح طرح کی ریشہ دوانیوں کے باوجود بھی اگر اردو زندہ ہے تو صرف اس کی ایک وجہ ہے کہ اس زبان سے پیار کرنے والوں کی کبھی کمی نہیں رہی ہے اس کے علاوہ آدیش تیاگی اور ڈاکٹر سعید الدین قاسمی نے بھی کتاب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 جولائی 2013

اردو کی معروف خواتین افسانہ نگار اور ان کی خدمات

کولکاتا: ''عورتوں نے مردوں کے شانہ بشانہ ہر میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور ان میں ادب کا

میدان بھی شامل ہے۔ دیگر زبانوں کے ادب کی طرح اردو ادب بھی ہمیشہ سے خواتین کا احسان مند رہا ہے۔ مقامِ مسرت ہے کہ آج اردو کی خواتین افسانہ نگاروں کی خدمات کتابی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں جس سے قارئینِ ادب بہتر طریقے سے استفادہ کر سکتے ہیں'' ان خیالات کا اظہار پروفیسر سیّد منال شاہ القادری' وائس چیئر مین' مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے ڈاکٹر نعیم انیس کی کتاب 'اردو کی معروف خواتین افسانہ نگار اور ان کی خدمات' کی رسم رونمائی کرتے ہوئے کیا۔ اس سے قبل ڈاکٹر رگھوناتھ دتا، پرنسپل، کلکتہ گرلس کالج نے خیر مقدمی کلمات ادا کرتے ہوئے کالج میں اقلیتی طالبات کی اکثریت اور کالج انتظامیہ کی جانب سے انھیں فراہم کی جانے والی مراعات کا بالتفصیل ذکر کیا۔ محترمہ دیپا مکھوپادھیائے، سابق رکن مجلسِ انتظامیہ، کلکتہ گرلس کالج نے اپنی مختصر مگر شستہ اردو میں کی جانے والی تقریر میں کہا کہ بنگال میں مسلم خواتین نے سماج کی ترقی میں ہمیشہ تعمیری کردار ادا کیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ بات خواتین اردو قلم کاروں پر بھی صادق اترتی ہے۔ ڈاکٹر نعیم انیس نے خواتین قلم کاروں کی اردو افسانوں کے حوالے سے کتاب ترتیب دی ہے، انھیں مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ پروفیسر شمیم انور، سابق صدر، شعبۂ اردو، کلکتہ گرلس کالج نے سامعین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ادب کی تمام اصناف میں عورتوں کی نمائندگی لازمی ہے۔ مرتب کتاب ڈاکٹر نعیم انیس نے دورانِ تقریر کہا کہ شعبۂ اردو، کلکتہ گرلس کالج کی تاریخ میں یہ پہلا سیمینار تھا۔ اس لیے پرنسپل صاحب کی ہدایت کے مطابق ہمیں اس میں بالکل منفرد موضوع پیش کرنا مقصود تھا۔ حالات کے تقاضوں کے پیشِ نظر ہم نے اردو کی خواتین افسانہ نگاروں اور ان کی خدمات کو سمینار کا موضوع بنایا جس میں اس بات کا بھی پورا خیال رکھا گیا کہ مغربی بنگال کی خواتین افسانہ نگاروں کی خدمات بھی واضح طور پر سامنے آئیں۔ پروفیسر سلیمان خورشید، جنرل سکریٹری، دی مسلم انسٹی ٹیوٹ، کلکتہ نے صدارتی خطبے میں کہا کہ مجھے امید قوی ہے کہ طلبا و طالبات اس کتاب سے استفادہ کریں گے۔ جلسے کا اختتام پروفیسر رگھوناتھ دتا کے اظہارِ تشکر سے ہوا اور نظامت شاہد اقبال نے انجام دی۔

پریس نوٹ، ڈاکٹر نعیم انیس، کولکاتا، 5 جولائی 2013

ڈاکٹر ظہیر آفاق کی 5 تصنیفات

مدراس: اردو اکیڈمی، تمل ناڈو، خود مختار ادارہ، مدراس

(چنئی) کے زیر اہتمام 25 جون کو اردو اسٹڈی سینٹر،

ایس کے ایجوکیشنل اکادمی مدراس کے سمینار ہال میں ڈاکٹر ظہیر آفاق کی پانچ نثری و شعری کتابوں کا اجرا اوراردو اکیڈمی تمل ناڈو کا پانچواں جشن اعزازی منعقد ہوا۔ ڈاکٹر سید محمد ابراہیم ذبیح صدر انجمن حمایت اردو، مدراس نے صدارت فرمائی۔ مہمان خصوصی جناب دل تاج محلی آگرہ اور مہمان اعزازی جناب اصغر ویلوری مسند نشین رہے۔ اردو اکادمی تمل ناڈو کے چیرمین ڈاکٹر ظہیر آفاق نے تاریخ ساز استقبالیہ پیش کیا۔ جلسے کے ایک دائرے میں تین افسانوی مجموعے باقی 'روبرو'، 'بعض اوقات بعض خواتین'، 'برفیلے احساسات کی کفن پوشی' ایک شعری مجموعہ 'تفسیر درد (قطعات)' اور 'الفاظ کا تاج محل' (اردو ڈرامہ نگاری) کا رسم اجرا دل تاج محلی کے بدست ہوا۔ تصویر کے دوسرے رخ پر تمل ناڈو کے آٹھ اردو شاعر و ادیب اور اساتذہ کو ادبی و تعلیمی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈز پیش کیے گئے جن کے نام ہیں عبدالمجید اسد (نثری و شعری خدمات)، ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری، اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ ڈگری کالج، پلمنیر (تنقیدی و تحقیقی خدمات)، ڈاکٹر امان اللہ ایم بی، شعبہ عربی، فارسی واردو، مدرس یونی ورسٹی (تدریسی و تنقیدی خدمات)، کاکا شکیل احمد (تدریسی خدمات)، فرید احمد (تعلیمی خدمات)، محترمہ کوثر بی (اقلیتوں کی تعلیمی خدمات)، اور ڈاکٹر ا تھی راجولو (اردو ٹیچر ٹریننگ طلباء کی فلاح و بہبودی)۔ بعد ازاں ایک افسانوی نشست بھی عمل میں آئی۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر امان اللہ، شعبہ عربک، پرشین اور اردو، مدراس یونیورسٹی، چینئی، 5 جولائی 2013

وفیات

حکیم محمد طارق امروہوی

نئی دہلی: دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر شعبہ اردو ڈاکٹر شریف احمد (مرحوم) کے داماد حکیم محمد طارق امروہوی کے اچانک انتقال پر طبی، ملّی، سیاسی و سماجی حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ حکیم محمد طارق کا آبائی وطن امروہہ تھا لیکن ایک عرصے سے وہ دہلی میں مقیم تھے۔ طبّی میدان کے علاوہ مختلف ملّی، سیاسی و سماجی حلقے میں اپنے خلوص اور رضا کارانہ خدمات کی وجہ سے بے حد مقبول تھے۔ وہ اپنی صحت کے اعتبار سے چست و درست

نظر آتے تھے جس کی وجہ سے لوگوں کو ان کی صحت پر رشک تھا۔ (18 جون 2013) کو تقریباً ساڑھے بارہ بجے ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں دہلی کے مہندیان قبرستان میں انہیں سپرد لحد کیا گیا۔ ان کی نماز جنازہ میں شہر کے مختلف حصوں سے کثیر تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔

پریس ریلیز، حکیم عطاء الرحمٰن اجملی، 18 جون 2013

بزرگ صحافی محمد کاظم کا انتقال

نئی دہلی: دہلی کے معروف صحافی محمد کاظم کا 83 سال کی عمر میں 6 جولائی کو طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ایم کاظم 1930 میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ کے سینٹ جوزف اسکول سے حاصل کی۔ لکھنؤ سے ہی گریجویشن کیا اس کے بعد وہیں سے انسٹی ٹیوٹ آف جرنلزم میں ڈپلوما کیا اور 1972 میں ہی

انگریزی کے ایک ماہانہ 'ایپل انڈیا' کے مدیر کی حیثیت سے ذمے داری سنبھالی۔ 1980 میں روزنامہ 'قومی آواز' کے ذریعے صحافت کی خدمات ایک لمبے عرصے تک کرتے رہے۔ 1991 میں قومی آواز کے چیف رپورٹر کی پوسٹ سے سبکدوش ہوئے اور پھر بمبئی کے روزنامہ 'انقلاب' میں 1992 تک کام کرتے رہے۔ اس کے علاوہ اردو اکادمی دہلی نے محمد کاظم کو ان کی صحافتی خدمات کے اعتراف میں 'ایوارڈ برائے اردو صحافت' 2001 میں پیش کیا تھا۔ ان کی تدفین میں پروفیسر شمس الحق عثمانی، قومی آواز کے سابق ہیڈ ٹیلی گرافر جے ڈی اسلم اور رحمت اللہ فاروقی کے علاوہ دیگر سرکردہ افراد نے شرکت کی۔ اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع اور سکریٹری انیس اعظمی نے مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے مرحوم کی صحافت کے تئیں خدمات کو قابل قدر بتایا اور مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی ہے۔ محمد کاظم ایک مشفق استاد اور شگفتہ مزاج شخص تھے۔ اردو کے جن معروف صحافیوں نے ان کی ماتحتی میں صحافت کے رموز سیکھے ان میں نصرت ظہیر، چندر بھان خیال اور پروفیسر محمد ظفر الدین شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 جولائی 2013 اور ادارہ 'اردو دنیا'

صحافی شمس الہدیٰ کا قتل

بنگلور: سماجی کارکن اور ادبی ماہنامہ 'مخزن' کے ایڈیٹر شمس الہدیٰ کو بنگلور میں واقع ان کے دفتر میں خون میں

لت پت مردہ حالت میں پایا گیا۔ حملہ آوروں نے ان کی گردن پر چاقو سے حملہ کر انھیں قتل کر دیا۔ قتل کے اس واقعے کے خلاف بنگلور کے سماجی اور ادبی حلقوں میں کافی غم و غصہ پایا جاتا ہے۔ مرحوم کے پسماندگان میں بیوی اور بہن ہیں۔ وہ بی ایس پی اقلیتی سیل کے چیرمین بھی تھے۔ قتل کی وجوہات کا ابھی تک پتہ نہیں چل سکا ہے۔ شمس الہدیٰ اس سے قبل اردو ہفتہ وار القدس کے ایڈیٹر تھے۔ وہ اردو مشاعروں اور ادبی پروگراموں کی نظامت بھی کرتے تھے اور اردو کے کاز کے لیے پیش پیش رہتے تھے۔ پولیس کو شبہ ہے کہ ان کا قتل مالی منفعت کے لیے کیا گیا ہے۔ متعدد مسلم تنظیموں نے مخزن کے ایڈیٹر کے قتل پر اظہار تعزیت کرتے ہوئے پولیس سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ قصورواروں کو گرفتار کرے۔ کرناٹک مسلم متحدہ محاذ کے کنوینر مسعود عبدالقادر نے کہا ہے کہ یہ افسوس ناک واقعہ ہے۔ جماعت اسلامی ہند نے بھی قتل کے اس واقعہ پر تعزیت کا اظہار کیا ہے۔ ایس ڈی پی آئی کے جنرل سکریٹری عبدالحنان نے اس قتل کو مسلم سماج کے لیے ناقابل تلافی نقصان قرار دیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 جولائی 2013

صابر حسین

لکھیم پور کھیری: معروف ادیب صابر حسین کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ وہ 60 برس کے تھے۔ 4 جولائی کو نماز مغرب قصبہ پلیا کے اکرام نگر قبرستان میں انھیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے و دو بیٹیاں شامل ہیں۔ نوپور، نکشتر، آزادی کے دیوانے، ہم مانو کے دیش میں، پیلی پرتھوی، دیش کے دشمن اور بھنور جیسی متعدد تخلیقات کا گراں قدر سرمایہ دینے والے صابر حسین 10 جولائی 1954 کو قصبہ محمدی میں پیدا ہوئے تھے۔ تقریباً تیس سال قبل محمدی کو خیر باد کہہ کر قصبہ پلیا میں آکر سکونت اختیار کر لی تھی۔ انھوں نے بچوں کے لیے متعدد کہانیوں کے علاوہ ناول، ڈرامے وغیرہ لکھ کر ہندی ادب کو گراں قدر تخلیقی سرمایہ دیا۔ ان کے ادبی شہ پاروں کے لیے وزارت اطلاعات و نشریات، ہندی اکادمی و کئی ادبی تنظیموں کی طرف سے اعزازات دیے گئے۔ ان کے کئی ڈرامے دوردرشن پر ٹیلی کاسٹ اور آل انڈیا ریڈیو پر نشر کیے جا چکے ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی 4 جولائی 2013

خواجہ جاوید اختر

الہ آباد: مقبول ترین ہر دلعزیز شاعر خواجہ جاوید اختر کا 13 جولائی 2013 بروز سنیچر کی شام اچانک انتقال ہوگیا۔

وہ آناً فاناً نازرتھ اسپتال لائے گئے۔ جہاں انھیں ڈاکٹروں نے ابتدائی جانچ و علاج کے بعد مردہ قرار دے دیا۔ جاوید اختر کو پہلے رمضان سے ہی معمولی بخار تھا۔ سنیچر کی دوپہر ان کے دونوں شانوں میں اچانک درد اٹھا وہ کریلا باغ ڈاکٹر محمد فاروق کے گھر پر علاج کے لیے آئے تھے لیکن ڈاکٹر نے معاملہ کی نزاکت کو سمجھ کر 'نازرتھ اسپتال' میں بھرتی کرایا۔ جہاں انھیں ڈاکٹروں نے تھوڑی دیر بعد مردہ قرار دے دیا۔ وہاں موجود ڈاکٹروں کے مطابق انھیں سیپٹی سیمیا بتایا گیا ہے۔ خواجہ جاوید اختر کی پیدائش کانکی نارہ، 24 پرگنہ، مغربی بنگال میں 2 ستمبر 1964 میں ہوئی تھی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 جولائی 2013

معروف ادیب و مصنف فاروق ارگلی کے بیٹے کا انتقال

نئی دھلی: معروف ادیب، شاعر اور مصنف فاروق ارگلی کے بیٹے شاہنواز عالم کا 9 جولائی 2013 کو گرو تیغ بہادر اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ 49 سال کے تھے اور اتوار کی شام پٹپڑ گنج علاقے میں ایک سڑک حادثے میں شدید طور سے زخمی ہوگئے تھے۔ ان کے پسماندگان میں ان کی بیوہ اور دو بچے شامل ہیں۔ ان کی تدفین 9 جولائی بعد نماز عشا قبرستان برج پوری خوریجی میں عمل میں آئی جس میں بہت بڑی تعداد میں علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی شخصیات نے شرکت کی۔ محمد فرید کے مطابق ان کے بھائی شاہنواز عالم اتوار کی شام اپنے پریس سے واپس آرہے تھے تب ہی پٹپڑ گنج میں حسن پور بس ڈپو کے سامنے درگاہ کے قریب کوئی تیز رفتار گاڑی انھیں ٹکر مار کر فرار ہوگئی۔ جی ٹی بی اسپتال کے ڈاکٹروں کے مطابق انھیں برین ہیمبرج ہوگیا تھا۔ حادثے کے بعد وہ ایک بار بھی ہوش میں نہیں آئے اور 9 جولائی 2013 کی صبح ان کا انتقال ہوگیا۔ فاروق ارگلی روزنامہ راشٹریہ سہارا سے بھی وابستہ ہیں۔ یہ خبر ملتے ہی ادارہ میں بھی غم کی لہر دوڑ گئی اور ان کے ساتھ اظہار ہمدردی اور مرحوم کے لیے مغفرت کی دعا کی گئی۔ ادارہ ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ اس کے علاوہ کئی علمی اور ادبی شخصیات نے بھی اسے ایک بڑا سانحہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ اللہ فاروق ارگلی کو اس حادثہ کو برداشت کرنے کی قوت اور صبر عطا فرمائے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 10 جولائی 2013

ڈاکٹر فرید صدیقی

رامپور: رام پور میں روایتی غزل کے استاد شاعر ڈاکٹر فرید صدیقی کا عمر 90 سال طویل علالت کے بعد 4 جولائی کی شب انتقال ہوگیا۔ مرحوم کو 5 جولائی کو ان کے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ مرحوم صوم وصلاۃ کے پابند تھے۔ ڈاکٹر فرید صدیقی 1923 کو عبدالستار صدیقی کے گھر پیدا ہوئے، عمر کے اوائل سے ہی شعر گوئی کا شغف اختیار کیا اور ابر احسنی گنوری کے دامن تلاذمہ میں شامل ہوگئے۔ مرحوم کا استاد شاعر حضرت شوق اثری کے ہم عصروں میں شمار ہوتا ہے۔ آپ کی تین شعری تخلیقات آئینہ رام پور، شق القمر اور جاگتے خواب منظر عام پر آچکے ہیں اور دو مجموعہ کلام طباعت کے مراحل میں ہیں۔ آپ کے نعتیہ مجموعہ شق القمر کا اجرا 2005 میں کابینہ وزیر محمد اعظم خاں کے دست مبارک سے عمل میں آیا تھا۔ آپ شہر کی کئی ادبی تنظیموں سے وابستہ تھے اور ہندوستان کی مختلف تنظیموں کی جانب سے مختلف اوقات میں اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے۔ ڈاکٹر فرید صدیقی کی تدفین میں ادبا، سیاسی، سماجی، صحافی اور شعرا شخصیات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 5 جولائی 2013

خراج عقیدت:

شہریار کی یاد میں جلسہ

لکھنؤ: نئے خیالات کو موزوں الفاظ میں پروکر اردو شاعری کو نیا چہرہ دینے والے مشہور و معروف شاعر اخلاق محمد خاں شہریار ادب کے ایسے علمبردار تھے جنھوں نے اپنی نظموں، غزلوں اور فلمی گیتوں کے ذریعے اردو کو دنیا لب و لہجہ عطا کیا۔

اتر پردیش کے بریلی میں 16 جون 1936 کو پیدا ہوئے شہریار نے شاعر، نغمہ نگار، صحافی اور ٹیچر کے کرداروں کو بخوبی نبھایا۔ شہریار کی شخصیت کے بارے میں معروف شاعر بیکل اُتساہی کا کہنا ہے کہ وہ ایک اچھے شاعر منکسر المزاج اور اچھے کردار کے مالک تھے۔ انھوں نے خاص طور سے اپنے فلمی گیتوں کے ذریعے پردے پر خوشی، غم، جدائی اور رسوائی کے درد کو اردو کی نزاکت بھرا انداز دیا۔ انھوں نے بتایا کہ شہریار اپنے نام کی مناسبت سے نظم اور نثر کے شہنشاہ تھے لیکن انھیں زیادہ شہرت اپنے شعری مجموعے سے نہیں بلکہ فلمی گیتوں کے گلدستے کی وجہ سے ملی۔ شہریار نے 1972 میں آئی میوزیکل سپرہٹ فلم 'پاکیزہ' کے بعد 'امراؤ جان' فلم میں 'دل چیز کیا ہے، آپ مری جان لیجیے' سمیت متعدد بہترین اور دلکش گیت لکھ کر اس فلم کے موسیقار خیام کی مراد پوری کی تھی۔ اس فلم کے گیت آج بھی لوگوں کے ذہن پر چسپاں ہیں۔ شہریار کی نظموں کا پہلا کلیکشن 'اسم اعظم' 1965 میں شائع ہوا۔ اس کے بعد 'ہجر کے موسم' اور 'خواب کے در بند ہیں' بھی منظر عام پر آئے۔ شہریار کو 1987 میں ساہتیہ اکادمی اور 2008 میں گیان پیٹھ ایوارڈ دیا گیا۔ شہریار نے 13 فروری 2012 کو علی گڑھ میں آخری سانس لی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 جون 2013

ڈاکٹر رزاق فاروقی

کرنول: ڈاکٹر محمد عبدالرزاق فاروقی کا سانحۂ ارتحال اردو ادب، اردو تنقید، اردو تحقیق اور اردو صحافت ہی کے لیے نہیں بلکہ اردو تحریک کے لیے بھی ایک ناقابل نقصان ہے۔ یہ بات سید شاہ عبداللہ حسین بادشاہ قادری، موظف پرنسپل، اسلامیہ عربی کالج، کرنول نے بزم اردو، کرنول کے زیر اہتمام ڈاکٹر حق اسکول، کرنول میں منعقدہ تعزیتی اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے کہی۔ تعزیتی اجلاس کا آغاز مدحت فاطمہ کی قرأت کلام پاک سے ہوا۔ فرحین خاتون نے نعت شریف پیش فرمائی۔ خیر مقدمی تقریر میں ڈاکٹر قیسی قمر نگری معتمد بزم اردو نے کہا کہ ڈاکٹر رزاق فاروقی اپنے شاگردوں کو صرف اردو نہیں پڑھاتے تھے بلکہ زندگی پڑھا کران کے مستقبل کو تابناک بنانے کی جدوجہد کیا کرتے تھے۔ انور باشاہ، صدر شاہین کلب، کرنول نے بتلایا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے کرنول میں جن انجمنوں کا قیام عمل میں لایا وہ آج بھی اتنی متحرک ہیں کہ اردو شعر و ادب کی تاریخ میں ہر ہر موقعے پر ان کا نام لیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر وحید کوثر، موظف صدر شعبۂ اردو، ادونی آرٹس اینڈ سائنس کالج نے اپنی جذباتی تقریر میں فرمایا کہ مجھے احساس ہو رہا ہے کہ آج میں صحیح معنوں میں یتیم ہوگیا ہوں۔ خطبۂ صدارت میں الحاج فاروق باشاہ، صدر بزم اردو نے کہا کہ ڈاکٹر رزاق فاروقی نے گلستان اردو ادب میں جو تخم بوئے تھے آج وہ ایک تناور درخت کی شکل میں عالم اردو میں اپنی شناخت کروا رہے ہیں۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 24 جون 2013